برطانوی صحیفہ نویس مسٹر بیورلی نکلس کی معرکۃ الآراء کتاب

ورڈکٹ آن انڈیا

(مترجمہ)

عبدالقدوس ہاشمی

سید عبدالرزاق تاجر کتب مالک ادارہ اشاعت اردو

عابد روڈ حیدرآباد دکن

چار روپیہ آٹھ آنہ کلدار

پانچ روپیہ چار آنہ سکہ عثمانیہ

۹۵۳۰۲۳

ف ۳۳ ن ک

طبع اول ——— دو ہزار

ماہ مئی سنہ ۱۹۳۵ء

طبع دوم ——— ایک ہزار

نومبر سنہ ۱۹۳۶ء

CHECKED-2002

۱۰۱۷۳۶

عبدالرزاق تاجر کتب

مالک ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس حیدرآباد دکن

M.A.LIBRARY, A.M.U.
U101736

فہرست مضامین

صفحہ

صفحہ

حصہ سوم

فیصلۂ ہندوستان

کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" جس کا اُردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے، پچھلے دس بارہ سال میں ہندوستان سے متعلق جس قدر کتابیں انگریزی قلم سے نکلی ہیں، ان میں سب سے زیادہ ہنگامہ پرور اور طوفان خیز کتاب ہے۔ اس کے خلاف ایک شور مچا ہوا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب کسی ہندوستانی کے قلم سے نہیں نکلی ہے، اور نہ اس کے مصنف کو ہندوستان سے کوئی ہمدردی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حاکم قوم کا احساس برتری بھی ساری کتاب میں کام کر رہا ہے، اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ حاکم قوم کے افراد کو اپنی ساری باتیں بھلی اور محکوم کی ساری باتیں بری معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ایک صحیح صحیفہ نویس کی صداقت نگاری ساری کتاب میں پائی جاتی ہے۔ بیورلی نکلس نے واقعات و حالات اتنے صحیح اور اس قدر صداقت کے ساتھ پیش کئے ہیں کہ کوئی اندھا ہی ان سے انکار کرنے کی جرات کر سکتا ہے۔ رہا ! ہمارے طور طریق کا مضحکہ اڑانا، تو میں نہیں سمجھتا کہ آپ کسی انگریز سے اپنی مصوری اور موسیقی کی داد کیوں چاہیں؟ یقیناً یہ خالص آپ کے ذوق کی چیزیں ہیں مگر آپ اس سے کیسے

انکار کر سکتے ہیں کہ۔

ذات پات چھوت چھات اور فرقہ واری و نسلی منافرت
نے ہندوستان کے تار و پود کو علیحدہ علیحدہ کر رکھا ہے۔

سچی باتیں ہمیشہ تلخ معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے بعض لوگوں کو اس کتاب سے بلا کی نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

میں نے اس کا ترجمہ کیا اور بغیر ایک لفظ کی کمی بیشی کے حتی الامکان بالکل لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس طرح ان بہت سے انسانوں کے لئے جو انگریزی میں اس کتاب کو نہیں پڑھ سکتے تھے، اس کتاب کا پڑھنا ممکن بنا دیا ہے اور ترجمہ سے فی الحقیقت اتنا ہی مقصود ہے۔

عبدالقدوس ہاشمی
حیدرآباد دکن

مقدمۂ مصنف

یہ کتاب ایک سال سے زیادہ مدت تک جدید ہندوستان کے وسیع مطالعہ کا ریکارڈ ہے۔ واضح رہے کہ لفظ "جدید" خاص طور پر مقصود ہے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستانی دماغوں کا کارنامہ پیش کیا جائے۔ نہ صرف سیاست میں بلکہ آرٹ، ادب، موسیقی، طب، صحافت، سینما، اور ہاں! مذہب میں بھی ہندوستانی دماغ کا کارنامہ پیش کیا جائے گا۔

اس مطالعہ کے دوران میں ہزاروں میل کا سفر ہوا۔ یہ سفر پیدل موٹر کار پر بیل گاڑی پر، ہوائی جہاز پر اور کبھی کبھی مریض اٹھانے کی چارپائی پر بھی ہوا۔ میں نے سفر کے حالات کا ذکر صرف ان ہی مقامات پر کیا ہے جہاں اس ذکر سے اصل مقصد پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

دو وجوہ ہیں جن کی بناء پر میں یہ مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ اولاً تو اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" تمام تر میری کارستانی ہے۔ اور سڑکوں پر نقش ونگار بنانے والوں کی عادت کے مطابق میں بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ بلا شرکت غیرے میرا ہی کیا دھرا ہے۔ یہ برطانوی پروپیگنڈا نہیں ہے۔ نہ اس میں سرکاری نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کا محرک انڈیا آفس بھی نہیں ہے میں نے آج تک مسٹر ایمری (وزیر ہند) سے کبھی ملاقات نہیں کی، نہ انھیں دیکھا اور نہ ان کی کبھی تقریر سنی، نہ ان سے یا تین چار پشتوں تک ان کے متعلقین سے کبھی خط وکتابت کی۔

اس امر پر زور دینے کی یوں ضرورت لاحق ہوئی کہ جس دن سے میں نے ہندوستان میں قدم رکھا یہاں کے قوم پرست اخبارات نے باوجود میری انتہائی حیرت ولاعلمی کے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا جیسے میں برطانوی شہنشاہیت کا نمائندہ

ہوں، یا بھیس بدلے ہوئے ایک قاصد ہوں جو تمام اقسام کے پوشیدہ سیاسی ملکی ہتھیاروں
سے مسلح ہو۔ نہایت شدت کے ساتھ اس پر زور دیا گیا کہ میں حکومت کے خرچ پر ایک قسم
کے ادیب اسٹیفورڈ کرپس کا پارٹ ادا کر رہا ہوں۔ ایک اخبار نے تو مذاق سلیم اور
توازن دماغی کو اس حد تک کھو دیا کہ میرے سامنے ہندوستان میں وائسرائے کا عہدہ
پیش کیے جانے کا اعلان کر دیا۔[1]

افسوس کہ حقائق اتنے دلفریب نہیں ہیں، بات اتنی سی ہے کہ میں ابتداءً
"الائیڈ نیوز پیپرس" کے نامہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان آیا، ایک طویل اور
خطرناک سلسلۂ علالت نے اس تعلق کو برقرار رہنے نہیں دیا۔ اس کے بعد میں ایک آزاد
ناظر کی طرح یہاں ٹھہرا رہا۔ اور جب میں نے محسوس کیا کہ میرا مطالعہ کافی ہو گیا ہے تو میں نے
یہ کتاب لکھ ڈالی۔ یہ تمام تر شخصی نقطۂ نظر کی محض شخصی ہی ترجمانی ہے۔

اس مقدمہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اپنے ان ہندوستانی دوستوں سے
جنھوں نے میری مہمان نوازی کی اور میرے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا خصوصاً ہندوؤں
سے پیشگی معافی مانگ لوں۔ بلاشبہ ان میں سے اکثر اس کتاب کو بسم اللہ کی ب سے
تمت کی ت تک نفرت کی نظر سے دیکھیں گے، اور بعض اعتبار سے تو میں خود بھی
اس کتاب سے نفرت ہی کرتا ہوں کیونکہ جیسی کتاب میں لکھنا چاہتا تھا یہ کتاب اس
سے بالکل ہی مختلف ہے میں ہندوستان میں بڑی امیدوں اور بلند عزائم کے ساتھ
آیا تھا لیکن ان ساری امیدوں اور عزائم کو خیرباد کہہ دیا اور آپ دیکھیں گے کہ
صرف آپ ہی کے لئے میں نے انھیں خیرباد کہہ دیا ہے۔ — بیورلی نکلس

---

[1] بمبئی سینٹینل مورخہ ۱۵ مئی سنہ ۱۹۴۳ء

حصّہ اوّل

پہلا باب

ہندوستانی نہیں ملتا

کیا آپ کسی ہندوستانی سے کبھی ملے ہیں؟

سوال بڑا ہی حیرت انگیز تھا۔ سائل کا اس سے نہ جانے کیا مقصد تھا۔ کسی ہندوستانی سے ملاقات؟ میں تقریباً ایک سال سے اس ملک میں ہوں۔ ہزاروں میل کے سفر کئے، صوبہ مغربی شمالی کی برف پوش پہاڑیوں سے لیکر ٹراونکور کے گنجان سواحل تک پہنچا، حیدرآباد کے کوہستانوں سے مدراس کے بازاروں تک کی سیر کی اور بمبئی کی عیش کوشیوں سے کنگال کلکتہ کے کاسۂ گدائی تک کو دیکھا۔ بالآخر اب ہمالہ کی چھاؤں میں ذرا دم لینے کے لئے یہاں آگیا ہوں۔

...... پھر بھی مجھ سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ "کبھی کسی ہندوستانی سے ملے ہیں؟

...... اچھا تو آپ سے ملے ہیں؟

...... میں نے نہیں سمجھا۔ کیا اس میں کچھ مغالطہ ہے۔

...... ہو سکتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ مجھے نیچے جا کر ایک بار گزیدہ قلی کو دیکھنا ہے آدھے گھنٹے میں میں واپس آجاؤں گا پھر ہم دونوں ایک ایک چھوٹا گلاس نوش کریں گے، اور آپ اس وقت ہمارے سوال کا جواب دیں۔

میں اتر کر وادی میں چلا گیا۔ اس جگہ سے تیس میل پر برف پوش کنچن جنگا کے سفید حاشیے بے داغ نیلے نیلے آسمان کے مقابل اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے آسمانی دھوبی گھر میں کپڑے سوکھنے کو ڈالے گئے ہوں اور اب فرشتے اسے عظیم الشان ٹوکرے میں جمع کرنے والے ہیں۔ فرشتوں کو جلدی ہی کرنی پڑے گی کیونکہ آفتاب تیزی سے غروب ہوتا جا رہا ہے۔ اور کائنات کے اس سفید تھان پر سنہرے، قرمزی اور اس خوشنما سبز رنگ کے دھبے لگ رہے ہیں جو ہندوستان میں شفق کی روشنی کے ساتھ مخصوص ہے۔

ذرا قریب تر پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جو نشیب و فراز بناتا سیم رقصاں کی ایک ندی پر ختم ہوتا ہے۔ ندی ہم سے اس قدر نشیب میں بہ رہی ہے کہ پانی کی رفتار سے پیدا ہونے والا ترنم ہم تک بہت ہی دھیما ہو کر پہنچتا ہے۔ ہمارے اور ندی کے درمیان بجز چائے کے باغوں کے اور کچھ نہیں چائے کے باغ ہزار ہا ایکڑ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وادیوں میں اوپر سے نیچے تک چائے کے پودے ہی پودے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جھیل اونٹاریو کو چائے کی شکل میں مبدل کر دینا چاہے تو یہاں اس قدر چائے کی پتیاں موجود ہیں کہ یقیناً اس کے لئے بھی کافی ہوں گی۔ ڈاکٹر جانسن یقیناً ایک دوامی کیف میں بسر کر سکتے ہوں گے!

۔۔۔۔ کیا آپ کبھی کسی ہندوستانی سے ملے ہیں؟

اس کا کیا مطلب ہے، یقیناً اس سوال کے پیچھے کوئی مقصد ہے۔ سائل کوئی مسخرا آدمی نہیں ہے، اور اگر بالفرض وہ ایسا ہوتا بھی تو دارجلنگ میں بیس سال گزارنے کے بعد وہ ایسا باقی نہ رہتا۔ دوامی برف کی دنیا میں رہ کر آپ ظریف ومسخرے نہیں رہ سکتے۔

میں ان چند ہندوستانیوں کے متعلق سوچنے لگا جن سے میں مل چکا تھا یہ لوگ میرے دماغ کے پردہ پر چلتی پھرتی تصویروں کی طرح آتے رہے جن کا تنوع اور جن کے رنگ حیرت انگیز تھے۔

ان تصاویر کے سلسلہ میں سب سے پہلے میرے سامنے چار قاتلوں کی تصویریں آئیں۔ یہ لوگ پشاور کے ہسپتال میں میرے ہمسایہ رہ چکے تھے۔ ان لوگوں کو چارپائیوں میں زنجیروں سے باندھ دیا جاتا تھا، اور رات کو ان کی زنجیروں کے بجنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، آپ آسمان وزمین کے اس دوران میں قاتلوں کا اتنا خوشنما گروہ نہیں نہ پاسکیں گے، جن کی آنکھوں میں تواضع، آوازیں نرمی اور خدوخال میں شرافت موجود ہو۔ ان میں سے ہر ایک نے عشق، اچھے جذبات یا عزت کے لئے قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ کسی نے چاندی سونے کے لئے یہ جرم نہیں کیا تھا ـــــــ مغربی شمالی سرحد پر یہی ہوا کرتا ہے۔

قاتلوں کے پیچھے پیچھے ناچنے والی تین لڑکیوں کی تصویریں آئیں (کیونکہ دماغ پر یادیں بسنے والی پرچھائیاں وادیوں میں مرنے والے سایہ کی طرح دھندلی ہوتی ہیں۔ اور دھوکے دیتی ہیں) ان لڑکیوں کو مہاراجہ میسور کے محل میں ایک مذہبی جلوس میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ میں نے انھیں وہیں دیکھا تھا۔ یہ توقع سے اس قدر تعجب خیز حد تک برخلاف تھیں کہ انھیں ایک بار دیکھ کر

کبھی بھولا نہیں جا سکتا تھا۔ ہم سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے پورے ایک گھنٹہ تک رنگوں کے ایک دریائے مواج کو دیکھتے رہے، لوگ جھنڈیاں لئے گزرتے رہے سُرخ اور زرد تار پالکیاں گزریں، سپاہی مار رہاں طلائی عصا لے کر گزرے برہمن آئے جن کے ہاتھوں میں نقرئی جڑاؤ مشعلیں تھیں ——— اور اس کے بعد مقدس گائیں پہنچیں۔ بڑے ناز اور بڑے ٹھاٹھ سے ان کی پیٹھیں قرمزی و لاجوردی جھولوں سے مزین تھیں اور ان کے سینگھ سونیے جگمگا رہے تھے، ان کے چہروں پر سیندور اور عبیر ملے ہوئے تھے حتیٰ کہ ان کے پاؤں بھی سونے اور کانسی کے کڑوں سے سجائے گئے تھے۔

آخر میں وہ ناچنے والی لڑکیاں تھیں۔

لوگ چلا اُٹھے، دیکھو وہ آئیں۔

لیکن کہاں؟ میں بڑی بے صبری کے ساتھ آگے کو جھکا۔ بہرحال ان لڑکیوں میں سے پہلی ہی اپنی جگہ پر ایک حقیقت کے اِنکشاف کا مقام رکھتی تھی ——— موجودات میں سے کسی نسل کو فطرت فیاض کی طرف سے شعر اور محبت کا اِتنا نادر ذوق نہیں مِلا ہوگا۔

وہ رہیں رقاصائیں، ایک طلائی، دوسری ارغوانی اور تیسری نقرئی لباس میں۔

...... کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو؟

...... ہاں میں نے دیکھا۔

میں نے دیکھا مس زاروچس کو، مس ہیلڈی رائٹ کو اور اس لیڈی کو بھی میں نے دیکھا جو آنجہانی ڈچس آف ٹیک سے بہت مشابہ تھی۔

یہ تمام عورتیں اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب تھیں، لیکن انھیں خود ہی

اس کا اقرار ہوگا کہ وہ افسانوی رقاصاؤں کی جگہ اپنے آپ کو نہیں پیش کر سکتیں؛ حقیقتہً یہی عورتیں ماضی میں نہیں ناچتی رہی تھیں بلکہ وہ ان کی ہندوستانی ثنی اجات تھیں۔ یہ عورتیں کیوں بلائی گئی تھیں؛ اس کی وجہ یہ تھی کہ میسور میں رقص کا فن مُردہ ہوچکا ہے۔ اور یہ تین بہترین تھیں جو مل سکیں۔

لیکن ان سے آنکھوں کو چوٹ لگتی تھی۔ خصوصاً اس مشرقی مس ٹپ سے جس نے اپنے کولہے کو اس طرح لچکایا اور گردن کو اس انداز میں مٹکایا کہ ہندو دیوتا کو تو یہ انداز پسند آسکتا تھا مگر ایک مغربی تماشائی کے خوف زدہ کردینے کے لئے کافی تھا۔

اس سے کام نہیں چلے گا۔

تقریباً اندھیرا ہو رہا ہے، میرا دوست بارگزیدہ قلی کو دیکھ کر واپس آجائیگا اور میں نے اس کے سوال کا جواب ابھی سوچنا بھی نہیں شروع کیا ہے۔

...... کیا آپ کبھی کسی ہندوستانی سے ملے ہیں؟

...... کسی ہندوستانی سے ملاقات کی ہے؟

کسی ہندوستانی سے؟

میں نے کتنے ہندوستانیوں سے ملاقات کی ہے، کہنے کو تو کم از کم ایک ہزار ہندوستانیوں سے۔ لیکن ان میں سے ایک ایک کو یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

فرض کیجئے میں نے اجمالی نظر ڈالی؛ میں نے ہندوستان کو اپنے حقیقی رنگ میں ایک بلند ترین مقام سے دیکھا۔ آبادی کو مختلف ٹولیوں میں منقسم پایا۔ ان دلفریب تصویروں کی طرح جن سے ایک عامی کسی بڑی لڑائی کا ایک ہلکا سا خاکہ معلوم کر لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اجمالی نظر ہماری کچھ مدد کر سکے۔

پہلا گروہ اٹھارہ کروڑ اعلیٰ ذات کے ہندو، کیا یہ ہندوستانی ہیں بلاشبہ یہ ہندوستانی ہیں لیکن ذرا ٹھہریئے یہ ہندوستانی ہیں یا وہ چھ کروڑ پست اقوام جو خاک دھول میں اٹے کھڑے ہیں؟ بلکہ ذلت کے ساتھ زمین پر پڑے ہیں؟ کیا یہ بھی ہندوستانی ہیں؟ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے نزدیک تو وہ انسان ہی نہیں ہیں وہ اچھوت ہیں۔ ان کے برتن میں پانی پینا روحانی زہر کے برابر ہے ان کا سایہ تک ناپاک ہے۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن پر نظر پڑنا بھی بری بات ہے۔ وہ مجبور ہیں کہ دن بھر اپنے آپ کو چھپائے رکھیں اور صرف رات کو جب کہ چاند بادل میں ہو باہر آیا کریں۔

اگر ان چھ کروڑ (برطانوی شہنشاہیت کی پوری سفید فام آبادی کے تقریباً مساوی) انسانوں کو خود ان ہی کے بھائی کمتر بلکہ کمترین جانوروں سے بدتر سمجھتے ہیں تو ایک مغربی انسان انھیں کس طرح ہندوستانی کے نام سے یاد کر سکتا ہے۔ وہ اور یہ دونوں تو ہندوستانی نہیں ہو سکتے۔ یا ہو سکتے ہیں؟ یہ ایک بڑا ہی مشکل معمہ ہے[1]

چلو، ہندوؤں کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دو۔ ہم مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ کتنے ہیں؟ تقریباً دس کروڑ۔ ہم ان سے یہ نہیں پوچھتے کہ تم ہندوستانی ہو؟ کیونکہ یہ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں کہ ہم ہیں ہندوستانی برطانیہ کو چھوڑ کر صرف ہم ہی وہ نسل ہیں جس نے ایک عظیم الشان ہندوستانی شہنشاہیت قائم کی تھی۔ ہم اپنی شہنشاہیت واپس لینا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے

---

[1] مسٹر گاندھی کے بلند بانگ اعلانات، اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر کی مساعی اور برطانوی قانون سازی کے باوجود ہندوستان میں اچھوتوں کا حال اب تک تقریباً ویسا ہی افسوسناک ہے جیسا کہ ہمیشہ تھا۔

کہ یہ شہنشاہیت پورے ہندوستان کی شہنشاہیت نہ ہو (اگرچہ ہم میں سے بعض حضرات قوت حاصل کرنے کے بعد عمل سے متعلق اپنا خاص تصور رکھتے ہیں) لیکن یہ شہنشاہیت کم ازکم مسلم شہنشاہیت ہوگی۔ یہ ہندومت کی آلودگیوں سے اِمکانی حد تک پاک ہوگی۔ ہندومت ایک الگ مذہب، بلکہ ایک الگ کلچر اور ایک الگ معاشرتی نظام ہے۔ اِس شہنشاہیت کا نام ہوگا "پاکستان"۔

پاکستان! پاکستان! اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ نامانوس و ناپیدا شہنشاہیت، جس کا وجود صرف ایک خواب ہے، ہم آگے چل کر اِس پر تحلیلی بحث کریں گے۔ اِس جگہ صرف اِس قدر کہنا ہے کہ پاکستان کے نعرہ سے کہیں ہندوستان کے بقیہ ہوائی قلعے ڈھیر نہ ہو جائیں۔

الغرض مسلمان اگر ہندوستانی ہیں تو ہندو ہرگز ہندوستانی نہیں اور اگر ہندو ہندوستانی ہیں تو مسلمان ہندوستانی نہیں معلوم ہوتے، اِنسانوں کا یہ عظیم الشان وسیع مجموعہ باہمی اختلافات کے بارے میں اِتنا حسّاس واقع ہوا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف ساتھ ملکر کھا نہیں سکتے، ساتھ مِل کر عبادت نہیں کر سکتے، ساتھ مِلکر سوچ نہیں سکتے بلکہ وہ ساتھ ملکر ایک وحدانی رقبہ میں زندگی بسر کرنے سے بھی انکار کرتے ہیں وہ اپنا الگ جغرافیہ اور الگ تاریخ چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زمین الگ چاہتے ہیں، اور اپنا آسمان الگ۔ ان میں سے بہت بڑی اکثریت کی زبان پر "ہندوستانی وطنیت" کا دعویٰ کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔

۴

روشنی دم بدم مدھم ہوتی جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے

ساتھ ساتھ کسی ہندوستانی سے ملاقات کا موقع بھی ختم ہو رہا ہے ایسے ہندوستانی سے ہم جس کی تلاش میں ہیں۔

لیکن شاید ہم تعداد سے خوش ہو گئے۔ اور لاکھوں کے شور میں فرد کی آواز گم ہو کر رہ گئی۔ اب ہم ایک دوسرے مختلف طریقہ سے ہندوستانی سے ملاقات کی کوشش کریں۔ ہم ہندوستان کے سب سے چھوٹے فرقہ پارسی سے شروع کرتے ہیں۔

پارسیوں کی تعداد نوّے ہزار (۹۰۰۰۰) سے بھی کم ہے۔ ان میں سے تقریباً آدھے بمبئی میں آباد ہیں۔ دنیا اپنی ہمہ گیری کے باوجود پارسیوں کے طریقۂ زندگی کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ اِس سلسلہ میں دنیا کی توجہ پارسیوں کے اس سلوک کی طرف مبذول ہونی چاہیئے جو یہ لوگ اپنے مُردوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ پارسی یعنی پیغمبر زردشت کے پیرو اپنے مردوں کو شہرِ خموشاں میں لے جا کر رکھ دیتے ہیں تا کہ وہ گدھ ان پر گریں اور چٹ کر جائیں جو وہاں تاک لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ دنیا سے رخصت ہونے کا یہ طریقہ پہلی نظر میں کتنا ڈرامائی بلکہ کس قدر دہشت انگیز ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے تو یہ واضح بھی ہے اور اٹل بھی۔ اگر آپ کا عقیدہ یہی ہے کہ صرف روح سب کچھ ہے اور یہ گوشت پوست کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ تو یہ خیرات کی آخری مد ہے جو انسان اس زمین کو دے سکتا ہے جس نے اس کے بدن کی پرورش کی تھی، آدمی اپنا بدن گدھوں کے حوالے کر دے۔ بہرحال گدھ بھی تو خدا ہی کی مخلوق ہیں۔

یہ کتاب مردوں کی کتاب نہیں بلکہ زندوں کی کتاب ہے۔ ہم پارسیوں کو ان کی زندگی کے کارناموں سے جانچتے ہیں۔ باوجودیکہ

پارسیوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے لیکن یہ لوگ ہندوستان میں خاصا اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس جگہ پھر ہمیں یہ امید پیدا ہوجاتی ہے کہ ہندوستانی جس کی تلاش میں ہم سرگرداں ہیں۔ ہمیں ضرور مل جائے گا۔

جہاں کہیں دولت مند پائے جائیں آپ پارسی کو ضرور پائیں گے ذرا مجھے جلدی سے کہنے دیجئے کہ اگرچہ یہ لوگ گدھوں کی خوراک ہی بننے والے ہیں لیکن دولت پیدا کرنے میں محرک اول کی خدمت انجام دے رہے ہیں ایک ہی مثال لیجئے، یہ ٹاٹا کے صنعتی کارخانوں کا جو ایک جال سارے ملک میں بچھا ہوا ہے تمام تر پارسیوں کا ہے۔ نقشہ پارسیوں کا۔ عمل پارسیوں کا اور ان دلوں میں رہنمائی بھی پارسیوں کی۔ صنعتی ہندوستان محض ٹاٹا کا کار دیا ہے۔ جمشید پور میں اس کا لوہے کا کارخانہ ہے جس میں تیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ یہ کارخانہ پورے قلمرو برطانیہ میں لوہے کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ اس کا برق آبی نظام جو (۲۵۰,۰۰۰) ہارس پاور رکھتا ہے ملک میں سب سے بڑا نظام ہے۔ اس کی صنعت طیارہ سازی کچھ ہی دنوں میں مغرب کے بڑے سے بڑے کارخانہ کے مقابل ہوجائے گی۔ ٹاٹا کے ہاں سب کچھ بنتا ہے۔ گلائیڈر سے لے کر گڑیا تک اور کارک اسکرو سے لے کر ایڈ ڈی کلون تک۔

جہاں کہیں آپ کلچر پائیں گے آپ پارسی کو ضرور پائیں گے۔ غالباً صرف پارسی ہی وہ ہیں جو آرٹ کی سرپرستی کرتے ہیں۔ یہی ہیں جو معاشرتی خدمات پر اپنی دولت کا کافی حصہ صرف کرتے ہیں ہسپتال بناتے ہیں۔ کتب خانے قائم کرتے ہیں۔ نزہت گاہیں اور کھیل کود کے میدان بنواتے ہیں۔ ہندوستانی پریس کی معمولی حالت سے بلند اگر کوئی دکھائی دیتے ہیں تو وہ بھی پارسی ہی ہیں۔

ہندوستان بغیر پارسی کے ایسا ہی ہے جیسے انڈا بغیر نمک کے بلکہ اس انڈے کی زردی کا بڑا حصہ بھی معدوم ہوگا۔

مگر ——— اور یہ بہت بڑا مگر ہے ——— ہم ان پارسیوں کو بھی حقیقتہً ہندوستانی نہیں کہہ سکتے (چاہے وہ خود اس خطاب کے دعوی دار ہوں) ان میں سے بہت سے لوگ اپنے آپ کو ایک علیحدہ فرقہ قرار دینا کچھ اچھا نہیں سمجھتے اور رواداری کے ساتھ بسر کرتے ہیں) ہندوستانیوں کی بہت بڑی اکثریت پارسیوں کو اس خطاب کے دینے سے انکار کرتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ پارسی حقیقتہً پارس کے باشندے ہیں جیساکہ خود ان کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ہمیشہ سے ایرانی تھے، ایرانی ہی ہیں اور ایرانی ہی رہیں گے۔ یہ لوگ جب پارسیوں کے متعلق یہ کہتے ہیں تو کچھ نرم لب و لہجہ میں نہیں کہتے کیونکہ پارسیوں نے ان میں بڑا تیز جذبہ حسد پیدا کر دیا ہے۔ لاکھوں انگلیاں ان کے زر و مال پر قبضہ کر لینے کے لئے کھجلا رہی ہیں ——— ذرا ٹھہریئے، ہمیں آزاد ہو لینے دیجئے۔ آپ کو پارسی کی خاک بھی نہ ملے گی۔ یہ ہے نیت، اور یہ ہے وہ طریقۂ فکر جس پر پارسیوں کو اچھی طرح توجہ مبذول کرنی پڑے گی۔

۳

اب تاریکی تقریباً پوری طرح مسلط ہوگئی۔ ہمارے گرد و پیش کی پہاڑیوں اور وادیوں کی تاریکی اور ہمارے دماغوں کی تاریکی جو اس تلاش و تفحص میں طاری ہے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے نہیں دیتی۔ ایک ہندوستانی نہیں ملتا۔

آسمان میں جس طرح روشنی کی چند کرنیں پائی جائیں ایسا ابھی ہمارے دماغوں میں بھی امید کی کچھ شعاعیں موجود ہیں۔ ابھی تو لاکھوں کی تعداد رکھنے والے

کئی فرقے باقی ہیں جن پر ہم نے ابھی تک غور نہیں کیا ہے۔ مثلاً سکھ، جین، بدھی، عیسائی، ہو سکتا ہے کہ ان میں کہیں کوئی ہندوستانی مل جائے۔

ہم ایک آخری کوشش کرتے ہیں۔ پہلے سکھ کو لیجئے۔ سکھ ہندوستان کے پکے اشرافیت پسندوں (ارسٹوکریٹس) میں سے ہیں۔ یہ لوگ جری ہیں اور ستھری زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ بدن اور دماغ دونوں اعتبار سے چست ہیں۔ اور اپنے اولین گرونانک جی (۱۴۶۹ - ۱۵۳۹) کی تعلیمات میں وہ ایک الہامی فلسفہ بھی رکھتے ہیں۔ گرونانک نے ہندو برہمنوں کی اسی طرح تنبیہ کی جیسے مسیح نے فریسیوں کی تنبیہ کی تھی۔ اس نے آواز دی "تو نہاتا ہے، دھوتا ہے اور پتھروں کی پوجا کرتا ہے۔ لیکن خدا کا رنگ تجھ پر نہیں ہے۔ اس لئے تو سب سے زیادہ ناپاک ہے۔" ناقابل فراموش طاقت کے الفاظ میں اس نے خدائی قوت کا سنکھ پھونکا۔ (وہ ایک کیڑے کو شہنشاہی عطا کر سکتا ہے اور ایک فوج کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتا ہے) اور اس کی یاد کے کافی ہونے کو اس طرح بتایا (اگر تو چاہے تو خشک میدانوں میں دریا ابل سکتا ہے اور کنول کا پھول آسمانوں میں کھل سکتا ہے۔ اگر تو چاہے تو آدمی دہشت ناک سمندر کو عبور کر سکتا ہے۔ میں تیری ہی ذات میں سکونت پذیر ہوں۔ اور تیری ذات میں رہنا میری ساری آرزو ہے) گرونانک ایک حقیقی صوفی تھے۔ لیکن انھیں عام انسانوں سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کی تعلیم نے اپنی سادگی اور روزمرہ زندگی کی آسان تعبیر ہونے کی وجہ سے دیہاتیوں کے قلوب پر گہرا اثر کیا۔ (شیطانی دماغ ایک کمینہ عورت ہے بے رحمی قصاب کی بیوی ہے۔ لالچ ایک کتا ہے۔ وہ کھانا جو دغا سے حاصل ہو سڑی ہوئی لاش ہے، اور غصہ وہ آگ ہے جو خود غصہ کرنے والے کو جلا دیتی ہے)[1]

---

[1] سر جوگندر سنگھ کی کتاب "ذس اسپوک گرونانک" مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

لیکن اپنے بڑے گرو کی یاد کے ساتھ سکھوں کی وابستگی ہی نے ان پچاس لاکھ انسانوں کو سب سے الگ تھلگ ایک نسل بنا دیا۔ وہ کبھی نہیں بھولے کہ مغل بادشاہوں نے انھیں سزا دی تھی، اور دھوکہ باز فرماں روا اورنگزیب نے ان کے نویں گرو کو اسلام قبول کرنے سے انکار کی بنا پر قتل کرا دیا تھا۔ انکی مسلمانوں سے عداوت نے انھیں پاکستان کے خواب کا کٹر دشمن بنا دیا ہے' کیونکہ اگر کبھی یہ خواب حقیقت بن جائے تو سکھ جو تقریباً سب کے سب پنجاب ہی میں رہتے ہیں اپنے آپ کو یاس انگیز تنہائی میں پائیں گے اور کسی شمار و قطار میں نہ ہوں گے۔ ان کے لئے یہ گویا دشمنوں کے وسیع سمندر کے بیچ میں وفاداروں کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہوگا۔

سکھ شور مچاتے ہیں کہ اگر آپ (برطانیہ) پاکستان عطا کرتے ہیں تو ہم ایک علیحدہ سکھ مملکت قایم کریں گے ہم اسے "خالصتان" کہیں گے اور اپنی جان کی بازی لگا کر اس کی حفاظت کریں گے۔

"ہندوستانی ہونا سب کچھ ہے" ....۔ اگر ہم ایسا ہندوستانی تلاش کریں جو مذکورہ جملہ کو پورے خلوص کے ساتھ بغیر ریاکاری اور ذاتی منفعت کے تصوّر کے کہتا ہو تو یقیناً وہ شخص سکھ نہیں ہو سکتا۔

کیا اس خیال ہی کو ختم کر دیں؟ کیا ہم لیٹ کر اس املی کے درخت کو دیکھیں جس کی ڈالیوں پر جگنو جمع ہو رہے ہیں۔ اور اس میں ہزار ہا چنگاریاں سی ایسی چمکتی نظر آتی ہیں جیسے کسی بہت بڑے کرسمس درخت میں؟ لیکن کرسمس کے لفظ سے ہمیں یاد آجاتا ہے کہ ہندوستان میں ایک مذہب اور ہے جس پر ہم نے اب تک غور نہیں کیا ہے۔

جیسا ہندوستانی ہم تلاش کر رہے ہیں' شاید وہ کوئی عیسائی ہو؟

حضرت مسیح کی اعلیٰ تعلیم میں سب کچھ رہا ہوگا۔ مسیح نے عیسائی کو تعلیم دی کہ وہ برادر کشی کے قسم کی ساری نفرت کو بھول جائیے اور اپنے آپ کو مسیح خدائی گھرانے (ہندوستانی گھرانہ) کا ایک رکن سمجھے ــــــــــ

کیا عیسائی ایسے ہی ہیں؟ اس سوال کا جواب ہم ایک واقعہ کو بیان کرکے زیادہ اچھی طرح دے سکتے ہیں۔

مدراس کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھے ہوئے مجھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی، میں اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوست نے گوا کے قدیم گرجاؤں کی تصویریں لے رکھی تھیں جو مجھے دکھانے والے تھے ــــــ گوا پرتگالی مقبوضہ ہے اور وہاں اٹھارہویں صدی کی انوکھی طرز کے بہت سے گرجے بنے ہوئے ہیں۔ اب یہ گرجے اجاڑ اور بوسیدہ حالت میں ہیں ان کے جواہرات چرا لئے گئے اور دو صدی کی ہندوستانی دھوپ نے ان کے رفیع الشان رنگوں سے رنگ کا آخری نشان تک دھو کر صاف کر دیا ہے۔ اب یہ سمندر کے کنارہ پر بھوتوں کی طرح کھڑے ہیں۔ ان کے دریچے اس طرح کھلے ہوئے ہیں جیسے منتظر آنکھیں ــــــ لیکن شکستہ اور بوسیدہ ہونے کے باوجود ان گرجاؤں میں اب بھی عبادت گزاروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہندوستان کے وہ لوگ ہیں جو ایک زمانہ قبل عیسائی ہو گئے تھے اور اب تک قدیم عقائد پر قائم ہیں۔

میرا دوست جس کا میں منتظر تھا، آ پہنچا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی

..... خوب آئے، آپ کو چوٹ کہاں آگئی؟

...... اس نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ بہترین مقام پر گرجا میں "

..... گرجا میں؟

اس نے بیان کیا کہ وہ عشائے ربانی کی دعا پڑھ رہا تھا جب مقدس

شراب تقسیم کی جانے لگی تو ایک ہندی عیسائی نے دیکھا کہ پیالہ ایک ایسی عورت کے ہاتھ میں چلا گیا جو ذات میں اس سے کمتر تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کوشش کی کہ پیالہ کو اس عورت کے ہاتھ سے جھپٹ لے۔ عورت نے چیخ پکار مچائی اور اس کی ذات کے لوگ بچانے کے لئے اکٹھے ہو گئے، پھر کیا تھا پارٹیاں تیار ہو گئیں اور چند سکنڈ کے اندر ہندوستانی محاربین کی غیر مقدس صفیں ایک ایسے چبوترہ پر جس پر خون اور شراب کے دھبے تھے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے لگیں۔

..... میرے دوست نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں صدمہ ہوا؟

..... یقیناً یہ کوئی خوشگوار واقعہ نہیں ہے۔

اف، اوہ، یہ تو سارے ہندوستان میں اور ہر گرجا میں ہوتا رہتا ہے صدمہ کی کیا بات ہے، ادھر جنوبی ہند میں تو جھگڑا اتنا بڑھ جاتا ہے کہ مقدس جلوس کو بیچ راہ میں روک دیتے ہیں۔ لوگوں کی عادت ہے کہ ایک دوسرے کے ہاتھ سے چھین کر جھنڈیوں کو پھاڑ دیتے ہیں۔ یہ صورت حال عشائے ربانی کے موقع پر تو اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ کانسی کے چھوٹے چھوٹے ملتے مختلف ذاتوں کے لئے بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی لوگ بگڑتے ہیں کہ ایک ہی پیالہ سے پی کر وہ نجس ہو گئے۔

..... مسیح کے پیالے سے اور نجاست؟

ہندوستانی ہونا سب کچھ ہے۔

تلاش ختم۔

۴

اب تاریکی کسی قدر کم معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ستارے نکل پڑے ہیں

اور جگنو املی کے درخت پر چراغاں کئے ہوئے ہیں پورا درخت جگمگا رہا ہے۔ حتیٰ کہ پتوں پر چاندی چڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چھوٹا سا چاند درخت کی نچلی شاخوں میں زرتار لباس میں ملبوس گڑیا کی طرح چمک کر ڈالیوں کو اور بھی روشن تر بنا رہا ہے۔

پہاڑی کے دامن میں پیروں کی آواز آئی۔ میرا میزبان قلیوں کے ایک گروہ کو ساتھ لئے ہوئے نمودار ہوا ان کے خط وخال خالص چینی قسم کے ہیں شمالی بنگال کے باشندے ایسے ہی ہوتے ہیں (کیا یہ لوگ ہندوستانی ہیں؟ —— لیکن نہیں —— ہم اس سوال کو چھوا چکے) اس نے قلیوں کو کچھ ہدایات دیں اور وہ سب ایک لے سے گیت گاتے ہوئے پہاڑی راستوں پر پھیل گئے۔

میرے میزبان نے کہا۔ اس ارگزیدہ نوجوان کو ہم نے موت کے منہ سے کھینچ لیا' اس کے بعد وہ شیشہ کی صراحی کی طرف بڑھا اور پوچھنے لگا۔ چھوٹا یا بڑا؟

...... میرا خیال ہے کہ بڑا۔

.... تمہاری ہندی پچھلے سال آئی ہے۔

...... تمہیں میری تامل[1] زبان سننا چاہیئے۔ میری بنگالی[2] کے متعلق تو کچھ کہنا ہی نہیں۔

---

[1] جنوبی ہند کے تین کروڑ باشندوں کی مادری زبان۔

[2] پانچ کروڑ باشندوں کی مادری زبان۔ یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ سب ہندی سے بالکلیہ مختلف ہیں۔

...... یہ ایک عجیب ملک ہے، ہے نا عجیب؟

...... تم نے ملک کہا، یا ملکوں؟

اس نے مجھے دیکھ کر مسکرا دیا اور کہا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے سوال کا جواب شاید سوچ لیا ہے؟

...... ہاں سوچ لیا ہے۔

...... وہ جواب سلبی ہے؟

...... ہاں سلبی ہے۔

...... بہت خوب آپ نے کچھ سیکھ لیا ہے، اور بہت سے انگریزوں سے جلدی سیکھ لیا۔

...... ہو سکتا ہے کہ میں نے سیکھ لیا ہو۔ مگر آپ غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ جواب محض ناکارہ اور بالکل غیر تشفی بخش ہے

...... آپ کا ارادہ کیا ہے؟

...... میں چاہتا ہوں کہ ایک کتاب لکھوں۔ اور یہ بڑا ہی مشکل کام ہے کہ سلبی یادداشتوں پر کوئی کتاب تصنیف کی جائے۔

...... لیکن فرض کیجئے کہ دوسرا چارہ کار نہ ہو تو آپ کیا کریں گے؟

وہ آگے کو جھکا اور بڑے اہتمام سے کہا کہ فرض کیجئے، آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان تمام تر عدمیات و سلبیات ہی کا سلسلہ ہے تو کیا کریں گے؟ آپ ابھی مجھ سے بیان کر چکے ہیں کہ جدید العصر آرٹ کی آپ نے بہت تلاش کی مگر نہیں پایا۔ آپ نے ہندوستان کی سیاسی دنیا میں درجنوں اشخاص سے ملاقاتیں کیں اور خود مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ ان میں سے کسی کے پاس حقیقۃً کوئی تخلیقی تجویز نہ تھی[1]۔ کیا دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ نہیں

[1] یہ بات مسٹر جناح کی ملاقات سے قبل کی ہے۔

ان کے پاس "نہیں" کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہ تھا حالانکہ ان کے پاس "ہاں"
ہونا چاہیئے تھا۔
...... یہ ایک طرز ادا ہے۔
..... لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ ہندوستان شروع سے آخر تک "نہیں" "نہیں"
کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہے؟
...... میں بہت پریشان ہوں، میں اس قسم کے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔
...... لیکن اگر آپ اپنی کتاب کو کسی کام کی بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ان کا جواب
دینا ہی پڑے گا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کو اس کا سبب بھی تلاش کرنا پڑے گا کہ
ایسا کیوں ہے۔
..... کیا اس کا کوئی سبب بھی ہے؟
...... میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب ہے۔ لیکن اس کا بتانا میرا فریضہ نہیں،
کتاب تو بہر حال آپ کی ہے۔
...... خیر! یہ میری بد قسمتی ہے۔
میرے لئے بہتر ہے کہ میں اب اپنا کام شروع کر دوں۔

دوسرا باب

شان و شوکت

مناسب ہے کہ ہم اس باب کی ابتدا اس طرح کریں کہ وایسرائے کے ہاں قیام کے لئے روانہ ہوں۔ اس سے ہمیں ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ معلومات تو نہیں حاصل ہوتیں لیکن دوسری حیثیتوں سے یہ ہمارے لئے معلومات افزا تجربہ ہے۔ اس کے ماسوا یہ میرا پہلا بلاوا ہے، ایک موہوم سی اُمید ہے کہ ہم اس طرح ایک قسم کا تاریخ وار تسلسل قایم کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اس کی ضرورت ہے، نہ صرف اس لئے کہ ہم ایک مسلسل تصویر پیش کر رہے ہیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہم ارتقائے ذہنی کا نقشہ کھینچنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان تمہارے نظام میں رہ کر جلد ہی سب کچھ حاصل کر رہا ہے۔ پہلے تاثرات حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مٹ جاتے ہیں۔ سنہرے پھولوں کے درخت اپنی دہکتی ہوئی کلیوں کے ساتھ تمہاری آنکھوں کو پہلی نظر میں خیرہ کر دیتے ہیں لیکن فوراً اپنی شان کھو بھی دیتے ہیں۔ آج تم اس طرف پلٹ کے بھی نہیں دیکھتے جدھر کل ٹکٹکی لگائے ہوئے بار بار دیکھ رہے تھے۔

یہی حال دہشت و بدحواسی کا ہے۔ ہندوستانی طبعاً جانوروں پر بے رحم نہیں ہوتے۔ ان کے دلوں میں جانوروں پر رحم کرنے اور ترس کھانے کا فطری جذبہ موجود ہے لیکن ان کی جہالت اور ان کا افلاس بالواسطہ جانوروں کو خوفناک

حد تک ایذا رسانی کا ذمہ دار ہے۔ میرے ہندوستان پہنچے ابھی دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ میں نے اپنے بلند قامت ممتاز گھوڑے کو دیکھا کہ وہ سڑک کے نیچے لڑکھڑایا ٹھوکر کھائی اور ایک پرنالہ میں جا گرا، لرزہ براندام کر دینے والے دکھ اور درد کے ساتھ

تم جب پہلی بار ایسی کوئی بات دیکھتے ہو تو اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کام کرتے ہو، لیکن عادتاً جو کچھ کرتے ہو وہ محض فضول اور بے فائدہ کام ہوتا ہے۔ سرگرمی دکھاتے ہو، پولیس والوں کو تنگ کرتے ہو اور گھوڑے کو کسی طرح کی مدد نہیں پہنچاتے —— اب تم تلخ مجبوریوں کی وجہ سے یہ نکتہ معلوم کر لیتے ہو کہ تمہیں اپنا دل سخت کر لینا چاہیئے۔

یہی معاملہ بھکاریوں کا ہے۔ کہ تم اپنا ہاتھ روک لیتے ہو۔ جب تم پہلی مرتبہ کسی ریلوے اسٹیشن پر جو ہندوستانی بھکاریوں کا مانوس اڈا ہے پہنچو گے تو تمہیں یہ محسوس ہوگا کہ گویا تم دائناسے کے پریشر میلہ میں اس گیلری سے گزر رہے ہو جہاں مداری عجیب الخلقت موسمی جانوروں کی نمائش کیا کرتا ہے ——— یہاں جذامی ہوں گے تیسرے درجہ کے مریض آتشک ہوں گے اور اندھے بچے ہوں گے ——— یہ بچے پیدائشی اندھے نہیں ہوتے بلکہ ان کے ماں باپ انھیں اس لئے اندھا کر دیتے ہیں کہ آئندہ چل کر بھیک کے بازار میں آمدنی کا بہتر ذریعہ ثابت ہو سکیں۔ یہاں سینٹ وی ٹس کی ناچنے والیاں ملیں گی اصلی بھی اور نقلی بھی، اور ان میں سے بعض خود اپنے دماغ کی پیدا کردہ ایسی لے الاپتی ہوں گی جو ان کی موت تک ختم ہونے والی نہیں۔ کچھ وہ ہوں گے جو اپنے نفع کے لئے تمہاری آستین کھینچتے ہوں گے کچھ دیوانے ہوں گے جن کی رال تھوڑیوں پر بہہ رہی ہوگی۔ کچھ گونگے بہرے ہوں گے کہ اپنے لٹکے ہوئے لبوں کو انگلیوں سے بجاتے ہوئے تمہارے ڈبہ میں جھانکتے ہوں گے پہلے چند دنوں تک تم اپنی خیرات ان سب کو دیتے رہو گے لیکن یہ خوفناک مخلوق سکہ کی آواز کے ساتھ اس طرح تمہارے گرد جمع ہونے لگے گی جیسے زمین سے

ابل رہی ہو، آسمان سے برس رہی ہو یا درختوں سے ٹپک رہی ہو، ہانپتی، کانپتی، روتی، کراہتی اور اپنا دکھ درد بتاتی ہوئی۔ بالآخر تم خیرات دینا بند کردو گے اور تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ ہندی میں دور ہٹانے کے لئے "جاؤ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، تم اس لفظ کو بار بار دھراؤ گے، بے تابی کے ساتھ دھراؤ گے، زور سے کہو گے، چیخ کر کہو گے چلا کر کہو گے۔ تب کہیں جا کر تمہیں آرام وسکون مل سکے گا لیکن یہ انوکھا سکون ہوگا جو لعنت ملامت کی آوازوں سے پُر معلوم ہوگا۔

بہرحال، ہم نئی دہلی پہنچے جہاں ایک بہت شاندار موٹر کار ہمارے لئے اسٹیشن پر منتظر تھی۔ ڈرائیور ایک توانا شخص تھا جو سفید لباس میں ملبوس تھا، لباس پر سنہری پٹیاں تھیں اس کے پہلو میں ایک دوسرا توانا اور مضبوط آدمی بھی تھا۔ ہم جب موٹر میں داخل ہونے لگے تو ہم نے اپنے سر کو ذرا بائیں جانب جھکایا تاکہ چند الفاظ میں قلی کا شکریہ ادا کردوں، قلی غیرمعمولی حد تک فرض شناس اور کارکرد آدمی تھا۔ لیکن الفاظ ہمارے لبوں تک آتے آتے خشک ہوگئے ہمیں کچھ نظر آیا . . . . یہ تھا پہلا صدمہ۔

۲

ہندوستان چھوڑ دو!

ہم سے چند قدموں کے فاصلہ پر یہ الفاظ جلی قلم سے ایک دیوار پر لکھے ہوئے تھے۔

میں نے ایک جھلستی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور میرے چہرہ پر سرخی سی دوڑ گئی۔ یہ سرخی غصہ کی نہ تھی بلکہ ایک قسم کی اخلاقی ندامت کے احساس سے

پیدا ہوئی تھی۔ جیسے کسی بزم میں بن بلایا مہمان پکڑ لیا گیا ہو۔

ہندوستان چھوڑ دو!

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ الفاظ شخصی طور پر مجھے ہی مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں میں نے گوشۂ چشم سے گھور کر اپنے عظیم القامت ڈرائیور کو دیکھا میں یہ فرض کر رہا تھا کہ اس ڈرائیور نے بھی ان الفاظ کو دیکھا اور منہ پھیر کے کڑک کر مجھ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے، آگے نہ بڑھو، نکلو! اپنے گھر جاؤ! لیکن یہ قوی ہیکل انسان بالکل بے حس بنا سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ہندوستان چھوڑ دو!

حقیقتاً یہ نہایت ہی غیر معمولی صورت حال تھی —— ایک صریح توہین تھی برانگیختہ و برافروختہ ہو جانے کا سامان تھا کہ سیکڑوں انسانوں کی آنکھوں کے سامنے پوری شان سے موجود تھا۔ لیکن کوئی شخص اس کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرتا تھا۔ کیا یہ لوگ اندھے تھے یا دھوپ سے آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں یا ان کے دماغ قابو میں نہ تھے؟ مسافر تیزی سے گزر گئے، برطانوی سپاہی اپنی عرق ریز پشتوں پر رائفل لئے چلے گئے، کاروباری حضرات اٹیچی کیس لئے نکل گئے، ہندوستانی عورتیں سبز و سفید ساڑیوں میں ملبوس چلی گئیں، برہمن پنڈے آئے، دیہاتی مرغیوں کی ٹانگیں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے آ رہے۔ ہندوستانی ملاح اپنے تھیلے لئے ہوئے اترے اور چلے گئے، کسی نے ادنیٰ توجہ بھی اس تحریر کی طرف نہ کی!

اس کے بعد میرے ذہن میں ایک دوسرا منظر آیا جو بہت دور کا تھا درخت خاکستری ہیں، نومبر کا کہر آلود موسم ہے، سیاہی مائل کٹہرا نظر آ رہا ہے یہ ہائیڈ پارک —— ہے عوام میں تقریر کرنے والے مقررین ہیں۔ ان کی

کرخت آوازیں میرے حافظہ میں گونجنے لگیں۔ یہ لوگ "چھوڑ دو" "چھوڑ دو" کا شور مچا رہے ہیں۔ یہ لوگ بادشاہ، ملکہ، لارڈ صاحبان، اور لیڈیوں کو کہہ رہے ہیں، انگلینڈ کے ان تمام حضرات سے کہہ رہے ہیں جو مرصع اور شاندار محلوں میں رہا کرتے ہیں۔ اور کوئی دھیان نہیں دیتا۔ پولیس والوں نے حقارت سے نہیں دیا۔ اور عوام نے گنوارو انداز میں مگر ہمدردی اور افسوس کے ساتھ ہاں میں ہاں ملائی۔ یہ الفاظ روہیں پیرے کے تھے، اور اس کے اثرات روسپلے کے۔

کیا انگلستان دوسری بار اپنا غیر شعوری خرق عادت ہندوستان میں پیش کر رہا ہے؟ کیا انگلستان ایک مرتبہ پھر آتش نشاں کو اس کی آتش فشانی سے تغافل برت کر شرمندہ کرنا چاہتا ہے؟ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہفتہ عشرہ میں "ہندوستان چھوڑ دو" بے اثر ہو گیا۔ ہر شخص نے اسے ہر جگہ پر بارہا دیکھا۔ اب تو امریکی سپاہیوں کا ایک پر لطف مشغلہ سا ہو گیا کہ فرصت کے وقت کھریا کا ایک ذرا سا ٹکڑا لے کر (کوئٹ انڈیا) کی بجائے کوئٹ انڈیا نا پولس لکھ دیں۔ برطانوی سپاہی بھی اس نعرہ میں مختلف تبدیلیاں کرتے تھے، مگر وہ اس قدر ناشائستہ تھیں کہ انہیں دھرایا نہیں جا سکتا۔

۳

صدمہ نمبر (۳) تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اس وقت ہوا جب کہ ہم شہر نئی دہلی کا ایک سرسری چکر لگا کر وائسرائے ہاؤس کے قریب پہنچ رہے تھے۔

یہ صدمہ سلبی قسم کا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی جمال کو روکتا ہوا پایا اور فوراً مجھے محسوس ہوا کہ میں بری طرح تھک گیا ہوں۔

یہ کس قدر انمل بے جوڑ ہے۔ یہ سارے نامانوس مناظر اور آوازیں

عورتوں کی سفید، دیہین ساڑیاں، کوؤں کی کائیں کائیں، چیلوں کی کرکراہٹ ...... یہ سارے خوبصورت پھول سرخ کروٹین کی یہ باترتیب کیاریاں زینا کے چار چار فیٹ بلند تختے، یہ ہالی دوڑ جیسا ہجوم، سیکڑوں چھوٹے چھوٹے سیاہ وں کا چبوتروں پر برہنہ حالت میں پھیلا ہونا۔ یہ لڑکیوں کا طویل سلسلہ جن کے سروں میں سب کچھ موجود ہے بجز باورچی خانہ اور چولہا کے .... ہندوستان کے اولین شہر میں کوئی شخص کس طرح تکان محسوس کر سکتا ہے؟

موٹر کار کی کھڑکی سے ایک نظر پس پشت ڈالتے ہوئے میں نے اس سوال کا جواب معلوم کر لیا۔ اس وقت ہماری موٹر وائسرائے کی خصوصی سڑک کی بلندیوں میں چڑھ رہی تھی اور یہ پہلی بار ممکن ہو سکا تھا کہ پوری نئی دہلی پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔ نئی دہلی کا شہر بالکل نو تعمیر، وسیع کشادہ، دور تک ایک قسم کے شرقی واشنگٹن کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ شہر کا رنگ سفید کی بجائے سرخی مائل بادامی ہے۔ یہ بہت اثر انداز نہایت قابل تعریف اور اتنا ہی ہندوستانی شہر ہے جتنا شیفرڈ کی جھاڑیاں ہندوستانی ہو سکتی ہیں۔

یہ تھی وجہ جس نے مجھ پر ہندوستان کے دارالسلطنت کو دیکھتے ہی تکان طاری کر دیا ــــــ مذکورہ ہجوم کے باوجود جسے اس شہر نے جگہ دے رکھی ہے اور جن کی یہ بستی ہے، حقیقتاً یہ شہر بالکل غیر ہندوستانی شہر ہے۔ یہ سنسان ہے۔ یہ شہر کبھی بسا ہی نہیں، اس میں اتنی بھی زندگی نہیں دکھائی دیتی جتنی اس کے گرد پھیلی، خاک اڑتی ہوئی اور بھوتوں کی آماجگاہ سات ویران دہلیوں میں پائی جاتی ہے۔ وہاں کم از کم جو بھوت پریت ہیں ان کا تعلق تو ہندوستان ہی سے ہے۔

نئی دہلی ایک برطانوی دایہ ہے جو انتہائی کرب کے ساتھ دیسی بولی

بولنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن اس کا لہجہ اور تلفظ جنوبی کینسنگٹن کا باقی رہ جاتا ہے۔ سر ایڈون لیوٹنس نے جو نئی دہلی کی تعمیر کے بڑی حد تک ذمہ دار تھے، سب کو خوش کرنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ہندوانہ بیل پایوں کا رُخ، مسلمانوں کے گنبد، اور سیر اسینی کمانوں کو ایسی تزئین سے جوڑ دیا ہے جو ہو سلا مندر سے ماخوذ ہے، گویا اس طرح انھوں نے نعرہ لگایا ہے کہ دیکھو ہم کس قدر غیر جانب دار ہیں۔ یہ کوشش یہاں ختم ہوئی کہ وہ کسی ایک کو بھی خوش نہ کر سکے۔ اور نتیجۃً یہ ایک قسم کی تعمیری اسپرنٹو[1] بن کر رہ گئی۔ اسپرنٹو ایک ایسی زبان ہے جس میں نہ کوئی اظہار رنجبت کر سکتا ہے نہ پیا ہی گنگنا سکتا ہے اور نہ کوئی سوچنے والا بڑے بڑے خواب دیکھ سکتا ہے۔

کلکتہ کی جدید ستعمراتی عمارتوں یا اندرون ہند کی پرانی ریزیڈنسیوں کی طرح وسیع برآمدوں اور سفید ستونوں کے ساتھ اگر نئی دہلی کی تعمیر بھی خالص برطانوی طرز کی ہوتی تو شہر اس سے کہیں خوش آئند ہوتا۔ اور ہم کہہ سکتے کہ تم پسند کرو نہ کرو، ہم بہرحال یہاں موجود ہیں ہمیں ذرہ بھر اپنی حیثیت پر ندامت و شرم نہیں ہے۔ ہم تاریخ انسانی میں ایک ایسے باب کو پیش کر رہے ہیں جسے ہم نے خود ہی لکھا ہے، اور ہمیں اس کی کوئی خواہش نہیں کہ یہ باب پھر سے دوبارہ لکھا جائے۔

لیکن نئی دہلی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ایسی نہیں ہے یہ وہ بچہ ہے جو مصالحت اور سمجھوتہ کی پیداوار ہے اور نتیجۃً وہ جیتا جاگتا وجود ہی میں نہ آسکا۔ اسی وجہ سے نئی دہلی میں یہ ایک نہایت ہی غیر معمولی بات نظر آتی ہے کہ جنگ کی اس ہما ہمی کے باوجود شہر ویسا ہی ایک تعمیری نقشہ ہے۔

---

[1] ایک فرضی زبان کا نام ہے جو ساری دنیا کے لئے بنائی گئی تھی اور کہیں نہ چلی (مترجم)

جیسا کہ تھا۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا شہر بالشتیوں کا شہر ہے اس کی دیواریں دفتی کی بنی ہوئی ہیں جن پر سرخی مائل بھورا رنگ چڑھا دیا گیا ہے۔ سپاہی مصنوعی معلوم ہوتے ہیں جن میں مشینی حرکت ہے۔ اس شہر کا آسمان کانچ کے بڑے مرتبان کا ڈھکن معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ ایک اٹل بات نہیں کہ کسی منٹ کوئی دیوتا آئے، ڈھکن کو اٹھائے اور بالشتیوں کے پورے تماشے کو سمیت کر اعراف میں پہنچا دے۔

نئی دہلی میں برطانیہ سے یہ کہنا کہ "یہاں سے نکل جاؤ" فضول سی بات ہے۔ برطانیہ تو وہاں کبھی پہنچا ہی نہ تھا۔

۳

صدمہ نمبر (۳) بہت سے چھوٹے چھوٹے صدمات کا مرکب تھا۔ یہ صدمات اس ماحول کی پیداوار تھے جو تمام تر دیوتائی انداز کا تھا۔ وائسرائے سے میری ملاقات کے ابتدائی تاثرات کا عنوان "بڑا وسیع" اور "دیو ہیکل" ہی ہو سکتا ہے میری خوابگاہ سے اے۔ ڈی سی کے کمرہ تک جہاں ہم سب کھانے سے پہلے جمع ہوئے تھے، بڑا وسیع فاصلہ تھا۔ اور اس پر شکوہ غلام گردش کا راستہ سارے کا سارا دیو ہیکل ملازموں کی ٹولیوں سے بھرا پڑا تھا جو ہر دس دس گز کے فاصلہ پر سفید لباس اور سنہری پٹیوں سے مزین تھے۔ جیسے ہی کوئی شخص غلام گردش کے سرے پر پہنچتا ملازموں کی پہلی ٹولی اپنے مونڈھوں سے چھتی کے ساتھ اٹھ کر سیدھی کھڑی ہو جاتی یہ لوگ اس وقت تک بالکل سامنے تاکتے رہتے جب تک کہ انسان ان کے پاس سے گزر نہ جاتا۔ ہر ٹولی میں سات یا آٹھ ملازمین تھے جب ایک ٹولی کے پاس سے انسان گزر جاتا تو وہ پھر بیٹھ جاتے اور

اس کے ساتھ اس سے آگے والی دوسری ٹولی کھڑی ہوجاتی، اسی طرح آخر تک ہوتا رہتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے والا ہی نہیں۔ یہ ایک بہت ہی عجیب منظر ہوتا کہ آدمی ان سفید و سنہرے لباس میں ملبوس دیوؤں کی مسلسل اُٹھ بیٹھ کے درمیان سے گزرے۔ مشرق کے اس پرستانی منظر میں شرکت یقیناً بہت ہی عجیب تھی۔ میں چند ایسی عورتوں کو جانتا ہوں (ان کا نام یوں سمجھو کہ کچھ نہ تھا) جو اسے پسند کرتی تھیں۔ وہ اس غلام گردش میں اس تصور کے ساتھ ٹہلتی تھیں کہ گویا وہ رومانیہ کی ملکہ ہیں۔ وہ اس شان و شکوہ سے بہت مسرور ہوتی تھیں۔ میرے لئے تو یہ سارا تزک و احتشام ندامت کا باعث تھا، بلکہ یہ ایک قسم کی عقوبت نفس تھی، میں اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتا کہ ملازمین چاہے وہ سفید فام ہوں یا سیاہ فام بہرحال آدمی ہی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ آفتاب کی روشنی میں بیٹھنا کسی آوارہ گرد مصنف کو سلام کرنے کے لئے غلام گردشوں میں گھس کر انتظار کرنے سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس کے ماسوا، یہاں ایک تصنع کا سوال بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کس قسم کا چہرہ بشرہ بنا دیتا ہے۔ میری حالت تو یہ ہوتی تھی کہ غلام گردش میں داخل ہوا اور ایک قسم کی نقلی نخوت اپنے اوپر طاری کرلی۔ کوئی سو گز جاتے جاتے یہ نخوت اختیار سے باہر ہوجاتی اور ایک قسم کے اعصابی تشنج کی شکل اختیار کرلیتی۔ ایک مرتبہ تو یہ ہوا کہ مجھے ایک بٹن کے ٹوٹ کر گر جانے کا شبہ ہوا لیکن اس خوف سے اس کی طرف توجہ کرنے کی جراءت نہ کرسکا کہ یہ ملازمین کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ آخر کار میں ایڈ۔ ڈی۔ سی کے کمرہ میں پہنچ گیا، لیکن وقت سے بہت پہلے کیونکہ یہ ڈر تو سب ہی کو لگا رہتا تھا کہ کہیں دیر نہ ہوجائے اور

واقعہ یہ ہے کہ سارے اعصاب پر ایک قسم کی غیر ارادی حرکت گھبراہٹ سے
طاری تھی۔ ذرا ٹہلتا ہوا چبوترہ پر چلا گیا کہ چمن کو دیکھ سکوں۔ چمن اسی طرح وسیع
اور عظیم الشان تھا جیسی یہاں کی ہر چیز ہے۔ بلکہ میری رائے میں تو وسیع ہی نہیں
بلکہ دہشت ناک بھی ہے۔ یہ ایسا چمن ہے جس سے مالیوں کے سوا ہر شخص پر
وجد طاری ہو سکتا ہے۔ چمن اس قدر باقاعدہ بنے ہوئے ہیں جیسے شطرنج کی
بساط۔ نامحدود بیضوی کیاریاں سرخ اینٹوں کے میدان میں مسلسل چلی گئی
ہیں۔ اور ہر کیاری میں خوبصورت پھول نباتات سے لگے ہوئے ہیں۔ طرح
طرح کے پھولوں کے تختے اس قدر کثرت سے ہیں کہ پودوں کا بھی دم گھٹ
رہا ہے۔ اس کا تو اقرار کرنا ہی پڑے گا کہ لیڈی لنلتھگو نے اس معمولی سے
کام کو بھی بہت ہی اچھی طرح انجام دیا ہے۔ انھوں نے شطرنج کی اس بساط
کو بڑی ہوشیاری سے سجایا ہے اور ایک طرح کا طوفان رنگ پیدا کر ہی دیا ہے
چمن کے کنارے پر ایک چھوٹی سی منقش بازی گاہ بنی ہوئی ہے جس کے وسط
میں ڈوباؤ تالاب ہے لیڈی صاحبہ نے یقیناً کسی قدر حقیقی حسن پیدا کر دیا ہے
لیکن اس پوری چمن بندی کا عام اثر یہ پڑتا ہے کہ دیکھنے والے پر حد درجہ کی
افسردگی چھا جاتی ہے۔ واہ رے سر ایڈون لوٹنس! جنھوں نے اس کا
نقشہ تیار کیا تھا۔ لوگوں نے ایک حقیقی باغبان پرانی ناہموار نباتاتی باڑھ کے
لئے بنا رکھا ہے، جس کے ایک کنارہ پر ایک سیب کا درخت اور دوسرے
کنارہ پر پانی کا چھوٹا سا حوض، بس اور وسط میں آسمان ہی آسمان۔
چمن عظیم الشان تھا، تیراکی تالاب بھی عظیم الشان، رقص کے کمرے
عظیم الشان تھے، حاضرین کا حال عظیم الشان تھا اور سب سے زیادہ عظیم الشان
خود وائسرائے اور وائسرائن تھیں۔ مجمع میں ان کے سر اور شانے سب سے

اونچے رہتے تھے۔ رہی ذہنی صلاحیت تو یہ اُن کے قدو قامت سے کچھ غیر مطابق نہ تھی۔

۵

دی ایکسلنسیز تشریف لاتے ہیں!

تم انھیں دور ہی سے تشریف لاتے ہوئے دیکھ سکتے ہو۔ کمرہ درکمرہ کے ایک سلسلہ میں سے ہو کر وہ آہستہ آہستہ آ رہے ہیں۔ ان کے آگے آگے ایک ایڈ۔ ڈی سی چل رہا ہے، جب تک وایسرائے اپنے عہدہ پر ہیں ہمیشہ ایک ایڈ ڈی سی اُن کے آگے آگے چلتا ہے۔ ایک بڑی ہی بے تکلف ویسرائن نے مجھ سے کہا کہ چند سال تک اس طرح ایڈ ڈی سی کی پابندی کے بعد میں تو یہ محسوس کرنے لگی ہوں کہ میرے لئے اس وقت تک حمام میں بھی داخل ہونا ممکن نہیں جب تک کہ مجھ سے پہلے ایک ایڈ ڈی سی کود کر حمام کے اندر نہ جا پہنچے۔

مہمان ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی وایسرائے اور وایسرائن سامنے آتی ہیں عورتیں تعظیم بجا لاتی ہیں۔ اور مرد اپنے پنجوں پر ہو کر سر جھکاتے ہیں۔ دونوں گزرتے چلے گئے۔ ہم جیسے ہی کھانے کے کمرہ میں داخل ہوئے ہم نے دیوہیکل ملازمین کی ایک جدید ٹولی کو دیکھا یہ ایک ایک ہر کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔ یہ لوگ شاگرد پیشوں کی شاہانہ وردی میں ملبوس تھے۔ ان ملازموں نے اپنے سفید دستانوں سے اک ذری دیر کے لئے اپنے چہروں کو چھپایا، اس اثنا ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

یہ سارے طور طریقے لارڈ لنلتھگو کے عہد میں تھے۔ لارڈ ویول کے دور میں بھی مجھے وایسرائے کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے انھوں نے

ان قواعد و رسوم میں کسی قدر کمی کر دی ہے۔ غالباً اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں زمانوں میں کھانے بڑی حد تک سادہ تھے۔ ان دعوتوں سے اگر مقابلہ کیجئے جو راجگان ہند یا بڑے بڑے ہندوستانی تجار دیتے ہیں تو وایسرائے کی میز کے یہ کھانے بالکل دال دلیا ہی تھے۔

وایسرائے کی معاشرت بھی بڑی سادہ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ کاموں کا ایک انبار ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ لارڈ لنلتھگو دن رات میں فرصت کے صرف بیس منٹ رات کے کھانے کے بعد پاتے تھے۔ اس وقت میں وہ ایک آرام کرسی پر لیٹ جاتے اور اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر خبریں سنا کرتے تھے جیسے ہی خبریں ختم ہوتیں وہ کسی قدر تکان کے ساتھ مگر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ لوگ تعظیم بجالاتے اور سلام ہوتا۔ پھر وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں غایب ہو جاتے۔ مطالعہ کے کمرہ میں ایک سبز لیمپ میز پر رکھا رہتا تھا اور پاس ہی کاغذات کا ایک انبار رہوتا۔ یہ لیمپ آدھی رات کے بعد بھی بہت دیر تک جلتا رہتا تھا۔

وہ شہنشاہیت برطانیہ کے کسی دوسرے ملازم سے زیادہ پر مشقت اور مشکل کام اپنے ذمہ رکھتے تھے۔ اور سات سال کی ملازمت کے ختم پر اپنا وہ سب کچھ قربان کر چکے تھے جو قربان کر سکتے تھے۔ ہندوستان سے انھیں گہری محبت ہے۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کو اوسط درجہ کے ایک ہندوستانی سے بھی زیادہ بہتر طریقہ پر جانتے ہیں۔ یہ لارڈ لنلتھگو کا قصور نہ تھا کہ ان کا عہد بڑی حد تک امکانات کے اختتام اور امتناعات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا۔ اور نہ وہ ساری امتناعات بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ۱۹۴۲ء میں جب کہ تاراج پھیل رہا تھا اگر لارڈ لنلتھگو اپنا آہنی پنجہ استعمال نہ کرتے تو کیا ہوتا؟ سارا ملک خاک و خون میں غلطاں نظر آتا اور مشرقی کنارا جاپانیوں کے قبضہ میں جا چکا ہوتا۔

مشکل ہی سے کسی نے لارڈ لنلتھگو کو آفرین کہا ہوگا۔ کانگریس نے انھیں قابل نفرین ٹھہرایا، صرف اس لئے کہ وہ ایک حقیقت پسند شخص تھا۔ اور اس نے اس طرح کی چرب زبانی دکھانا اچھا نہ سمجھا جو انگلینڈ کے اعتدال پسندوں کی نظر میں اسے محبوب و مقبول بنا دیتی۔ وائسرائے کی وہ مقبول عام تصویر جو اکثر ہمارے تفنن طبع کے لئے پیش کی جاتی ہے کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ طبقۂ امراء کا ایک نواب تخت طاؤس پر بیٹھا ہوا پھولوں کی پنکھی ہلا رہا ہے اور عامۃ الناس بھوکوں مر رہے ہیں۔

۶

اب ہم صدمہ نمبر (۴) پر پہنچ گئے۔

میں آدھی رات کو اپنے کمرہ میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ باہر گیدڑ غل مچا رہے تھے اور بالکل انسانی لہجہ میں آوازیں لگا رہے تھے۔ اگر کوئی فلم ساز ڈانٹے کی جہنم کا فلم بنانے لگے اور گم شدہ روحوں کی آواز تلاش کرے تو اس کے لئے بہتر ہوگا کہ گیدڑوں کی ایک ٹولی کرایہ پر لے لے یہ ساری رات پورے جوش و خروش کے ساتھ شور مچاتے رہتے ہیں۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ اپنی ڈائری درست کروں، یہ ایک پریشان کن گڈ مڈ حالت میں تھی، معلوم ہوتا تھا کہ دیوانے کی بڑ ہے جس کا اور نہ پتیا نہ ......

ٹیلیفون کے تاروں پر بیٹھے ہوئے سبز طوطے یہ نامعقول احساس نہیں پیدا کر سکتے کہ پنجروں سے نکل بھاگے ہیں ریلوے اسٹیشنوں پر موروں کے پروں کی پنکھیاں ...... مجھ سے ایک ہندوستانی نوجوان نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مور کو اس قدر خوبصورت دم اس لئے عطا کی ہے کہ اس سے مور کے بدنما پاؤں

پچھپے رہیں ..... پاؤں کے متعلق کچھ کہتے ہوئے یہ عادت نہیں ڈالی جاسکتی کہ
وبسرائے کے ملازموں کے پاؤں ننگے کر دیئے جائیں، اس کا ہمیشہ ڈر لگا رہے
گا کہ ان کے پاؤں تلے کوئی الپن آجائے اور نازک معاشرتی صورت حال پیدا
ہو جائے .... وہ مہاراجہ کون تھے جو آج رات کھانے پر تشریف لائے تھے
اور وہ سب واقعتہً سچے موتی تھے؟ بادشاہ سلامت کا جام صحت نوش کرنا بڑا اثر
انداز منظر تھا۔ لیمپ کی روشنی گلاسوں پر پڑ کر ان میں سے خوبصورت نقرئی کرنیں
پیدا کر رہی تھیں ....

پھول یقیناً بڑی نفیس چیز ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسکی
نفاست سے لطف اندوز ہونے کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے اس کا
کوئی تصور ہی نہیں رکھتا۔ میں اس کو کسی طرح پسند نہیں کر سکتا کہ کسی شخص کی گردن
میں پھولوں کا ایک طوق لٹکایا جائے۔ یہ چیز محض ناپسندیدہ ہے کہ پھول ڈوری
میں پڑ کر مرجھا جائیں ضرورت ہے کہ انھیں ڈوری سے نکال کر پانی میں رکھا
جائے ....

کیا میں توقع سے زیادہ جلد ہندی سیکھ رہا ہوں۔ میں نے چھالیہ بیچنے والی
عورت سے کافی دیر تک ہندی میں گفتگو کی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ہندی
میں آنے والے دن کو "کل" کہتے ہیں، جب دریافت کیا کہ اور گزشتہ دن کے
لئے کیا لفظ ہے تو اس نے بتایا کہ اسے بھی "کل" ہی کہتے ہیں ....
دونوں کی آوازیں ایک ہی سنکر آپ کو حیرت تو ہوگی مگر یہ واقعہ ہے کہ دونوں لفظ
بالکل ایک ہیں۔ غور کرو تو ممکن ہے کہ ان کے پیچھے گہرے نفسی معنی پنہاں ہوں
لیکن یہ بڑا ہی مشکل ہے کہ فوری طور پر تمیز کیا جاسکے۔
میں نے ان انمل بے جوڑ باتوں کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں اس شب

کو لکھیں مثلاً میں نے ایک بے لاگ صحافتی تبصرہ لکھا جس میں ویسرائے کے حالات
کی بعض نمایاں تفصیلات درج تھیں۔ یہ ایک معمولی قسم کا بیانیہ تبصرہ تھا جس میں
میرے خیال کے مطابق صرف اس قدر خوبی تھی کہ وہ پڑھنے میں آسان تھا اور
معقول ترتیب کے ساتھ لکھا گیا تھا۔

یہ مضمون صدمہ نمبر (۴) کا سبب بن گیا۔ انگلستان میں شایع ہونے کے
بعد جب خبر رساں ایجنسیوں نے اسے واپس ہندوستان بھیجا ہے، تو ایک شور
مچ گیا۔ اخباروں کے سرورق پر اس کی مسخ شدہ صورتیں سنسنی خیز سرخیوں کے
ساتھ شایع ہوئیں۔ افتتاحیہ نویسوں نے زہریلی روشنائیوں میں اپنے قلموں
کو ڈبو کر اخباروں کے افتتاحیئے لکھے۔ مجھے بعد کو معلوم ہو سکا کہ ایک انتہائی
معتدل اور معمولی انداز کے تحلیلی بیان کا اس طرح خشک استقبال کیا گیا کسی
نے زیر لب ایک فرسودہ سی بات کہہ دی اور ایک دھماکہ پیدا ہو گیا۔ بہر حال اس
وقت شور و ہنگامہ بوکھلائے ہوئے تھا۔

اس سارے ہنگامہ کی وجہ کیا تھی؟ یہ وجہ میرے دو فقروں میں پوشیدہ
تھی، میں نے اس میں لکھا تھا کہ ویسرائے کی زندگی کا سارا تزک و احتشام بجا
اور مناسب ہے کیونکہ یہ سب کچھ ہندوستان کی گزشتہ تاریخ کے بالکل مطابق ہے
اگر اس سے سادہ انداز پر رہایش ہوگی تو وہ نہ صرف ناکافی ہوگی بلکہ فرضی و
مصنوعی بھی معلوم ہوگی۔ ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ برطانوی حکومت سے
پہلے ہندوستان میں بہر حال ایک مطلق العنان استبدادیت ہوا کرتی تھی۔
ہمیشہ سے ہندوستان ایک ایسی زمین رہی ہے جس میں چمکتے ہوئے محلات اور
ان کے گرد عوام کے گھروندوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہو، ہندوستان میں
طبقہ وسطیٰ کا کبھی وجود نہ تھا، اور ہندوستان کی خاک پر جمہوریت کی ہوا ہمارے

آنے سے پہلے کبھی چلی ہی نہ تھی ——— ہم اس ملک کو بدل رہے ہیں، اور ہر روز یہ تبدیلی مسلسل عظیم پیمانہ پر ہو رہی ہے، کچھ دلوں میں انتہائی خیرہ چشم قوم پرست بھی یہ دعویٰ کر سکے گا کہ ہندوستان مجموعی طور پر ایک جدید العصر ملک ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں کچھ پیٹر اعظم کے عہد کی باتیں ہیں، کچھ ایلزبتھ کے عہد کی اور یہ کہتے ہوئے شرمانا نہ چاہیئے کہ کچھ قرون وسطیٰ کی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان مسلسل غلط تاریخوں کا ایک گلدستہ ہے۔

مضمون مذکورۂ بالا میں میرا دوسرا فقرہ تھا۔

"ویسرائے ہاؤس میں" وہائٹ ہاؤس کی سی سادگی پیدا کرنے کی کوشش ایک مضحکہ خیز نمائش ہوگی، ہندو اس پر ہنسیں گے، مسلمان اسے حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور والیان ریاست اسے ایک قسم کی جنونی حرکت سے تعبیر کریں گے۔"

یہ والیان ریاست کا حوالہ ہی تھا جس نے سب سے زیادہ جذبات پیدا کیے اور مجھے سب سے زیادہ ملزم ٹھہرایا صدر روزویلٹ کا لارڈ لنلتھگو سے مقابلہ کر کے اس طرح دکھایا گیا کہ صدر روزویلٹ ایک سادہ چوبی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور لارڈ لنلتھگو جواہر پوش خدم وحشم کے جھرمٹ میں ایک تخت پر جلوہ افروز ہیں۔ یہ ناقدین جس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ والیان ریاست کا وجود ہے، اور ہمیشہ سے ان کا وجود تھا۔ ان کا وجود ہی اس کے لئے کافی دلیل ہے کہ ویسرائے کی رہائش اسی طرح بلند معیار پر اور شان وشکوہ کے ساتھ ہو۔

اب ہم اس مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ہندوستانی ناقدین کی ایک بڑی جماعت نے لکھا ہے کہ والیان ریاست

کا کوئی وجود نہیں، یا اگر ہے تو صرف اس قدر کہ دولتمند کاہلوں کی ایک جماعت ہے جسے برطانوی حکومت نے اپنے غیر دیانتدارانہ مقاصد کی تکمیل کے لئے پیدا کیا ہے۔

یہ حقایق کے خلاف ایک ایسی غلط بیانی ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں، والیان ریاست ہیں! اور اتنی وسعت کے ساتھ ہیں کہ ہندوستان کے مجموعی رقبہ میں سے تقریباً چالیس فی صد رقبہ پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ انکی رعایا، کی تعداد آٹھ کروڑ سے کم نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ان کی ریاستیں جو تعداد میں پانچ سو سے بھی زیادہ ہیں تاریخ کے تاروں میں اس استحکام کے ساتھ منسلک ہیں کہ اگر ان کو توڑ کر الگ پھینک دینے کی کوشش کی گئی تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا بعض ریاستیں یقیناً بہت چھوٹی ہیں اور ہندوستانی چادر پر سنہرے چھاپ کی طرح سے چمک رہی ہیں لیکن ان میں سے بعض تو اتنی بڑی ہیں جتنا ملک فرانس ــــــ ان پر والیان ریاست وسیع اختیارات اور دلفریب امیدوں کے ساتھ حکمرانی کر رہے ہیں۔ ان میں کوئی موہوم خیال بھی اس کا نہیں پایا جاتا کہ وہ تا دم مرگ مقابلہ کئے بغیر حکمرانی سے الگ ہو جائیں گے۔

بہت سے لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ گاندھی جی والیان ریاست کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اگر یہ لوگ کتاب گاندھی ازم، نیشنل ازم، سوشل ازم مصنفہ ایم۔ این، رائے شائع کردہ بنگال ریڈیکل کلب کا صفحہ ۲۱ الٹ کر دیکھیں تو ان کو گاندھی جی کے ایک ملاقات کا حال ملے گا جس میں گاندھی جی نے اپنے اس حتمی ارادہ کا اعلان کیا ہے کہ اگر والیان ریاست اور زمینداروں کو ان کی املاک اور جائیدادوں سے قوت کے ذریعہ محروم کرنے کی کوئی سعی کی گئی تو گاندہی جی

اپنی پوری قوت کے ساتھ زمینداروں اور والیان ریاست کی حمایت کریں گے۔
ہم پر اعتراض کرنے والے اس طرح اعتراض کرتے ہیں، جیسے ہم نے ہی
توان مخصوص قسم کے اشخاص کو وجود بخشا ہے، ہم نے ہی ان پہ حیرت انگیز جواہرات
کا بوجھ لادا ہے۔ ہم نے ہی ان کے محلات میں پٹ رانیاں جمع کر دی ہیں۔ اور
جیسے ہم نے ہی ان کے ہاتھیوں کو زرتار جھولوں سے مزین کر دیا ہے۔ ہم نے
یہ سب کچھ نہیں کیا ہے۔ ہم نے ہندوستان آکر ان سب کو اسی طرح کرتے دھرتے
پایا جیسے یہ سب کچھ صدیوں سے ہوتا چلا آرہا تھا۔ جب اہل برطانیہ منظر ہندوستان
پر نمودار ہوئے تو ریاستوں کا یہ سوانگ پہلے ہی سے پوری شان کے ساتھ یہاں
بھرا جا رہا تھا۔

مانا کہ ہم نے بھی اس اسٹیج کا کچھ برمحل انتظام کیا لیکن یہ ہمیشہ اس مقصد
کے ماتحت کیا گیا کہ اس تھیٹر کو زیادہ سے زیادہ حد تک عوامی تھیٹر بنا دیا جائے
اور حکمرانی اور حکمرداری کا مظاہرہ کم سے کم باقی رہ جائے۔ اگر کسی راجہ نے
اپنے پارٹ سے بڑھ کر کام کیا اور ہمسایہ کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تو ہم نے
اس کا پارٹ ختم کر دیا۔ جب کبھی کھیل زیادہ گھناؤنا ہو گیا جیسا کہ یہ بعض اوقات
ہو گیا ہے تو ہم سنسر کی خدمات انجام دینے لگے۔ تھیٹر کے نظم کو قائم رکھنے کے
لئے والیان ریاست کو ضبط و نظم میں رکھا۔ باقاعدگی اور معدلت کے کچھ اصول
مقرر کئے اور ان پر اصرار کیا کہ وہ ان کے مطابق عمل کریں، ہم نے خواہش کی کہ وہ
اپنے حدود میں رہیں اور دوسروں کے حدود میں دخل اندازی سے احتراز کریں
ان حدود کے پابند ہو کر وہ اپنے قدیم اختیارات کے ساتھ اب بھی مستحکم ہیں، اب
بھی بڑے بڑے وسیع حدود اور بڑی کثیر آبادیوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اکثر صورت
میں تو یہ لوگ بہت عمدگی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں۔

ہمارے معترضین اس کے بعد بھی یہ کہیں کہ برطانوی ویسرائے کے لئے
جوان زرپوش شخصیتوں پر حاکم اعلیٰ ہے یہی مناسب ہوگا کہ ایک مختصر سے جھونپڑے
میں رہا کرے تو ہم ان سے یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ عقل کی بات نہیں کہہ رہے
ہیں۔ یہ توقع کہ ــــــ دنیا کے سب سے بڑے دولتمند انسان کو کسی تنگ و
تاریک کمرہ میں ایک کڑکڑاتی ہوئی باورچن بلاکر تشریف رکھنے کو کہے گی، درحقیقت
دماغ میں جمالیاتی تناسب کی کمی کا نتیجہ ہے۔ اور یقیناً یہ خیال غیر ہندوستانی
بھی ہے۔

بہرحال، یہ دلائل معمول سے زیادہ طویل ہوگئے اگر اس کے بعد بھی ناظرین
ہم سے موافقت نہیں کرتے تو ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہمیں ان سے اس بارےمیں
اختلاف ہے۔ اُن کی تشفی کے لئے روشنی گل کرنے سے پہلے ہم کل کی مصروفیتوں
کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ کل کی ملاقاتوں میں ڈاکٹر ابیڈکر کا نام بھی ہے۔
اِن ساری شان و شوکت کے بعد ڈاکٹر ابیڈکر غالباً ایک بدلا ہوا
موضوع ثابت ہوں گے ۔

تیسرا باب

پستی کی اِنتہا

تقریباً پچاس سالہ ایک شخص اپنے مکان کے برآمدہ میں بید کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا میرا اِنتظار کر رہا ہے۔ یہ شخص فربہ اندام، جوشیلا، اور بڑی دلربا عادات کا آدمی ہے۔ لیکن مزاج عصبی ہے اور جھکا ہوا اپنے جوتے کے فیتہ سے کھیل رہا ہے۔ ایسا چوکنا معلوم ہوتا ہے جیسے پہرہ پر کھڑا ہو، ہر طرف سے آنے والے تیروں کو روکنے کے لئے تیار ہے۔ خیر! یہ تنہا وہ شخص ہے جس سے کوئی امید کی جا سکتی ہے ....

میری ڈائری کی تلخیص اِس طرح شروع ہوتی ہے۔

یہ شخص ڈاکٹر امبیڈکر ہے۔ اور ابھی ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیوں تنہا ہی ایک شخص ہے جس سے امید کی جا سکتی ہے۔ امبیڈکر حکومت ہند کا وزیر عمال، اور ہندوستان کے چھ بہترین دماغوں میں سے ایک ہے یہ قائدین کے کاوری مکتب کا آدمی ہے۔ اور پکا حقیقت پسند ہے۔ یہ جب عوام میں تقریر کرتا ہے تو محرکانہ تخلیقی اور حیرت انگیز حد تک نفس موضوع پر مرکوز تقریر ہوتی ہے۔ عام طور پر کانگریسی سیاست کاروں کی تقاریر کا ڈاکٹر امبیڈکر کی تقریروں سے مقابلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہندوبچن کا پستول چلانے کی آواز سے مقابلہ کیا جائے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر امبیڈکر آج ہندوستان میں سب سے بہت "مردود شخصیت" ہے اور کیوں وہ تنہا شخص ہے جس سے امید کی جا سکتی ہے؟ ..... یہ عصباتی مزاج، اور یہ انداز کہ وہ ہر وقت حملے کے لئے تیار رہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر اٹھارہ کروڑ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی نظر میں اچھوت ہے ایک ایسا شخص ہے جس کا نفیس ریفر ڈینر جاکٹ اگر کسی ہندو کی دھوتی سے چھو جائے تو وہ ہندو نجس ہو جائے گا۔ ایک ایسی مخلوق ہے جس کی چھوت سے ایک پکے مذہبی شخص کو اس طرح بھاگنا چاہیئے جیسے جذامی سے یا کالی بلا سے جس کا ادنیٰ مس ہندوؤں کو مجبور کرتا ہے کہ جلدی سے قریب ترین گھاٹ پر جا کر غوطہ لگائیں، اور اپنے بدن کو دھوئیں۔ صابن لگائیں اور دعا کریں دعا کریں اور صابن لگائیں، صابن لگائیں اور دعا کریں۔ تاکہ نجاست اور ناپاکی ڈاکٹر امبیڈکر (ایم۔ اے لندن) کی لعنت ڈاکٹر امبیڈکر (کولمبیا یونیورسٹی) کے اعلیٰ اعزازات رکھنے والے) کی، طاعون اور وبا ڈاکٹر امبیڈکر (ہیڈل برگ میں خصوصی امتیاز حاصل کرنے والے) کی، ان پاک پوتر اور زندہ جاوید روحوں سے ہمیشہ کے لئے دھل کر صاف ہو جائے۔

ہم کوئی ماضی کا تذکرہ نہیں کر رہے ہیں، یہ واقعہ ۱۹۴۴ء کا ہے۔ یہ کوئی خرافاتی افسانہ، پریوں کی کہانی یا جپسیوں کے گیت نہیں ہیں، یہ تازہ ترین خبریں ہیں جو اخبار مرتب ہونے کے آخر میں ملی ہیں۔

اچھوت پن، انسان کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کا تاریخ میں سب سے بدترین نمونہ آج بھی ہندو نظام معاشرت میں پورے استحکام کے ساتھ موجود ہے۔ تقریباً ہر وہ کوشش جو اسے ختم کرنے کے لئے کی گئی ناکام رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ پچھلے پچاس سال کے عرصہ میں اس میں دس فیصد

کی کمی ہوگئی ہے تو یہ اندازہ بھی مبالغہ آمیز ہوگا۔ انگلستان اور امریکہ میں بہت سے لوگ گاندھی جی کے پروپیگنڈا سے دھوکا کھا کر یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ مرض (اور ہم اسے کس لفظ سے تعبیر کریں؟) کم ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس طریقہ کی ناپسندیدگی کا ہمہ تمائی اعلان اپنی پسندیدگی کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہے انھوں نے وہ تصویر بھی دیکھی ہے جس میں گاندھی جی ایک اچھوت کے گلے میں باہیں ڈالے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور انھیں معلوم ہے کہ گاندھی جی نے اپنے اس اخبار میں جو ملک کے اعلیٰ اور با اختیار لوگوں میں جاتا ہے' اچھوتوں کو "ہریجن" کا لقب عطا فرمایا ہے۔ لوگ یقیناً اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ اس روشن زمانہ میں اتنا زبردست نمونہ اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ جہاں تک گاندھی جی کے اچھوتوں کا دوست ہونے کا تعلق ہے' ہم ذرا ڈاکٹر امبیڈکر سے بھی سن لیں ڈاکٹر صاحب اچھوتوں کے ایسے لیڈر ہیں جن کا کوئی مدمقابل نہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

> "اچھوتوں کا گاندھی سے بڑا دشمن ہندوستان میں کبھی پیدا نہیں ہوا"

اس الزام کو پوری طرح سمجھنے کے لئے جدید تاریخ کا کسی قدر علم ضروری ہے۔ لیکن پہلے ذرا ہم اچھوت پن کے نظریہ سے متعلق اپنی یاد تازہ کرلیں اور چند واقعات سے اس نظریہ کی وضاحت ہوجائے تو بہتر ہے۔

---

[1] یعنی خدا کے بچے" یہ لفظ اچھوتوں کے لئے چل پڑا ہے۔ سرکاری لفظ اچھوتوں کے لئے "اقوام مندرجہ فہرست" ہے۔

۲

میکالے اسکول کا لڑکا بھی آپ کو بتا دے گا کہ ہندو مذہب میں چار ورن ہوتے ہیں۔

سب سے اول برہمن، یہ خاندانی مقدس اشخاص ہوتے ہیں، البتہ ان کے ساتھ کوئی کلیسا نہیں ہے۔ طوفانی اور ذہین نہرو جس کی خود نوشت سوانحعمری بحراوقیانوس کے دونوں کناروں پر عمدہ مال تجارت رہی ہے، ایک برہمن ہے، اور عقل کی بات یہی ہے کہ ان کے برہمن ہونے کو کبھی فراموش نہ کیجئے۔ ان کا ہارو اور کیمبرج میں تعلیم پانا ان کے وزن میں اتنا اضافہ نہیں کرتا جتنا کہ ان کا برہمن ہونا ان کے وزن کو بڑھاتا ہے۔

سی۔ آر۔ راجگوپال آچاریہ کانگریس کے سابق وزیراعظم بھی جو برطانیہ و کانگریسی انتہا پسندوں کے مابین اہم ترین رابطہ ہیں۔ برہمن ہیں، اسی طرح انتہا پسند ہندوؤں کے لیڈر پنڈت مالویہ اور کانگریس کے اکثر بڑے لوگ برہمن ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں برہمنوں نے وہی کام کیا ہے جو برطانیہ میں قایم ایٹونین نے کیا تھا فرق یہ ہے کہ برہمنوں کے ساتھ منظم عمال نہیں ہیں جو ان کو نظم و ضبط میں رکھ سکیں۔ برہمن جہاں تک نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں بڑی حد تک ان کو اپنی آقائی اور حاکمانہ شان ہی نظر آتی ہے۔ البتہ جب وہ پیچھے پھر کر مسلمانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں ان کو اپنی یہ شان نظر نہیں آتی [1]

---

[1] برہمن اپنے شاندار موقف کے باوجود ہندوستان کی تاریخ میں بہت

باقی تین ورن چھتری یعنی جنگجو، ویش یعنی تجار (گاندھی جی ویش ہیں) اور شدر یعنی زراعت پیشہ اور ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔

باہر اندھیرے میں ایک طرف کنارے کھڑے ہوئے مگر دماغ میں کھٹکتے ہوئے چاروں ورن سے باہر کچھ اور لوگ بھی ہیں، یہ ہیں اچھوت، ان کی تعداد چھ کروڑ ہے۔

مندرجہ بالا تقسیم بالکل سیدھی اور انتہائی مختصر ہے ورنہ حقیقتاً دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) ذاتیں ہندوؤں میں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں خاص امتناعات اور معاشرتی پابندیاں ہیں۔ اور زندگی کے آسان طریقہ کو الجھا کر مشکل بنا دینے کے لئے ہر ایک نے طرح طرح کی حیرت انگیز جدتیں پیدا کر لی ہیں۔

N اس ذات در ذات نے ہندو معاشرہ کو ایک پھٹی ہوئی تار تار چادر بنا دیا ہے جس میں کسی طرح کا ربط اور یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ صرف ایک چیز "خوف" ہے جس نے ان سب کو ملا رکھا ہے۔ خوف، آپس میں ایک کو دوسرے کا، خوف مسلمانوں کا، خوف برطانوی قانون کا ــــــ بار بار، اور بہ تاکید ہم اس چیز کو واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ ذاتیں جدید زمانہ میں آج بھی موجود ہیں۔ یہ قصہ کوئی پرانا تاریخی قصہ نہیں ہے۔

ایک چھوٹا سا گھریلو واقعہ بعض مرتبہ کسی مسئلہ کو اعداد و شمار کے طویل سلسلہ سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کر دیتا ہے۔ آیئے، میں آپ کو

حاشیہ صفحہ (۴۸) زیادہ بہرہ لعزیزی حاصل نہ کر سکے اور یہ پرانی مثل ابتک موجود ہے کہ "اگر تمہیں ایک سانپ اور ایک برہمن دونوں ملیں تو پہلے برہمن کو مارو۔" شاید اس کی وجہ ان کے بیہودہ اور بعید از عقل دعاوی ہوں، مثلاً دھرم شاستر کے مصنف منوجی نے قانون بنایا ہے کہ برہمن اگر مرتکب جرم بھی ہو تب بھی اس کو ملزم قرار دینا گناہ ہے۔

ایک واقعہ سناؤں :-

ابھی بہت دن نہیں ہوئے کہ میں ایک بالاخانہ پر مقیم تھا۔ میرے ہاتھ سے آیوڈین کی ایک شیشی فرش پر گر پڑی، کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جس سے میں فرش پر پڑے ہوئے داغ کو پونچھ کر صاف کر دیتا۔ اس لئے ملازم کو آواز دی کہ مہربانی کر کے وہ ایک چیتھڑا لائے اور داغ کو مٹا دے۔ اس مقام پر پانچ ملازمین تھے، لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بہ ظاہر میری درخواست معقول تھی مگر پوری نہیں کی گئی ملازمین یکے بعد دیگرے آئے، داغ پر غور کرنے کے بعد تیکھی نظر ڈالتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور میں خود باورچی خانہ میں جاکر ایک چیتھڑا اٹھا لایا، میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے داغ کو پونچھ کر صاف کر دیا، اور جب چیتھڑا انھیں واپس دینے لگا تو سوال کیا۔ تم سب کے سب کو کیا ہوگیا ہے؟ انھوں نے بیان کیا کہ ڈیدو (جاروب کش اچھوت) کھانا کھانے باہر گیا ہوا ہے اور صرف وہی داغ کو پونچھ سکتا ہے اگر یہ لوگ خود یہ کام انجام دیتے تو ان کی ذات گھٹ جاتی، اور جب ڈیدو یہ سن لیتا کہ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے داغ صاف کیا ہے تو اس کی نظر میں ان کی عزت خاک باقی نہ رہتی۔

خدا جانتا ہے کہ یہ واقعہ جو محض خفیف سا ایک واقعہ معلوم ہوتا ہے جب آپ اسے کروڑوں پر ضرب دے کر دیکھیں گے تو یہ خفیف نہ رہے گا۔ بلکہ یہ ایک بہت بڑا سوال بن جائے گا نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری جمہوریت پسند دنیا کے لئے۔

۳

اب ذرا بہت ہی اختصار کے ساتھ اچھوتوں کی زندگی کا مطالعہ کریں۔

یہ بڑی حد تک سلبیات کا مجموعہ ہے۔

وہ عام کنویں سے پانی نہیں لے سکتے، ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر ایسی گندہ اور بابع چیز پینے پر مجبور ہیں جو انھیں میسر آسکے۔

ان کے بچے اسکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے، وہ باہر بیٹھنے پر مجبور ہیں چاہے موسم کوئی سا ہو حتیٰ کہ برسات میں بھی۔ وہ کسی اشنان گھاٹ کے قریب ہرگز نہ جائیں، کیونکہ وہ پیدائشی اور تسلیم شدہ نجس ہیں (حالانکہ اس گندگی میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں)

مندروں کے دروازے ان پر بند ہیں۔ یہ ان پر سب سے زیادہ بےرحمی کی ضرب ہے، اگر تم ایسے لوگوں سے جو اس قدر محرومیوں میں غرق ہوں، ان کا مذہب بھی چھین لو تو گویا تم نے ان سے آخری وجہ تسلی بھی چھین لی۔ یہ تسلیم! کہ پچھلے چند سال میں روشن دماغ حکمرانوں اور رہنماؤں کی طرف سے ایک یا دو ڈرامائی مہم چلائی گئی جس نے ہر آنے والے کے لئے مندر کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ جیسے ہی اچھوت اندر داخل ہوئے کٹر بہمنی ہندو فوراً باہر چلے آئے۔ مندر اچھوتوں کا مندر ہوگیا۔ آلودہ ہوگیا غیر مقدس ہوگیا اور خود اچھوتوں کی نظر میں بھی تعظیم کا مقام باقی نہیں رہا۔[1]

اچھوتوں پر جو پابندیاں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حجام اُن کی حجامت

---

[1] اس ذہنیت کی بہترین مثال مدورا کے بڑے مندر کا واقعہ ہے کہ یہ مدراس سے تین سو میل پر واقع ہے، راجگوپال آچاریہ وزیر اعظم مدراس زحمت سفر برداشت کر کے وہاں پہنچے اور ایک سرکاری عہدہ دار کو حکم دیا کہ اچھوتوں کو لے کر مندر میں جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس دن سے برہمنوں نے پھر کبھی اس مندر میں قدم نہیں رکھا۔

نہیں بنا سکتا اور دھوبی ان کے کپڑے نہیں دھو سکتا۔

ہاں! ایک اچھوت یہ ضرور کر سکتا ہے کہ زمین دوز پاخانوں میں گھسے اور رات کی غلاظتوں کو اٹھا کر گاؤں سے لے جائے، یہ کام وہ بڑے بڑے بید کے ٹوکروں میں کرتے ہیں۔ اور ٹوکروں کو سروں پر اٹھا کر لے جاتے ہیں، ٹوکرے ٹپکتے ہیں، اچھوت مردوں اور عورتوں کی شکلیں جب وہ یہ فریضہ انجام دے چکتے ہیں، کیا بن جاتی ہیں، قابل بیان نہیں۔

اس پر بھی ہندو کہا کرتے ہیں۔ کہ اچھوتوں کی یہ حالت خود ان ہی کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ وہ پچھلے جنم میں کئے ہوئے اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان پر ترس کھائیں۔ یہ ایک راحت رساں عقیدہ ہے، بشرطیکہ تم اتفاقاً دائیں جانب والی خوابگاہ میں پیدا ہوئے ہو۔

تم کہہ سکتے ہو کہ اوہ! یہ بڑی پرانی لغویات ہیں۔

ہم جواب دیں گے، بلاشبہ یہ ایسی ہی ہیں۔ لیکن نہایت جدید بھی ہیں یہ اتنی قدیم ہیں جیسے پہاڑیاں اور اتنی جدید ہیں جیسے شبنم سحر۔ یہ قبل مسیح کے بہت ہی پرانے دور کی بات بھی ہے اور ۱۹۴۴ء بعد مسیح کی بھی۔

شخصی تجربات سے چند مثالیں اور سنیئے، اگرچہ یہ بہت معمولی سی باتیں ہیں لیکن ان سے ہمیں اس حقیقت کے سمجھنے میں مدد ملے گی کہ ان چھ کروڑ انسانوں کو ابتدائی حقوق انسانیت کے حصول کے واسطے بھی کس قدر مشکل جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ جد و جہد اس وقت بھی جب کہ آپ یہ سطور پڑھ رہے ہیں، جاری ہے۔

۴

منظر (۱) مغربی کنارہ سے چند میل پر سمندر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے

اور جزیرہ میں ایک بنگلہ۔ ہم ابھی ابھی اس بنگلہ کے برآمدہ میں کھانے سے فارغ
ہوکر بیٹھے ہیں ایک برطانوی افسر مینوشی میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔
وہ ساحل کی پہاڑی پر سے آیا ہے جہاں نوجوان ہندوستانی انجینئروں کی ٹریننگ
کا انچارج ہے وہ تھکا ماندہ نظر آرہا ہے۔

کیا آج کا دن بڑی مشقت میں گزرا؟

اس نے اپنے آپ کو کرسی پر ڈالتے ہوئے کہا: بڑی مشکل ہے، ریکروٹنگ
کا مسئلہ بڑا مشکل ہے؟ کیا کافی تعداد میں لوگ شرکت کے لئے نہیں آتے؟

نہیں! آتے تو ہیں، اور کافی آتے ہیں لیکن ہم انھیں واپس کر دیتے ہیں
ذرا ادھر دیکھو!

اس نے اپنے کاندھے پر اپنا انگوٹھا کھٹکھٹایا۔ ہم نے دو ہندوستانی نوجوانوں
کو یوکالپٹس کے درخت کے سایہ میں زمین پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ صحت جسمانی
کے اعتبار سے ممتاز نوجوان تھے۔ جیسے وہ کسی مہم پسند جماعت ہی کے لئے پیدا
کئے گئے ہوں۔

ان بیچاروں کو دیکھا؟ اب تک جو لوگ میرے پاس آئے ہیں، یہ دو لوگ
ان میں سب سے بہتر ہیں، جسمانی صحت کے اعتبار سے بھی اور دماغی صلاحیت
کے اعتبار سے بھی۔ عام معیار سے یہ لوگ بلند ہیں۔ یہ لوگ میرے ساتھ شریک
ہونا چاہتے ہیں اور میں انھیں شریک کرنا بھی چاہتا ہوں، مگر نہیں کر سکتا، کیوں
ایسی کیا وجہ ہے؟

یہ اچھوت ہیں، ذات کے بھنگی۔

لیکن یہ ایک لچر سی وجہ ہے۔

ہاں یہ وجہ تو لچر ہی سی ہے، مگر یاد رکھو! یہ ہندوستان ہے۔ جیسے ہی

ان کو کام میں شریک دیکھیں گے ہمارے سارے آدمی او زار ڈال دیں گے۔
میں نے کہا:۔ لیکن یقیناً تم ان کے افسر ہونے کی حیثیت سے کچھ اختیار تو رکھتے ہی ہوگے؟

نہیں! اس قسم کے معاملات میں ہماری ایک نہیں چلتی۔ ان بیچاروں کے آنے کی افواہ سے ہی سارے دن شور و شغب مچا رکھا، بھاگ جانے کا ارادہ نافرمانی، گستاخی، سب کچھ ہوا، میں نے ان کو داخل کرنے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک دوسرا غدر ہندوستان میں پیدا کر دوں۔

اس نے اپنا گلاس فرو حلق کیا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اس نے کہا۔ بے وقوف اور مغفل۔ میں جانتا ہوں، اور سب سے بڑا موقع تو یہ تھا کہ ان بیچاروں میں سے ایک نے کہا" میں نے اس کا دل توڑ دیا"
میں نے اجب اس قسم کا کوئی آدمی چیخنے چلانے لگے تو بڑی عجیب بات ہوتی ہے۔ اس نے بے دلی کے ساتھ ایک، قہقہہ لگایا۔ ہوسکتا ہے کہ میں اس کا نشانۂ ملامت بنوں، ہوسکتا ہے کہ میں بزدل ہوں۔ اوہ! کوئی راہ اختیار کرو، مصیبت ہی مصیبت ہے۔

منظر (۲) جنوب مغرب کا ایک دور افتادہ گاؤں میں یہاں ایک مندر کو دیکھنے آیا تھا۔ اس مندر کے نہایت خوبصورت ہونے کی بڑی شہرت تھی یہ مہم ناکام رہی۔ یہ مندر فن تعمیر کے اعتبار سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ صرف اسلئے قابل ذکر ہے کہ اس کی بنیادوں پر لنگ (آلۂ تناسل) کی فحش شکلیں چاروں طرف کھدی ہوئی تھیں۔ اس منظر نے ایک امریکی خاتون پر تحسین آفریں اثر ڈالا یہ خاتون بھی میرے ساتھ مندر کے چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ اس اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کہ بدنمائی بھی حسن کی طرح دیکھنے والوں کی نظر کو اپنی جانب کھینچتی ہے، اس نے فیصلہ کیا کہ اس کو پوری تفصیل کے ساتھ دیکھے اس نے

مجھے بھی اس مندر کے گرد گھسیٹا اور اپنی چھتری کی نوک سے اس حد درجہ فحش مظاہرہ کو چھو چھو کر بتاتی رہی اور اسے محض جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ہم ایک ایسے منظر پر پہنچے جہاں ہر دو جنس اس طرح ایک دوسرے سے مخلوط تھے کہ اس پر "جنسی ورزش" کا لیبل ہونا چاہیئے۔ اس نے بغیر آنکھ جھپکائے اسے غور سے دیکھا اور ایک ادعا کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کیا کہ یہ "صریحاً جین اثر" ہے۔ میں نے تو اس سے پہلے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہے۔

ان فحاشیوں سے تھک کر میں تو پریشان تھا۔ اس خاتون نے بھی مہلت لی۔ گرمی بڑی شدید تھی وہ بیچاری مسلک فحش کاری کے بموجب اپنی غیر عادی دلیری سے تھک کر چور ہو رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ دیہات کو دیکھ لوں، اس لئے میں نے اس خاتون کو مندر کے سایہ میں بالکل تنہا ایک میمون پسند انبساطی منظر کے سامنے چھوڑ کر دیہات کی راہ لی۔

میں کچی مٹی کے بنے ہوئے ایک بڑے مکان کے پاس پہنچا، یہ دیہاتی اسکول ہے میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، تقریباً ایک سو کمسن لڑکے فرش پر پالتی مارے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک تختۂ سیاہ کو دیکھ رہے تھے جس پر ایک لمبا جوان شخص کنڈی حروف تہجی لکھ رہا تھا۔ یہ ایک بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ اُن کے سیٹلے چہرے اور برف جیسی سفید آنکھیں دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں پھرتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گہرے رنگ کے کپڑے پر سنگ رخام کے ٹکڑے لڑھک رہے ہیں۔

میں نے اپنا سر کھڑکی میں سے باہر کھینچا اور مکان کے کنارے کی طرف ٹہلنے لگا، وہاں مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ بارہ کمسن بچے ایک بنچ پر بیٹھے اور وہ اس طرح بے ترتیبی کے ساتھ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں جیسے

وہ کسی چیز سے خوف زدہ ہوں۔

یہ لڑکے کیا کر رہے ہیں؟ ان لوگوں کو سزا دی گئی ہے یا اور کوئی بات ہے؟

میرے نوجوان ہندو گائڈ نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔ یہ لڑکے اقوام مندرجہ فہرست کے ہیں۔ میں ان کمسن بچوں کے پاس ذرا ٹھہر گیا۔ وہ اور بھی ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ یہ لڑکے دبلے اور تقریباً ننگے تھے، صفائی کا تو کوئی سوال ہی نہیں، لیکن بہرحال تھے یہ کمسن بچے ہی، اگر کوئی جذبات سے کام لے اور اسکا چستانی انداز میں کہے تو کہہ سکتا ہے کہ ان میں ہر ایک کسی نہ کسی کا نور نظر تھا۔

کسی نے ان کی تعلیم کے لئے ایک مرحلہ طے کیا ہوگا۔ ان بچوں کے بارے میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ اسکول میں ان کے داخلہ کی اجازت ہے۔ ریاست میں ان کے تحفظ کے لئے طرح طرح کے قانون بھی پاس کر رکھے گئے ہیں۔ لیکن اس صورت حال کے مقابلہ میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اس معاملہ کی رپورٹ کر دی جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا بیچارہ مدرس ضیق میں پڑ جائے گا۔ حالانکہ اغلب گمان یہ ہے کہ اس میں مدرس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ اچھا خاصہ بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ پچیس روپیہ ماہوار تنخواہ میں نیم فاقہ زدہ ہے۔ اس معاملہ میں قصور ان بچوں کے والدین کا ہے جو اسکول کے اندر بیٹھے ہیں۔

میں آگے روانہ ہوگیا اور ان کمسن ذات باہر بچوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ وہ کھڑکی کی طرف استاد کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھے کبھی کبھی ان میں سے کوئی اپنی پھٹی پرانی نوٹ بک پر کچھ حروف بنا لیتا۔

کیا کہنا! ہندوستان کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

منظر (۳) پشاور میں ایک کھانے کی میز ــــــ افراد، پنڈت مالویہ

اور مسٹر (ب) جو لیجسلیٹو کونسل میں حزب الاختلاف کے قائدین میں سے ہیں ۱۹۳۲ء
پشاور میں اس وقت جوش وخروش پوری طرح طاری ہے، کیونکہ ایک کانفرنس
کے اجلاس ہو رہے ہیں، اس کانفرنس میں ہندو اور سکھ اقلیتوں کی قسمت کا
فیصلہ ہوگا۔ واجب الاحترام ضعیف العمر پنڈت کو مسٹر (ب) نے مدعو کیا ہے۔
دونوں اس کے لئے بے چین ہیں کہ ایک دوسرے کو خوش کریں۔

لیکن دعوت کامیاب نہیں ہوتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ پنڈت جی کچھ
کھا نہیں سکتے۔ کیوں نہیں کھا سکتے؟ وجہ یہ ہے:۔

مسٹر (ب) نے اس دعوت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ پنڈت جی
سبزی خوار ہیں اس لئے دسترخوان پر صرف پھل رکھے گئے ہیں۔ مزید برآں
انھوں نے صرف ایسے پھل انتخاب کئے ہیں جن میں کسی ناپاکی کے داخل ہونے
کا کوئی تصور نہ ہو سکے۔ مثلاً سنترے۔ کیلے۔ اس سے بھی زیادہ انھوں نے انتہائی
احتیاط سے کام لیا ہے۔ اس دعوت کے لئے بالکل نئے برتن خریدے گئے
ہیں۔ کیونکہ انھیں ڈر لگا ہوا تھا کہ اگر پنڈت جی سے کسی ایسی رکابی میں کھانے
کی درخواست کی گئی جس میں شاید کسی وقت کسی شخص نے گوشت کھایا ہو،
تو بڑا ہی برا ہوگا۔ پنڈت جی جتنا ناخوش ہوں گے اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں
لگا سکتا۔ پنڈت جی اس کے بعد کبھی پاک وصاف نہ ہو سکیں گے۔

ہاں! تو سنیئے! تازہ پھل موٹے موٹے چھلکوں میں بند۔ نئی نئی رکابیاں
جو اس سے پہلے کبھی استعمال میں نہیں آئیں، دھری ہیں۔ بوڑھا میزبان
بے چین ہے کہ اپنے مہمان کو خوش کرے، کیلے یا کسی دوسرے پھل کی طرف
اشارہ کرتا ہے۔

یہ سب کچھ بیکار، وہ کیلہ کھا نہیں سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت،

کسی جگہ، کسی طرح، کسی آدمی نے کسی چیز کو چھو دیا ہو، وہ چیز ناپاک ہوگئی ہو۔ ہندستان میں اس خطرہ کو جھیلنے کی جرات نہیں کرسکتے۔ وہ ایک بہادر ضعیف آدمی ہیں لیکن اتنے بہادر نہیں ہیں۔ اس لئے اخلاق کے تقاضے ایک طرف ڈال دیئے گئے۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ دعوت ناکام رہی۔

یہ کہانی بڑی بے تکلفی سے بیان کردی گئی کیونکہ پہلی نظر میں یہ ایک دلچسپ چٹ پٹا سا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ تمام تر دلچسپ ہی ہے؟ پنڈت مالویہ اس زمانہ میں کانگریس کے لیڈر رہتے، یہ اس وقت بھی اور آج بھی ہندوستان کے نہایت ہی با اثر آدمی ہیں۔ وہ ایسے آدمیوں میں ہیں کہ جب کبھی ہندوستان آزادی پائے گا تو اپنے ملک کی بین الاقوامی مجالس میں نمائندگی کریں گے۔ اگر وہاں بھی ان کی حد درجہ بڑھی ہوئی مذہبیت کا لحاظ رکھا جائے گا تو کام کی رفتار بہت ہی سست ہوجائے گی۔

فرض کرو کہ اس صورت حال کو ہم مغربی انداز میں مبدل کرکے بیان کرتے ہیں۔ ذرا تصور کرو کہ چرچل، روزولٹ، اسٹالن اور چینگ کائی شیک کے مابین ہندو مذہبی اصول پر ایک کانفرنس منعقد ہو تو کیا صورت ہوگی؟

یہ لوگ کام کے اوقات کا بڑا حصہ غسل خانے کے اندر جانے آنے میں صرف کردیں گے۔ چرچل اسی قلم سے ایک کاغذ پر دستخط کریں گے جس سے روزولٹ نے دستخط کیا تھا اور اس کے بعد ہاتھ دھونے کے لئے بھاگیں گے۔ اسٹالین بے توجہی میں چینگ کائی شیک کے ہاتھ سے قبول کرکے ایک پیالی چائے پی لیں گے اور اس کے بعد تیزی سے بھاگتے ہوئے باہر جائیں گے کہ غرارہ کریں۔ روزولٹ آفتابہ کے لئے مسلسل پکارتے

ہوں گے۔ اور اگر ان میں ایک نے بھی کسی کام کو اختتام تک پہنچا دیا تو سمجھ لو کہ معجزہ ہو گیا ایسا کہ سری کرشن جی کے حضور میں جنگ کا آدھا قرضہ چکا دور کر دیا گیا۔

پھر بھی مالویہ باوجود ان کمزوریوں کے اس قابل ہیں کہ ہم ان کی عزت کریں۔ اتنے کٹر ہندو ہونے پر بھی جیسے کہ وہ ہیں۔ انھوں نے اچھوتوں کی جنگ لڑی ہے اور سیکڑوں اچھوتوں کو ہندو حلقہ میں داخل کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا دل اپنی ٹھیک جگہ پر ہے کیونکہ انھوں نے اپنے ساتھی انسانوں کے لئے اپنے باپ کے عقائد کی مخالفت کی وہ ان عقاید کی وجہ سے خود بھو کے رہ سکتے ہیں لیکن پھر بھی عقائد نے جن کو اچھوت قرار دیا ہے ان کی حمایت کے لئے ہاتھ میں ڈنڈا لینے سے دریغ نہیں کرتے اس کا انکار تنگ ظرفی ہوگی کہ وہ اس قصہ میں سے خوبصورتی کے ساتھ نکل آئے۔

۵

ہم نے ڈاکٹر امبیڈکر چھ کروڑ اچھوتوں کے لیڈر کو یہ کہتے ہوئے چھوڑا تھا کہ :-

"اچھوتوں کا گاندھی سے بڑا دشمن ہندوستان میں کبھی پیدا نہیں ہوا"

بہت سے لوگوں کو الفاظ سے شدید صدمہ پہنچے گا۔ گاندھی جی بار بار اچھوت پن سے اپنی بیزاری کا اعلان کرتے رہے ہیں، وہ خود اپنے آشرم میں اچھوتوں کو جگہ دیتے ہیں، انھوں نے ایک اچھوت بچّہ کو گود لیا ہے انھوں نے

اعلان کیا ہے کہ اچھوت پن کے زندہ رہنے کی بہ نسبت ہندو دھرم کا مرجانا پسند کرتا ہوں۔ اس قسم کے بار بار کئے ہوئے اعلانات حقیقۃً کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اچھوت پن فی الحقیقت ہندو دھرم کا اسی طرح ضروری جزہے جیسے سامیت دشمنی نازی مسلک کا جزو لاینفک ہے۔ اچھوت پن کو ختم کرنے کی کوشش شروع کیجئے نتیجہ یہ نکلے گا کہ ذات پات کا پورا نظام ہی ختم ہو جائے گا اور ذات پات ہی تو وہ مسالہ ہے جو ہندو دھرم کے حیرتناک حدتک الجھے ہوئے ڈھیر کو گر پڑنے سے روکے ہوئے ہے۔ گاندھی جی اچھوت پن کو مٹانے کے لئے کہتے ہیں تو غالباً اوروں سے اخلاص وصداقت میں کم ہوتے ہیں۔

..... تو امبیڈکر کا مطلب کیا ہے؟

ہم اسے سب سے اچھی طرح متوازی انداز میں بیان کرسکتے ہیں امبیڈکر کا بیان لے لو اور لفظ "اچھوت" کے بدلے لفظ "امن" رکھ لو، اب تصور کرو کہ امن کا ایک بہت بڑا منادی مثلاً لارڈ سیسل کہہ رہا ہے۔

"امن کا گاندھی سے بڑا دشمن دنیا میں کبھی پیدا نہیں ہوا"

عہد جدید کا یہ سب سے زیادہ خوش نما امن پرست ان الفاظ سے کیا معانی مراد لے گا؟ وہ یہ مراد لے گا کہ مقاومت مجہول جو گاندھی جی کی امن پرستی کا مسلک ہے صرف اس نتیجہ تک پہنچا سکتا ہے کہ بدنظمی پیدا ہو جائے اور وحشی فوجیں فاتحانہ انداز میں فوراً داخل ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لیٹ جاؤ اور لوگ تم کو پامال کرتے ہوئے گزر جائیں یہی طریقہ گاندھی جی نے جاپانیوں سے نبٹنے کا بتایا تھا) یہ طریقہ تو جن پر حملہ کیا جائے

ان کے لئے نمونۂ عمل قایم کرنے سے زیادہ خود حملہ آور کے لئے تحریص کا ذریعہ ہے
امن قایم رکھنے کے لئے تو تمہیں منظم اور مضبوط ہونا چاہیئے اور تمہیں قوت کے
استعمال کے لئے تیار رہنا ضروری ہے۔

اچھوتوں سے متعلق امبیڈکر کا بالکل یہی مطلب ہے وہ چاہتا ہے یہ لوگ
منظم ہوں اور مضبوط ہوں۔ وہ بالکل صحیح سوچتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کا
بہترین طریقہ جداگانہ انتخاب ہے چھ کروڑ انسانوں کی ایک ٹھوس وحدت اپنے
مدمقابل سے من مانے شرائط لکھوا سکتی ہے۔

گاندھی جی اس اسکیم کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے
آواز دی، تم اچھوتوں کو صرف جداگانہ انتخاب کا حق دیدو اور تم نے ان کا مقام
ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ یہ ایک لاجواب دلیل تھی، ان لوگوں نے جن پر
مہاتما جی کی چرب زبانی کا جادو نہیں چلا تھا اسے ایک معقول بات قرار دی۔
انھوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ گاندھی جی اس سے خایف ہیں کہ چھ کروڑ اچھوت
ممکن ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں سے مل جائیں اور اٹھارہ کروڑ اعلیٰ ذات
کے ہندوؤں کے مدمقابل آجائیں، (جیسا کہ تقریباً انھوں نے کیا بھی) جب ایسی
گستاخ تنقیدیں کی گئیں تو گاندھی جی نے اپنی عادتی چال کی پناہ لی، انھوں نے
تادم مرگ فاقہ شروع کر دیا۔ (جیسے آپ نے صورت حال میں ادنیٰ تبدیلی کی ہو
یا بجز اپنی ہٹ کے کچھ اور ثابت کر کے دکھا بھی دیا ہو!) ایک جنونی جوش
پیدا ہو گیا جو فاقہ کے ساتویں دن ایک سمجھوتے پر ختم ہوا۔ اچھوت ابھی حلقہ،
انتخاب میں رائے دیں گے جس میں اعلیٰ ذات کے ہندو نشستوں کی ایک
قابل لحاظ تعداد صوبہ داری مقننہ میں ان کے لئے محفوظ ہو گی۔ کچھ نہ ہونے سے
یہ بھی غنیمت ہے۔ لیکن یہ اتنا بہتر نہیں ہے جتنا اس وقت ہوتا جب کہ گاندھی جی

دخل اندازی نہ کرتے۔

یہ ہے ڈاکٹر امبیڈکر کی مراد۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ حق پر ہیں۔

۶

مستقبل میں کیا ہوگا؟

اس کا بڑی حد تک دارومدار برطانیہ کے طرز عمل پر ہے۔ اگر ہم کانگریسی مطالبات میں اُلجھے رہے تو اچھوتوں کی حالت یا تو جیسی ہے ویسی ہی رہے گی یا موجودہ سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ اور اسے بار بار دھرانے اور بہ تاکید بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگر اچھوتوں کی موجودہ حالت بھی باقی رہی پھر بھی یہ کسی طرح قابل برداشت نہیں۔

جدید مساعی کے ان بلند بانگ دعاوی اور گاندھی جی کے روحانیت بھرے اعلانات کے باوجود کتنے اچھوتوں کے لیے یونیورسٹی ڈگری کے حصول کا انتظام ہو سکا؟ پانچ سو! ہندوستانی تعلیمات کی پوری تاریخ میں پانچ سو، تقریباً چالیس کروڑ آبادی رکھنے والے ملک میں صرف پانچ سو۔

کانگریس پر برہمن قابض ہیں، وہ اچھوتوں کی حالت میں کسی تبدیلی کا کوئی خیال نہیں رکھتی یہ خاص طور پر قابل غور واقعہ ہے کہ اچھوتوں کی ترقی کے لیے سب سے بڑے پیمانہ پر ان ریاستوں میں کام ہوا ہے جہاں کانگریس کے فرامین نہیں چلا کرتے۔ فی الوقت میسور اس سلسلہ میں سارے ہندوستان کے لئے نمونہ ہے۔

اگر ہم نے کانگریس کے لیے راستہ کھول دیا تو ممکن ہے کہ اچھوت قریب ترین دیہاتی کنویں پر جاکر سب کے سب ڈوب مریں۔ اس کنویں کا زندگی کے لئے

استعمال ان پر حرام کر دیا گیا تھا، موت کے لئے تو استعمال کر ہی سکیں گے۔

امبیڈکر نے مجھ سے بیان کیا کہ کرپس تجاویز ہمارے مفاد کے لئے پیغام موت ہیں۔

کچھ لوگ امبیڈکر کی لیڈری پر حرف زنی کرتے ہیں، اگر ایک بار وہ اس کے عظیم الشان جلسوں میں شرکت کریں تو پھر کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ ابھی ناگپور میں پچھتر ہزار اچھوت اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی تائید میں اس قدر جوش کے ساتھ نعرے لگائے کہ خود گاندھی جی کو بھی رشک آنے لگا ہوگا۔

اس کے ماسوا، اگر کوئی ڈاکٹر امبیڈکر کا مدمقابل ہو بھی۔ جو نہیں ہے پھر بھی اس کی صاف سلجھی ہوئی باتیں، اور اس کا معقول نظریہ اس کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہر شریف اور سنجیدہ دماغ شخص کی اسے تائید حاصل ہو۔

ہم اپنی اس غیر مرتب تفصیلات کو اپنی ڈائری کے ان چند فقروں پر ختم کرتے ہیں جو ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے مجھ سے بیان کیا کہ:۔

"گاندھی جی ہم سے کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو! اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر اعتماد رکھو!! ہم جواب دیتے ہیں کہ ہم تم لوگوں پر اعتماد نہیں رکھ سکتے کیونکہ تم ہمارے خاندانی دشمن ہو۔"

"ہر گاؤں میں اچھوتوں کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی اقلیتیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں اکٹھا کر ڈالوں، اور اکٹھا کر کے ان کی اکثریت بنا دوں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک عظیم الشان کام ہے، تنظیم کا، تبادلۂ آبادی کا اور نئے دیہاتوں کی تعمیر کا، لیکن ہم یہ سب کچھ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہمیں صرف اس کی اجازت ہو۔ (ہمیں اس سے روکا نہ جائے)۔

"ہم اسی طرح پکے قوم پرست ہیں جیسے کوئی کانگریسی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے حقوق کی حفاظت سے پہلے برطانیہ ہندوستان سے دست بردار ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہمارا حال ان کچلے ہوئے انسانوں سے جو یورپ میں ہیں کہیں زیادہ دردناک ہو جائے گا۔"

کیا کوئی سنجیدہ انسان اس بارے میں شش و پنج کر سکتا ہے کہ ہمیں کس کی امداد کرنی چاہیئے؟ گاندھی جی کی، اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی جو تادم مرگ فاقہ کر سکتے ہیں مگر چھ کروڑ انسانوں کو اپنی آزاد تنظیم کا حق نہیں دے سکتے کیونکہ وہ ان کے مدمقابل ہو جائیں گے؟ یا ڈاکٹر امبیڈکر کی جس نے انتہائی پستی سے اپنے آپ کو بلند کیا اور اہانت و اوہام کے بے شمار مراحل سے گزر کر اپنے ساتھیوں کی سپہ سالاری کرتے ہوئے فتح مندی کی راہ بنا رہا ہے؟

برطانیہ کی ساری تاریخ یہی نہیں ہے کہ عزت کی راہ خود غرضی کی راہ سے ملی ہوئی چلے بلکہ صرف ان دنوں ہندوستان میں یہ حالت ہو گئی ہے۔ صرف ایک ہی راستہ ہے جسے ہم اختیار کر سکتے ہیں، اپنے تحفظ کے لئے اور مفتوحین کے تحفظ کے لئے بھی۔ ہمیں امید کرنی چاہیئے کہ ہم وہی راہ اختیار کریں گے۔

چوتھا باب

طوفانی شمال

...... اب پھر نہ ہو سکیگا۔

...... مجھے بھی اُمید ہے کہ اب نہ ہوگا۔ درد تیزی کے ساتھ ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔

...... ہو سکتا ہے کہ وہ بہت خوب آدمی ہو۔ یہ دیہاتی ڈاکٹر اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

...... ایک ملازم اندر آیا اور اس نے ہریکین کو چارپائی کے قریب میز پر رکھا۔

...... یہ لوگ کیا اسی قدر روشنی کا اِنتظام کر سکتے ہیں ؟

جی ہاں، غالباً اسی قدر۔

فرض کیجئے کہ ڈاکٹر صاحب کو اپریشن کرنا ہو تو .... ؟

رو گی نہ بنو۔

اچھا، اِس گندگی کو دیکھو۔

یہ گندگی میرا پیر تھا۔ یہ نہ خوش نما تھا، اور نہ صحتمند۔ میری ایڑی میں نیلا ناسور تھا جس میں بری طرح پیپ پڑ گیا تھا، اور اس کا زہر پھیل کر گھٹنوں تک آ چکا تھا۔ پاؤں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اگر تم انگلی رکھدو تو اس پر نشان پڑ جاتا تھا۔

جیسے کسی نے نرم چہرے پر زور سے انگلی دبائی ہو۔ حالانکہ مجھے ابھی صرف ایک ہفتہ پہلے ہسپتال سے یہ کہہ کر خارج کیا گیا تھا کہ میں اب بالکلیہ شفایاب ہو گیا ہوں۔

کسی مصنف کا درد دکھ اگر وہ ہوش وحواس رکھتا ہے تو آخری ہی وقت بازار میں فروخت کے لیے پیش کیا جائے گا ہم اپنی جگہ پر بس بالکل اچھے ہی ہیں غرض کہ یہ ایک ایسی شخصی یادداشت ہے کہ اس میں علالت کے ذکر کو بیان سے بمشکل ہی خارج کرنا ممکن ہوگا۔ کیونکہ اس علالت نے چار ماہ تک مجھے مختلف قسم کی جراحیوں اور طرح طرح کے ناہموار حالات میں پھنسائے رکھا۔

میرے لئے علالت کی اہمیت اس لئے بھی اور بڑھ جاتی ہے کہ اسی علالت نے مجھے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق بہت سی معلومات مہیا کیں۔ مدر انڈیا کی شہرۂ آفاق مصنفہ کیتھرائن میوسے ہندوستانی ہسپتالوں پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن بیچاری نے ان ہسپتالوں کی اندرونی کیفیت کا اتنا تجربہ نہیں کیا تھا جتنا کہ میں نے کیا ہے۔ ورنہ شاید اپنا نقطۂ نظر تبدیل کر دیتی ہندوستان میں پیشۂ طبابت کے متعلق اس نے بہت سی اچھی باتیں لکھی ہیں لیکن اس کا بیان اور زیادہ اثر انداز ہوتا اگر وہ بھی میری طرح کبھی خون سے تر اور اسٹریچر پر اتاری گئی ہوتی اور بمبئی امبولنس میں ایک ایسے مذہبی جلوس میں گزری ہوتی جو خون کی قربانی کا معتقد رہا ہو۔

میں کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو ان صفحات میں اپنے آپ کو مریضوں کے کمرہ سے باہر رکھوں لیکن کبھی کبھی مجھے اس کمرہ میں جانا ہی پڑیگا؛ کیونکہ ہمیں اس جگہ بہت سی معلومات مل سکیں گی۔

۲

ہم ڈاکٹر کے اِنتظار میں جس جگہ ہیں یہاں کا منظر یقیناً مریضوں کے کمرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ہم اس وقت شمال مغربی سرحد پر ایک چھوٹے سے پہاڑی قلعہ میں ہیں۔ دہلی جسے ہم نے پشاور کے ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے ابھی صرف دو ہفتہ پہلے چھوڑا ہے۔ یہاں سے جانب جنوب چھ سو میل پر گرم میدانی علاقہ میں واقع ہے۔ یہاں ٹھنڈک ہے کہر گر رہی ہے اور خوش منظر دھندلکا وادیوں پر چھایا ہوا ہے۔

منظر نہایت جذبات انگیز ہے۔ مغرب کی طرف ستر میل کے فاصلہ پر افغانستان کی سرحدی چوکی ہے۔ شمال میں ایک مسطح میدانی علاقہ ہے اور اس کے بعد پہاڑوں کی چھوٹی بڑی دندانہ دار چوٹیاں، جو دن کو خاکستری اور رات کو نیلگوں دکھائی دیتی ہیں۔ اونچی نیچی کسی تھیٹر کے مختلف طبقات کی طرح، یہ سقف عالم تک پہنچنے کی وسیع سیڑھیوں کا پہلا زینہ ہے جو ہمالہ سے گزرتا ہے۔ دور کی نچلی سطح سے دریائے سوات کی روانی کا نہ ختم ہونے والا شور سنائی دے رہا ہے، یہ دریا تیزی سے بہتا ہوا عظیم الشان دریائے سندھ میں مل جاتا ہے۔ دریائے سندھ کی وادیاں زمانۂ نا یادگار سے ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے فاتحین کی آواز پا سے گونجتی رہی ہیں۔ عیسیٰ مسیح سے تین سو ستائیس سال پہلے اگر ہم اس قلعہ پر کھڑے ہوتے تو ہم ایک فوج کو نچلی وادیوں میں در آتی ہوئی دیکھتے۔ وہ فوج بے شمار فتوحات کا غرور اور گھمنڈ لئے ہوئے، سروں پر خود چڑھائے اور کلغیاں لہراتی ہوئی گزرتی اور یہ فوج ہوتی سکندر اعظم کی۔ سکندر پہلا شخص اور کسی طرح شمالی حریفوں

میں آخری شخص نہ تھا جنھوں نے جنوب کی نرم و نازک زندگی کو اپنی طوفانی آندھیوں سے متاثر کیا۔ ابھی کل تک۔ ہندوستان کی تاریخ میں سو سال کا زمانہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ یہ پہاڑی کنارے حملہ آور کی ترغیب کے لئے کھلے ہوئے تھے۔

لیکن آج حالات اس سے بالکل ہی مختلف ہیں، فرض کیجئے کہ ہم پرانی کہانیوں میں سے کچھ اس جگہ بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زمانہ کی گھڑی کو کچھ دن پیچھے کی طرف چلا دیں، لیکن ایسا کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہمارے پاس کافی وقت ہے، ڈاکٹر صاحب کو آنے میں ابھی ایک طویل راہ گھوڑے پر گزارنی ہے اور سڑک بھی کچھ ایسی اچھی نہیں ہے۔

۳

میں شمال مغربی سرحد پر دو اسباب کی بنا پر آیا تھا۔ اول تو یہ کہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ اسے سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ جلد بھڑک اٹھنے والا طوفانی علاقہ بتایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب سرحدی باشندوں کا جوش ہنگامہ اور خروش جنگ کی حد تک بڑھا ہوا نہیں ہوتا ہے ان دنوں میں بھی یہاں چھوٹے چھوٹے ہنگامے غدر اور بغاوت کی اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے اسباب و محرکات کو سمجھوں، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کس کا قصور ہے، ہمارا قصور ہے۔ یا اس جگہ کے لوگ ہوتے ہی غضبناک ہیں، یا اس کے محرکات معاشی حالات یا یہ سب کچھ مذہب کی بنا پر ہوتا ہے؟

دوسرا سبب یہ تھا کہ مجھے دہلی میں کہا گیا تھا کہ آج کل سرحد پر ایسا

سکون ہے کہ پچھلے بیس سال سے کبھی نہ ہوا تھا میں نے اس کے متعلق معلومات
مہیا کرنا مفید سمجھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہم نے اپنی وضع بدل دی یا سرحدیوں نے
اپنی خو بدل ڈالی۔ سکون ہو گیا۔ یہ کس کا کارنامہ ہے۔ معاملہ کیا ہے۔ معاشی
حالات درست ہو گئے یا مذہبی جوش سرد پڑ گیا؟

یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص جسم ہندوستان کے
سب سے زیادہ مرض زدہ حصہ پر ہاتھ دھرے اور پوری توجہ کے ساتھ مقامی
آماس کو دیکھے تو ممکن ہے سارے ملک کے امراض کی صحیح تشخیص کر سکے۔

میں نے درۂ خیبر یعنی سیاحوں کے مشہور ترین اڈے سے ابتدا کی
ہم ایک مختصر سیاحت اس حصہ کی کریں گے امید ہے کہ واپسی کے وقت تک
ہمیں یقینی اہم معلومات حاصل ہو جائیں۔

خیبر کی سیاحت کرتے ہوئے یہ حقیقت پوری شدت کے ساتھ یاد
رہنی چاہیئے کہ اس علاقہ میں تہذیب جدید کا رنگ و روغن انتہائی ہلکا ہے
دوپہر کا کھانا تم نے پشاور کے دہی کلب میں کھایا۔ یہاں حسین عورتیں
خوش نما لباس میں تمہارے گرد موجود تھیں۔ سرودیوں کا ایک طائفہ قبل
جنگ کا ساز بجا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ کے بعد اب تم کلب سے دور پہاڑیوں میں
ہو، دنیا کے سب سے زیادہ ہیبتناک علاقہ میں جہاں نوک دار چوٹیاں ہیں اور
پھسل جانے کا ہر جگہ خطرہ۔ یہ راستہ جس پر تم چل رہے ہو سلامتی کا ایک ایسا
پتلا فیتہ ہے جس کو خطرہ اور تباہی کے خون آلود تاروں سے بنایا گیا ہے۔
چائے کے وقت سے پہلے ہی تم ہندوستان کے آخری کنارہ پر پہنچ گئے۔ یہاں
ایک بڑا دروازہ لگا ہوا ہے جو افغانستان جانے والی سڑک کو بند
کرتا ہے۔

ہندوستان کا آخری کنارہ، اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ ایک قسم کی "مخالف ترقی" چیز ہے ٹین کے دو ڈھاپے، کچھ بیرونی مکانات، چنگی اور پاسپورٹ کا دفتر، اور اس کے بعد ایک پانچ سلاخوں کا دروازہ۔ جب دروازہ کھلتا ہے ایک ستّا مریل آواز میں بھونکتا ہے۔ بس لے دے کے یہ ہے ہندوستان کا آخری کنارہ۔ لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ ایک ایسے ملک کا باب الداخلہ جس کا فسانہ زبان زد ہے، ایک پرشکوہ اور اثر انداز دروازہ ہوگا۔

خیبر میں ہمارا رہنما ایک نوجوان افسر تھا جس نے قبائلی علاقہ میں چار سال ملازمت کی تھی ہالی وڈ اور کپلنگ کی فلموں کی بدولت پہلے ہی لمحہ سے یہ درہ خلاف توقع مانوس سا معلوم ہونے لگا۔ اس مشہور نشان راہ نے جو درۂ خیبر کے سامنے لگا ہے مجھے اس طرح خوش آمدید کہا جیسے ہمارا اس سے یارانہ رہا ہو۔ اس نشان راہ میں ایک اونٹ اور ایک موٹر کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں تصویریں موٹروں اور اونٹوں کے راستوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس نشان پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہے، صرف تصویریں ہی بنی ہوئی ہیں۔ یہ نشان ناحرف شناسوں کے لئے ہے۔ اسی لئے اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہے، لیکن اگر لکھا ہوتا بھی تو کیا کام آتا۔ جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں، ان کے لئے بھی کارآمد نہ ہوتا۔ خیبر تو زبانوں کا ایک نامفہوم مجموعہ ہے۔ اگر یہ ساری زبانیں استعمال کی جاتیں تو شاید ایک میل اونچا نشان بنانا پڑتا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ لوگ جو سارے ہندوستان کے اتحاد کو قانون فطرت بتایا کرتے ہیں اس مسئلہ پر توجہ فرمائیں تو مناسب ہوگا۔

میں یہ خیال کرتا تھا کہ دنیا کے جس حصہ پر خدا کی لعنت ہے وہ وادی بحرالمیت ہے۔ یہاں کی زمین ممی کی کھال کی طرح جھلسی ہوئی اور یہاں

کی ہوا بوجھل اور ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے جہنم سے آرہی ہو۔ لیکن خدا کی جو لعنت خیبر پر ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہیبت ناک ہے۔

بحر الیت وہ مقام ہے جسے شاید خدا بھول گیا تھا، مگر خیبر وہ مقام ہے جسے یاد رکھا اور بڑا فروختگی کے ساتھ یاد رکھا ہے۔ یقیناً ان چٹانوں کو توہی ہاتھوں نے غصہ کے ساتھ اوپر سے نیچے کی طرف لڑھکا دیا ہے اور ان ہی ہاتھوں نے پہاڑیوں کے دامن سے درختوں اور سبزیوں کو نوچ کر انھیں ایسا ننگا کر دیا ہے کہ چند بکریاں بھی ان کے درختوں سے اپنے لئے چارہ مہیا نہیں کرسکتیں۔

ہم جیسے جیسے اوپر چڑھتے رہے، ویران تر حصے میں پہنچتے گئے تمدن کی اگر کوئی نشانی یہاں پائی جاتی ہے (بشرطیکہ لفظ تمدن اس کے لئے غلط نہ سمجھا جائے) تو وہ تیاریاں اور وہ انتظامات ہیں جو درۂ خیبر کی حفاظت کے لئے حکومت برطانیہ نے کئے ہیں یا کر رہی ہے پہاڑیوں پر توپ خانہ کے لئے بیٹھکیں بنی ہوئی ہیں۔ اور ڈھلوان راستے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ راستے صرف دبابوں ہی کے لئے کارآمد نہیں ہیں بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کی مسلح پہاڑی فوج کی گزرگاہ بن سکتے ہیں۔ تیاریوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا ہے۔ ہم جب نیم دائرہ راستہ پر لوٹے تو ہم ایک ایسے سیدھے ڈھلوان پر پہنچ گئے جہاں سے دروازوں کی ایک قطار سی دکھائی دیتی ہے، یہ دروازے ایک زمین دوز بہیتال تک پہنچاتے ہیں جو عہد جدید کے تمام ضروری سامان سے مکمل ہے۔

اس جگہ سے درۂ خیبر ٹھیک سامنے بلندی پر دکھائی دیتا ہے۔ شاید تم یہ سوال کرو کہ یہ سب تیاریاں کس دشمن کے مقابلے میں ہیں خصوصاً آج کل جب بین الاقوامی امن و امان پھر سے وجود میں آنے کے لئے بیتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سوالات کا کوئی فائدہ نہیں۔

جھلساتی ہوئی خشک سالی — اور شور مچاتا ہوا سیلاب
گرد و غبار کے مہینے — کیچڑ کے دن
رلی جلی ہوئی یکرنگی — اور خون

میرے نوجوان رہنما نے یہ مصرعے پڑھے ہم ایک پہاڑی نالہ کے لپشتی حصے میں ٹھہر گئے تاکہ کچھ منٹ کے لئے بگولوں سے نجات مل جائے یہ جگہ بھوتوں کے راجہ کا قدیم وضع کا چوپال معلوم ہوتا تھا۔

گرد و غبار، اور کیچڑ تو ٹھیک ہے، مگر یہ خون کیوں؟

مجھے اپنے سوالات کے لئے یہ جگہ بھی ویسی ہی مناسب معلوم ہوئی جیسی کوئی دوسری جگہ ہوسکتی تھی، میں نے سرحد کی نہ ختم ہونے والی بے چینی کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔

اس قدر خوں ریزی کیوں ہوتی ہے۔ یہ قبائل لڑائی ختم نہیں کرینگے؟ جب یہ لوگ ہمیں اپنی گولیوں کا نشانہ نہیں بناتے ہیں تو ان دنوں خود آپس ہی میں ایک دوسرے کو گولی مار دیتے ہیں۔ اگر ہم ان کو ایسی حرکات سے نہیں روک سکتے تو کیا کوئی دوسری طاقت ایسا کر سکتی ہے۔ کیا گاندھی جی ایسا کر سکتے ہیں؟

وہ ذرا بھر کسی قدر بڑبڑایا پھر اس نے کہا، اگر تم پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آئے ہو تو ظاہر ہے کہ تم ایسے ہی سوالات کر سکتے ہو، کیا واقعی تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ یہ لوگ کیوں لڑتے رہتے ہیں، تو سنو! میں بتاتا ہوں اس کے دو اسباب ہیں!—

اس کے بعد وہ ٹھہر گیا۔ اور اس نے سگریٹ جلایا—— پھر کہنے لگا۔

دوسرا سبب معاشی ہے۔ لیکن پہلا سبب زیادہ اہم ہے۔ اور پہلا سبب ہے، کھیل تماشا، اور بازی پسندی۔

کھیل تماشا؛ یعنی یہ لوگ جنگ جدال صرف جنگ وجدال کے شوق میں بطور تفنن کرتے ہیں۔ قدیم انسانوں کا وحشیانہ جذبۂ حرب ان میں کام کر رہا ہے؟ آپ یقین فرمائیے کہ ان الفاظ سے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

کھیل تماشا!

ماہرین جنگ اسباب جنگ کے متعلق اپنے پسندیدہ نظریوں کو جن خانوں میں رکھا کرتے ہیں۔ یہ نظریہ ان میں سے شاید کسی خانہ میں بھی برابر نہ آسکے گا اور ظاہر ہے کہ اس کے متعلق اعداد شمار مہیا کرنا بالکل ہی ناممکن ہوگا۔ ابتدا سے جنگ کے اسباب کو واضح کرنے اور نظریوں کو ثابت کرنے کے لئے جو اہم ترین اعداد شمار شایع کئے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ بھی اس کے لئے نہیں ملیگا۔

...... سب سے الگ ...... معاشی نظریہ، نظریۂ آبادی، نسلی نظریہ، اور خدا ہی جانے کیا کیا نظریئے ہیں۔

اگر کوئی شخص ان نظریوں میں کھیل تماشا کے نظریہ کا اضافہ کرنے کی جراءت کرے تو شاید اس کے قول کو مدرسہ کے چھوٹے بچوں کی تنقید سے زیادہ مقام نہیں ملے گا۔ البتہ اگر اس نے لمبی اور پرشکوہ عبارت میں اپنے اس نظریہ کو پیش کیا تو ماہر اسے کان لگا کر سنے گا۔ اور اس کا نام "نفسیاتی نظریہ" رکھ دیگا۔ سہ نشینوں کے اس ہموار زمانہ میں جذبات سے متاثر ہو جانے والوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہو جائے گی۔ بہرحال کھیل تماشا بہت ہی مختصر لفظ ہے اور خصوصاً شمال مغربی سرحد کے لئے تو یہ مناسب ترین لفظ ہے۔ بات یہ ہے کہ سرحدیوں نے کبھی کوئی ہشینی دور دیکھا ہی نہیں جس کے خلاف انقلاب اُن کے

دماغ میں آسکے۔ لے دے کے جس واحد مشین سے ان کا واسطہ پڑا ہے وہ ہے ان کی رائفل۔ اِس مشین کو یہ لوگ عزیز رکھتے ہیں۔ اِس لئے نہیں کہ اُس کی مشینری بڑی خوبصورت ہے بلکہ اِس لئے کہ وہ جادو کا ڈنڈا ہے جوان کو اپنی شخصیت کے ظاہر کرنے کا موقع مہیّا کرتا ہے۔ شخصیت کے اظہار کا صرف یہی ایک طریقہ انھیں معلوم ہے۔ اِنسان بہرحال کسی نہ کسی طرح اپنی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے، چاہے قلم کے ذریعہ ہو یا ہل کے ذریعہ یا چاہے پستول کے ذریعہ اور اگر ایسا نہ ہو تو انسان مرجائے گا۔

"جناب مجھے ایک ماہ کی چھٹی دیجئے کہ میں اپنے چچیرے بھائی کو مار ڈالوں"

سوال خواہ مخواہ نہیں بنا دیا گیا ہے بلکہ یہ بہت سے ان بہ اِصرار مطالبات کا ملخص ہے جو اِس علاقہ میں برطانوی افسروں کے سامنے ان کے پٹھان سپاہیوں کی طرف سے پیش ہوتے رہتے ہیں۔

میرے دوست نے مجھے بتایا کہ پشتو زبان میں چچیرے بھائی اور دشمن کے لئے ایک ہی لفظ ہے۔ جب ایسا سوال پیش ہو تو افسر کو کیا کرنا چاہیئے۔ عادتاً وہ سپاہی جو سب سے زیادہ سخت جذبۂ دشمنی رکھتا ہو بہترین سپاہی ہوتا ہے فرض کرو کہ افسر نے کہا:۔

"نہیں، نامعقول کہیں کے! تم کو چھٹی نہیں مل سکتی، تم کو یہاں رہنا ہوگا اور ایسے بُرے ارادے کی پاداش میں تمہیں معمول سے زیادہ ڈرل کرنا پڑے گی"

اچھا! تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہ شخص رائفل لے کر چل دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا ایک اور عمدہ آدمی ہاتھ سے جاتا رہا اور رات کی تاریکیوں میں شبخون مارنے والوں کا ایک مزید فیرسانی دے گا!

پٹھان کبھی کسی قسم کے اخلاقی قانون کی پروا نہیں کرتا۔

جناب والا بہت خوب! .... میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپ اسے قانونِ اخلاق کی بجائے "قانونِ عزت" سے تعبیر کریں گے۔ یہ قانون تین الفاظ میں اچھی طرح ادا ہو جاتا ہے۔ ناناوتائی، بیلا ستیا، اور بدرقہ یعنی پناہ، مہمان نوازی اور راہداری۔ اگر کسی نے اس ضابطہ کو توڑا تو سمجھو وہ سچّا پٹھان نہیں۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے ان کی زندگی دنیا میں سب سے زیادہ سخت اور سب سے زیادہ صاف ستھری ہے۔ ایک پٹھان اپنی بیوی کو آوارگی کے جرم میں قتل کر سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ قتل کر دیتا ہے۔

...... لیکن کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم ایسی باتوں کو ختم کر دیں؟

...... اس نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ اور کہا ختم کر دیجئے، ضرور ختم کر دیجئے، کیسے ختم کریں گے؟ اور کیا ذرائع اختیار کریں گے؟ دس لاکھ مستقل فوج، پانچ لاکھ خفیہ پولس، بس یہی تو ہیں وہ ذرائع جو آپ پیش کریں گے۔ اگر ایسا انتظام کیا گیا تو فتح کس کی ہوگی، میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ فوج اور خفیہ پولس کی فتح نہ ہوگی۔

جیسے ہی اس نے کہا، ان چار قاتلوں کے چہرے میری آنکھوں میں آ گئے جو میرے ہسپتال کے ساتھی تھے، اس ہسپتال کے جہاں جلد ہی مجھے تقدیر پھر دوبارہ لے جانے والی تھی۔ (شاید یاد ہوگا کہ ان قاتلوں کا ذکر کتاب کے ابتدائی صفحات میں آیا ہے) رات والی نرس نے پہلے پہلے مجھ سے ان قاتلوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اور مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ نرس نے کہا تھا، کہ یہ لوگ پھانسی نہیں دیئے جا رہے ہیں اس لئے مجھے ان کے متعلق کچھ زیادہ برے خیالات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ——— دوسرے

دن صبح کے وقت مریضوں کی پہچان دار کرسی پر بیٹھ کر ان کے وارڈ میں گیا تھا
یہ لوگ اس حالت میں پڑے تھے کہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں
بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مسلح سپاہیوں کا ایک حفاظتی دستہ سنگینیں چڑھائے
ہوئے ان کے سروں پر کھڑا تھا۔ اور یہ لوگ اس سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ
چاروں کے چاروں نوجوان تھے، شریف صورت اور خوش رو تھے۔ ان کے خط
وخال اچھے تھے۔ جن سے اچھے ہی جذبات ظاہر ہو رہے تھے۔ انھیں
ایسی حالت میں صرف عزت نفس اور عشق نے پہونچا دیا تھا۔

ان میں ایک شخص کا ماجرا یہ تھا کہ اس نے کسی دوست کو اپنے
ہاں پناہ دی تھی اور اس کے چچا نے اس دوست کی کوئی چیز چرالی۔ بتائیے!
ایسے نامعقول چچا کے ساتھ آدمی اس کے سوا کیا سلوک کر سکتا ہے کہ اُسے
قتل کر دے؟ دوسرے شخص کی بیوی نے ایک ہندو چڑیمار سے آنکھیں
لڑالیں۔ ایسی فاحشہ اور بدکار کو سانس لینے کی اجازت کیسے دی جاسکتی
تھی؟ بقیہ دو اشخاص کا جرم بھی جنسی غیرت کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ اس علاقہ میں
عشق بالمثل اس قدر عام ہے کہ اسے بدکاری سے تعبیر کرنا تقریباً پاکی داہن
کی حکایت کے برابر ہوگا۔ مجھ سے ایک تجربہ کار بڈھے کرنل نے بیان کیا کہ
ہمارے رجمنٹ میں جب کبھی قتل کا کوئی حادثہ ہوتا ہے تو ہم فوراً اس لونڈے
کی تلاش شروع کر دیتے ہیں (جو اس کا سبب تھا)

ان چار پرجوش نوجوانوں کے ساتھ ساتھ اس وارڈ میں اور بھی
لوگ دکھائی دیتے تھے جن میں سے بعض مسکرا رہے تھے اور بعض تیوری
چڑھائے تھے یا رو رہے تھے۔ اگرچہ یہاں ایسے لوگ بھی تھے جو خود کردہ
مرض میں مبتلا نہ تھے۔ لیکن زیادہ وہی تھے جو گولی کھائے ہوئے تھے، یا

چاقو کی دھار سہتے ہوئے تھے ـــــ نو سالہ لڑکے تھے جن کی نشو و نما خونی فسادوں
کی دل آزار فضا میں ہوئی تھی، بارہ سالہ بچے اور نرم و نوخیز لڑکے تھے جن کے پاس
کڑی بات کا جواب ہی چاقو کی دھار تھی۔

روک دو! ضرور روک دو! اس کی کوشش کیوں نہ کرو کہ دریائے سندھ
کو سمندر میں گرنے سے روک دو! تم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہو کہ ان شعلہ
پوش انسانی دھاروں کو معقول حدود کے اندر رکھو!

اور یہ اسی طرح چلتا رہتا ہے، ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش ہے کہ جاری
ہے اور برس پر برس گزر رہے ہیں۔ پکٹ قائم رہنا چاہیئے، پٹرول کو حرکت
کرتا ہی رہنا چاہیئے۔ اسکاوٹ اور فوجیں سراپا مسلح رہیں۔ سرحدی کانسٹبل
رہے، فوجی بھرتی جاری رہے۔ ملک رہیں، خاصہ دار رہیں، بدرقہ رہے[1]۔

۱۰۱۷۳۶

جدید تاریخ نویسی کا رجحان یہ ہے کہ شخصی اثرات کو ہلکا کر کے دکھایا
جائے اور دنیا کی بڑی بڑی تحریکات کو شخصی مساعی کی بجائے معاشی محرکات
کا نتیجہ بنا کر پیش کیا جائے۔ اس رجحان کو انتہا تک پہونچا دیا جاتا ہے۔ ہم سے
یہ باور کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے کہ معرکۂ اسٹرلائز بغیر نپولین کے اور معرکۂ
اسٹالن گراڈ بغیر اسٹالن کے وجود میں آگیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کوئی آدمی چاہے
وہ کتنی ہی بڑی شخصیت رکھتا ہو اس دھارے کو جسے انسانیت چلا رہی ہے
روک نہیں سکتا، لیکن ادہام کے بندوں کو توڑ کر اور ایسی نہریں نکال کر

---

[1] شمال مغربی سرحد مصنفہ سی جے ایم ایوارٹ (لندن بک کمپنی پشاور)

جن سے انسانیت کہ صحرا پہنچے جاتے ہیں، ہم اس کی رفتار کو بڑی حد تک تیز یا سست تو کرسکتے ہیں۔ یہ نہ تو صحیح ہے اور نہ اچھی صناعی کہ تاریخ کے پنولینوں کو غیر شخصی محرکات کا محض مظہر قرار دے کر ان کی حیثیتوں کو گرا دیا جائے حالانکہ یہ محرکات خود ہی لوگ پیدا کرسکتے ہیں، اور وہ طوفانی ہوا جس سے یہ لوگ کام لیتے ہیں خود ان کے سینوں ہی میں اپنا مرکز طوفان رکھتی ہے۔

ہندوستان اس حقیقت کو بار بار دھراتا رہا ہے، گاندھی جی مسلمہ طور پر ایک ممتاز ہندو ہیں، ایسے لاکھوں ہندو بازاروں، مندروں اور وہاں کے کھیتوں میں پڑے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ گاندھی جی کو لین دین کے معاملہ میں بلا کا کمال حاصل ہے اور دوسروں کو نہیں۔

"کھیل تماشا" کا وہ نظریہ جسے ہم نے ابھی ابھی بیان کیا ہے، ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول نہیں جو انسانی کہانی میں سے خون کو بالکل باہر نکال دینا چاہتے ہیں اور تاریخ اس طرح لکھنا چاہتے ہیں جیسے کھاتے لکھے جاتے ہیں کیونکہ اس نظریہ سے واقعات کی توجیہہ مزاج سے ہوتی ہے، فرد کا مزاج نہیں بلکہ افراد کا مزاج اجتماعی۔ عوام کی یہ اجتماعی شخصیت بھی تو ایک حقیقت ہی ہے۔ اسی آسانی کے ساتھ اس کو بھی ضبط تحریر میں لایا جاسکتا ہے جیسے اس کے اثرات کا اندازہ لگانا ممکن ہے مثلاً خاکنائے دوور کا معاملہ۔ وہ شخص بصیرت سے محروم ہے جو اس بات سے انکار کرے کہ برطانیہ کی جنگ اور فرانس کی شکست میں عوام کی شخصیتیں اثر انداز محرکات تھیں۔

جب ہم اپنے مقرر کئے ہوئے اس دوسرے سوال پر آتے ہیں جو سفر مرحلہ کی ابتداء میں ہم نے قائم کیا تھا تو پھر ہمیں شخصیت کی طاقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ صوبہ کیوں اتنا پرسکون ہے جتنا پچھلے بیس سال میں کبھی نہ ہوسکا تھا؟
— میرے نوجوان دوست نے بیان کیا کہ مسلسل فسادات کے اسباب میں سے ایک سبب معاشی صورت حال تھی — ہم جہاں پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے دور پرنشیب میں ہم نے اونٹوں اور پیدل قافلوں سے اڑتی ہوئی گرد دیکھی جو دور تک جلوس کی طرح چل رہے تھے۔

اس نے کہا دیکھو! اس میں دولت بھری ہوئی ہے۔ یہ قافلے ایک ہی حملہ میں لٹ جاسکتے ہیں۔ ان کاروانوں میں بخارا اور ترکمان کے ریشمی کپڑے ہیں، قالینیں ہیں اور پشاور کے سناروں کی بہت سی قیمتی دھاتیں ہیں۔ ان میں ایشیا کے ہر گوشہ کی عورتیں اور مرد ہیں۔ ان میں سرحد چین سے سمرقند تک کے لوگ ہیں، مرو اور ہرات کے باشندے ہیں۔ ان میں تاجیک ہیں، کابلی ہیں، قزلباش ہیں، غلزئی ہیں، جن کے ساتھ یہودی بھی ہیں اور اوزبک بھی ہیں جو مکّہ (مکرمہ) سے چلے آرہے ہیں۔

اب ذرا اپنے گردوپیش کو دیکھو! یہاں کیا دھرا ہے؟ چٹانیں اور دھولیں، کانٹے اور جھاڑیاں۔ پانی کا پتہ نہیں۔ چند بکریاں اور چٹانوں میں ایک کھوہ جسے گھر کہ لو، جب یہ لوگ اس قسم کا شکار دیکھتے ہیں تو بھوکے انسانوں کے لئے یہ ترغیب و تحریص کا موثر سبب بن جاتا ہے۔ کیا یہ کوئی تعجب کی بات ہے؟

...... لیکن تم نے کہا کہ حالات اب کس قدر بہتر ہیں؟

.... ہاں! بہتر تو ہے۔ مزدوری بڑھ گئی ہے۔ جلانے کی لکڑی جو اس علاقہ کی چند قابل فروخت اشیاء میں سے ایک ہے، اچھے داموں بک جاتی ہے۔ لیکن یہ صرف آسان معاشی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں

آسان کیا ہوتا ہے؟ بلکہ اس میں شخصیت بھی کام کر رہی ہے۔

کس کی شخصیت؟

ایک شخصیت تو سر جارج کینننگھم ہی کی ہے۔ وہ اس صوبہ کے گورنر ہیں اور سب سے بڑی شخصیت رکھتے ہیں، وہ ہر جگہ جاتے ہیں، ہر شخص کو جانتے ہیں، مختلف بولیاں صحت کے ساتھ بولتے ہیں۔ اور بڑے ہی نڈر آدمی ہیں انھیں کبھی اس کا خوف نہیں آتا کہ کوئی انھیں گولی مار دیگا۔ طبیعت بھی بڑی پر مذاق پائی ہے، اور تم کو تو یہ سب کچھ معلوم ہی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جن سے تمہیں ملنا چاہیئے مثلاً والی سوات۔

وہ جن کے متعلق لیر نے ایک مہمل سی نظم لکھی ہے۔ کیا واقعی ان کا وجود ہے؟ وہ کس قسم کے آدمی ہیں؟

...... جا کر مل کیوں نہیں لیتے؟

میں گیا اور میں نے ان سے ملاقات کی۔

۵

یہ وہ جگہ ہے جہاں گنگا دین اپنے فرائض انجام دینے کا عادی ہے۔

دو دن کے بعد ہم وادی سوات کو روانہ ہوئے۔ میرے لئے یہ سارا منظر عجیب اور ناخوش گوار تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ میں اس حصہ کو اوپر سے دیکھتا رہا تھا۔ اور اب میں ڈانڈی میں تھا۔ اونچی چٹانیں میرے اطراف سیدھی کھڑی تھیں۔

بہرحال تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک آرام دہ گاڑی میں پہنچ گیا جو بہت عمدہ پکی سڑک پر چل رہی تھی۔ اور اب صبر ممکن ہو گیا کہ گنگا دین کے ڈرامہ کو

دوبارہ شروع کیا جائے۔

خیال کرو کہ اونچی نیچی ڈھلوان چٹانیں کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے نیچے سے ایک زرد رنگ کی ندی بہ رہی ہے ——— ندی کے اس پار ایک نامکمل سا قلعہ ہے جس کی دیواریں بموں سے چھلنی ہو گئی ہیں۔ یہ چک درد کا قلعہ ہے جس کو لشکریوں نے حاصل کیا ہے۔ گنگا دین اس پیکیٹ کے ساتھ تھا جو ان ڈھلوان چٹانوں کی بلندی پر متعین تھی۔ کوئی شخص کس طرح بموں کی بوچھار میں اس خطرناک ڈھلوان سے سرک کر نیچے آسکا چاہے وہ کپلنگ کے گیتوں ہی کا ہیرو کیوں نہ ہو اب تک یہ ایک راز ہے جو حل نہ ہو سکا۔ لیکن یہ ہوا اور سب کچھ ہوا، قلعہ ندی پانی کی گزرگاہ، گنگا دین کی نقل کرتے ہوئے ہم ہر جگہ گئے اور نہایت عمدہ قسم کی سڑک تک آ گئے۔ دہکتی ہوئی آنکھوں اور عقابی چہروں کے ساتھ میں نے اپنی موجودہ صورت حال میں یہ محسوس کیا کہ ان جنگجو اشخاص سے مٹ بھیڑ ہوئی جاتی ہے اور یہ ختم ہو گی ....

...... پر۔ گنگا دین! تم مجھ سے تو بہتر آدمی ہو۔

میرے ایک ساتھی نے جو ایک تجربہ کار برطانوی ریذیڈنٹ تھا کہا کہ آج سے پچیس سال پہلے اس راہ پر بغیر محافظ دستے کے ہمارے لئے چلنا ممکن نہ تھا۔ ہمیں آدھا وقت سروں کے جھکانے اور اٹھانے میں صرف کرنا پڑتا۔ اور آج تم صرف ایک چھتری ہاتھ میں لے کر دن کے وقت اس سڑک پر جس طرح چاہو چل سکتے ہو، تم سے کوئی یہ بھی نہ پوچھے گا کہ منہ میں کتنے دانت ہیں؟ پچیس سال پہلے تم کو یہاں افلاس و فاقہ کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ اور آج ذرا ان کی حالت دیکھنا! اس ریاست کی آبادی پانچ لاکھ ہے جو آپس میں متحد بھی ہے اور خوشحال بھی ——— اس کا سبب؟

ایک جفاکش شخصیت ۔ضعیف العمر والی سوات بلا کی ذہانت رکھتا ہے
وہ سنیٹ فرانسیس اور میکاولی کا ایک غیر معمولی مرکب ہے۔ اس کی زندگی ایک
عظیم الشان موقع شناسی سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے دادا اخوند صاحب
سوات ایک بہت بڑی مذہبی حیثیت کے مالک تھے۔ موجودہ والی سوات
نے اس موقع اور امکان سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔

...... میں نے کہا کہ یہ تو محض بے قاعدہ سی ایک بات ہوئی۔

...... کیا ملک کا یہ حصہ خود بھی روشنی سے محروم اور تمام تر بے قاعدہ
ہی نہیں ہے ؟ اس کے تبصرہ کی قوت کا اقرار کرنا پڑا۔ یہ درست سہی! لیکن میں تو
اس فکر میں پڑ گیا کہ اس صورت حال کی ساری توجیہ اور معقولیت کا ان روشن
خیال اور اعتدال پسند حاضرین کے سامنے بیان کرنا کس قدر مشکل ہوگا جو یہ
یقین لئے بیٹھے ہیں کہ ہمیں ہندوستان کے سرحدوں پر صرف اس لئے قدم بڑھانا
چاہیئے کہ سارے ملک کو جمہوری نمایندہ اداروں کے فوائد کی خوشبو سے معطر کرنے
کی شبانہ روز خدمت انجام دیں ـــــ یہ ایک ایسی سرزمین ہے جہاں کے لوگ
سابق میں قزاق تھے۔ ان پر مذہبی ذہنیت طاری ہے اس کے چاروں طرف
وحشی ریاستوں کا ایک بلقانی انداز کا دخاق ہے، ان ریاستوں میں باہمی عداوتیں
ہیں، چند برطانوی افسروں کی مسلسل نگرانی میں نظم و ضبط کا انھیں کسی قدر پابند
بنا کر رکھا گیا ہے ۔ یہ افسر اپنے زمانہ حکمرانی میں مجبور ہو گئے ہیں کہ متعلقہ قبائلی
افراد کی فطرت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنے طریقۂ حکمرانی میں بھی تبدیلیاں کرتے
رہیں۔ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا ہلیمپ سٹیڈ میں گھر کے اندر انگیٹھی
کے کنارے پر سکون انداز میں بیٹھے ہوئے سوچنے والے شخص کو دکھائی دیتا ہے۔
مثال کے لئے اجرائے قانون پر غور کرو۔ ایک جماعت جو حکومت کے

مسائل میں اتنی دانشمند نہیں جتنا کہ برطانیہ ہے، والی سوات کی ریاست میں برطانوی مجموعہ قوانین کو جاری کرنے کی کوشش اگر کرتی، تو کیا ہوتا؟ —— جہاں تک نظریات کا تعلق ہے ہمیں ایسی ہی کوشش کرنی چاہیئے تھی۔ اگر ہندوستان ایک قوم ہے تو قوم کے سارے اجزا کو ایک ہی قانون کے ماتحت ہونا چاہیئے لیکن خود برطانیہ بھی جو ہمیشہ بہترین کی تلاش میں رہتا ہے جب نظریات کو بھلا کر کیا صحیح اور کیا مناسب ہے؟ کے لئے اپنے احساس پر بھروسہ کرتا ہے تو قوانین پر پوری طرح عامل نہیں رہتا۔

میرے دوست نے ایک معقول چیز اور کہی کہ یہاں قانون نام ہے قبائلی رسم و رواج کا یہ رسم و رواج کسی قانونچہ میں مدون نہیں ہیں اور برطانیہ کو اس بارے میں ایک لفظ کہنے کی ضرورت بھی نہیں یہ رسوم ان لوگوں کے لیئے بالکل مناسب اور درست ہیں۔ یہ لوگ مذہب کے جنون کی حد تک پابند ہیں۔ جب یہ کسی فوجداری مقدمہ میں حلف لیں تو تم اپنی جان کی شرط بھی لگا سکتے ہو کہ یہ سچ بولیں گے۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جنھوں نے جھوٹی قسم کے مقابلہ میں چودہ سال قید بامشقت کی سزا کو ترجیح دی ہے۔ البتہ وزیری اس سے مستثنیٰ ہیں، وہ ہر معاملہ میں جھوٹ بول سکتے ہیں۔

قبائلی رواج اس علاقہ کے لئے برطانوی قوانین سے کیوں بہتر ہیں۔ اسکی ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہ ہے ان کے مذہبی پیشوا یعنی ملاؤں کا وجود یہی لوگ حقیقت میں اس علاقہ کے قائدین ہیں۔ ایک ملا کسی شخص کو ممکن ہے کہ حکومت برطانیہ کے مقابلہ میں جھوٹ بولنے کا ثواب دیدے لیکن قبائلی رواج کے مقابلہ میں اگر اس نے جھوٹ کہا تو ثواب ہرگز نہیں ملے گا۔ جھوٹے کو لازماً جہنم میں جانا پڑے گا۔ (اور ملا جو چاہے اس کے حق میں کر سکتا ہے۔

یہ مفید ہوتا کہ ہم اس موضوع پر اور کچھ کہتے مگر اب ہم چھوٹے شہر سوات کو بیرونی حدود میں پہنچ رہے ہیں۔ ہم چند صاف ستھرے مکانات ایک ہسپتال ایک اسکول اور ایک مسجد کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کے آگے ایک خوشنما سا دیہاتی مکان دکھائی دیا جو بعد کو سرکاری محل ثابت ہوا اگر ہمارے چاروں طرف اودے رنگ کی پہاڑیاں نہ ہوتیں اور گلابی سفید اور جنگلی لالہ کی وہ چادریں نہ ہوتیں جو چراگاہوں میں پیدا ہوتے ہیں، تو گویا ہم سرکس میں ہوتے ـــــ والی سوات تشریف لاتے ہیں۔

۶

گھبراہٹ .... رعب .... آثار .... چڑھاؤ

میری ڈائری میں مندرجہ بالا الفاظ لکھے ہیں جو ہمارے وہاں پہنچنے کے بعد چند منٹوں کے حالات کی صحیح ترجمانی ہے۔ ہاں، اس کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔

والی سوات تشریف لاتے ہیں، .... گھبراہٹ .... حقیقت کے اظہار کا مختصر طریقہ ہے ـــــ اس بوڑھے انسان نے اپنی شخصیت سے ہمیں اس حد تک متاثر کیا کہ خوف زدہ ہو کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک حملہ آور آدمی ہیں، وہ تو اس سے بہت دور رہیں۔ وہ والی ریاست سے زیادہ ایک مذہبی پیشوا سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کی وہ سفید داڑھی اور وہ فیض رساں آنکھیں۔ وہ جب تم سے ہاتھ ملائیں گے تو شدت احساس سے تم پر کپکپی طاری ہو جائے گی اور بالکل ایسا معلوم ہوگا کہ ان کی آنکھیں سیدھی تمہارے سینہ کے اندر نافذ ہو کر تمہارے دل کو دیکھ رہی ہیں وہ ایک پستہ قد آدمی ہیں، ان کو دور کی چیزیں صاف دکھائی نہیں دیتیں، ان کے دانت سب گر چکے ہیں

وہ انگریزی بھی نہیں بولتے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہم پر اتنا اثر ڈالا اور
اس طرح چھا گئے جیسے ہٹلر میونخ کے ہال میں لکچر دے رہا ہو۔

میں دیر تک سیدھا "تیار باش" کی حالت میں اس طلسمی بوڑھے انسان
کی برباد دینے والی نظروں کے نیچے، بے حس وحرکت کھڑا رہا۔ یہ ہے تفصیل میرے
لفظ "رعب" کی۔ باہر جو بینڈ تھا اس نے یکایک "سلامت رکھے بادشہ کو خدا"
بجانا شروع کیا۔ ہم جب محل کے دروازہ میں داخل ہو رہے تھے تو ہم نے بینڈ کو احترام
کی نظر سے دیکھا تھا۔ یہ بہت ہی بوڑھے آدمیوں پر مشتمل تھا جن کی ڈراؤنی فوجی مونچھیں
چمکتے ہوئے حنائی خضاب سے رنگی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس پانچ مشکی باجے تھے۔
ایک بوق اور ایک بڑا ڈھول تھا۔ یہ موسیقی کی کونسی قسم سے ہمیں مسحور کرنا چاہتے
تھے؟ مجھے اس کے معلوم کرنے کے لئے کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ تھا "سلامت
رکھے بادشہ کو خدا" جس میں سے انھوں نے چوتھے تال کا نصف اور آخری تال
کو پورا ہی محو کر کے ترمیم کر لی تھی۔

وہ بینڈ بجاتے رہے اور قریب تھا کہ ہم گر پڑیں، آہ کر بیٹھیں، اور ہمارے
لبوں پر وہ پھیکی مسکراہٹ کھیلنے لگے جو قومی ترانہ کے بے موقع پیش کئے جانے
کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے، کہ بینڈ موقوف ہو گیا۔ ہم نے جلدی سے پھر "تیار باش"
کی حالت پر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ایک مرتبہ پھر بینڈ شروع ہوا اور پھر انھوں
نے چوتھے پال کا نصف اور آخری تال مکمل اڑا دیا۔ آخر میں ڈھول کا ایک دور
بجا۔ ابکی تو ہم ضرور گر پڑے ہوتے، ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہمارے چہروں پر آ گئی
...... لیکن اس کے بعد پھر یہ نہیں ہوا۔ واقعۃً یہ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ میں
ایک پیر پر کرسی کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ اور کیا میں دیر تک اسی طرح کھڑا رہ سکونگا
یہ امر مشکوک تھا۔ غالباً والی سوات نے میری پریشانی کو محسوس کر لیا۔ کیونکہ تیسرے

دورکے بعد انھوں نے دیوار پر نظر ڈالی ـــــ کم از کم معلوم یہی ہوا کہ دیوار پر نظر ڈالی اور گویا ان کی دھکتی ہوئی نظریں اینٹوں کی دیوار کو توڑ کر گزر گئیں، اور بینڈ بند ہو گیا۔

اب اتار چڑھاؤ دیکھئے:

یہ بات مشہور تھی کہ والی صاحب ہفتہ میں صرف چار مرتبہ کھانا کھاتے ہیں اور آج ان کے نہ کھانے والے دنوں میں سے ایک دن تھا۔ مہمان نوازی کے چند رسمی جلوں کے بعد وہ تشریف لے گئے، اور ہم ان کے صاحبزادہ اور وزیر اعظم کے ساتھ دن کے کھانے پر جا بیٹھے

دن کا بقیہ حصہ میرے لئے تکلیف کا آہستہ آہستہ بڑھنے والا ایک تمر تھا مجھے میلوں تک دیہاتوں میں موٹر پر دوڑایا گیا۔ پل دکھائے گئے، انتظام آب رسانی دکھایا گیا، ہسپتال دکھایا گیا ـــــ اور یہ سب کا سب دھندلا اور غیر واضح معلوم ہوتا تھا۔ سوات کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اس اجمال کے باوجود جس میں ہم نے اسے دیکھا، ہم یہاں سے نظم وضبط، ثبات عقل وحواس اور مسترت وخوش حالی کا زبردست اثر اپنے ساتھ لائے۔

اب ہم پھر وہیں واپس آجاتے ہیں جہاں سے ہم نے ابتدا کی تھی کہ کالی پہاڑیوں کے تلے ایک چھوٹے سے قلعہ میں ہم ڈاکٹر کا انتظار کر رہے ہیں۔

میرا پہلا ہندوستانی ڈاکٹر . . . . وہ آرہا ہے۔ کیا تم تین جھولتی ہوئی روشنیوں کو پہاڑی کے اوپر آتے ہوئے دیکھ رہے ہو؟ یہ جلتی ہوئی انگیٹھیاں ہیں جن میں ڈاکٹر اپنے اوزاروں کو تپاتا ہے۔ روشنی قریب سے قریب تر آرہی ہے، اور جیسے یہ روشنی بردار پہاڑی راستہ پر قدم دھر رہے ہیں میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ وہ ڈاکہ ڈالنے کے لئے ابتدائی کھوج۔ لینے گئے تھے

چھوٹی اطالوی مہم پسند پارٹی کے یہ پورے قزاق ہیں ـــــــ حالانکہ نوجوان ہندوستانی ڈاکٹر کو قزاقی یا مہم پسندی سے دور کا واسطہ بھی نہیں، وہ ایک چست اُستادِ فن اور سُبک دست آدمی ہے، ایسا کہ ہارلے اِسٹریٹ میں بھی ایک خوش قسمت آدمی ثابت ہو سکتا ہے. وہ اتنا ہی کرتا ہے جتنا وہ کر سکتا ہے. اُس نے مجھے مطلع کر دیا کہ اگر میں آئندہ بھی دو پیروں والا آدمی رہنا چاہتا ہوں تو علی الصباح مجھے ہسپتال میں واپس چلا جانا چاہیئے،

لہٰذا اب ہم ہسپتال کو واپس چلے جائیں گے۔

پانچواں باب

بستر علالت پر تجربات

اوّلین ہندوستانی ہسپتال میں جو اوّلین حقیقت مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ہر پینسٹھ ہزار ہندوستانی کے لئے صرف ایک تربیت یافتہ نرس ہے۔

آبادی کے اعتبار سے یہ اعداد ایسے ہیں کہ گویا دو سو نرسیں پورے قلمرو کنیڈا کے لئے ہوں۔ اور اگر کینڈا ابھی دور معلوم ہو تو یوں سمجھیئے کہ گویا برائٹن اتنے بڑے شہر کے لئے کل دو نرسیں ہیں۔

اور دوسری بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ صرف شہر پشاور میں (۶۰،۰۰۰) دق کے مریض پائے جاتے ہیں۔ کاتب نے غلطی سے صفر نہیں لگا دیئے ہیں، اتنے ہی صفر ہیں جتنے کہ حقیقتاً ہونے چاہئیں، یہ عدد ساٹھ ہزار ہے۔ اب اگر ان بدنصیب مریضوں میں سے ہر دس کے لئے صرف ایک نرس مقرر کیجائے تو سارے ہندوستان کی نرسیں ایک ہی شہر پشاور میں مطلوب ہوں گی۔ اور پشاور کچھ ایسا بڑا شہر بھی نہیں ہے۔

یہ اعداد جب میں رات کو لیٹا تو میرے دماغ کی سطح پر ناچ رہے تھے۔ میں چھت پر پڑنے والے سایہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ ایک نرس اور پینسٹھ ہزار انسانوں کے لئے پینسٹھ ہزار آدمی نرس! نرس!!

پکار رہے ہیں۔ مجھے کراہیت ہو رہی تھی بلکہ ایک عجیب طرح کی ذلّت سی محسوس ہوتی تھی کہ اگر پینسٹھ ہزار ایک نرس کے محتاج ہیں تو میرے جیسے ایک مریض کو دو دو نرسوں کی توجہات کا مرکز بنے رہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ مجھے ایک ایسی گھنٹی کے قریب پڑے رہنے سے شرم آتی تھی جو کسی نرس کو بلائے۔ اس کو جیسے پینسٹھ ہزار آدمی درد اور دکھ میں تڑپ تڑپ کر بلا رہے ہوں۔

دُکھ میں تنہائی کی ان راتوں میں جھلملاتی ہوئی پرچھائیوں کے تلے غور کرتا رہا کہ ہر فلسفہ کی ابتدا، دکھ کی طرف واضح توجہ کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ دکھ آخری فیصلہ کن حقیقت ہے، دُکھ صحیح ترین امتحان ہے اور وائلڈ ———— نے جب یہ لکھا کہ ہر بچہ اور ہر ستارہ کی پیدائش کے ساتھ دکھ موجود رہے، تو غلط نہیں لکھا۔

دکھ سیاست کاروں کی رات دن کی دُھن ہونی چاہیئے۔ دکھ ہر راستہ کی ابتدا و انتہا پر موجود رہے۔ جب ہم جنگ و صلح کے پلّے برابر کرنے لگیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سپاہیوں کا دکھ ہے اور اسی طرح موازنہ مرتب کریں تو بھوک کا دکھ یاد رکھیں۔ ان کے باوجود سیاست کی روغیر شخصیت پسند ہوتی ہے۔ ہم رجسٹروں اور حسابوں میں اتنے بے صبری کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں کہ ہمیں یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ اُن اعداد و شمار کے پیچھے انسانی چہرے بھی ہیں۔ ویلر فورس ———— سے کینس ———— تک اور ڈکنس ———— سے بیوریج ———— تک بہت سے مدارج ہیں۔

یہ مثل خصوصیت کے ساتھ ہندوستان پر صادق آتی ہے۔ ہندوستان کے ہر مربع میل میں دنیا کے ہر حصہ سے زیادہ دُکھ ہی دکھ ہے، لیکن اُن کا خیال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی آنکھوں سے نیند نہیں اُڑاتا۔ غالباً یہ صریح سنگدلی بڑی

حد تک ہندو عقیدۂ کرم کی وجہ سے ہے۔ اگر تم ایک بچے کو دکھ اٹھاتے ہوئے دیکھو اور یہ عقیدہ رکھو کہ یہ اپنے پچھلے جنم کے کئے ہوئے برے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے، تو تمھیں کیوں رحم آنے لگا۔ ہندو فلسفہ میں رحم کی گنجائش بہت ہی کم ہے۔

میں پھر انسانی توجہات کو ہندوستان کے دکھوں کی طرف مبذول کراتا ہوں، یہ دکھ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ یہ سوال بہرحال قابل توجہ ہے کہ سڑک پر کھڑا ہوا کوئی بچہ کیوں آہ و نالہ کر رہا ہے، یقیناً اس کے نالہ و شیون کے پیچھے کوئی بدترین معاشرتی خرابی کام کر رہی ہے ـــــــ افسوس! لوگ ہندوستان میں دکھ کی طرف بہت ہی کم متوجہ ہوتے ہیں، اور اگر ہوتے بھی ہیں تو صرف اس قدر کہ درد دکھ کا وجود بالواسطہ یا بلا واسطہ ان کے سیاسی چوکھٹے میں ٹھیک بیٹھ جائے ـــــــ دکھ اور مصیبت چاہے کسی شکل میں پائی جائے اس کی ذمہ داری بہرحال برٹش راج پر ہے؟ جب ہم آزاد ہو جائیں گے تو یہ ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ میری تمنا ہے کہ میں ان سے صرف اس قدر عرض کرتا کہ "لوگ آخر آزاد ممالک میں بھی بیمار پڑتے ہی ہیں۔"

ان دو امور پر غور کیجئے جن کا ذکر میں نے اس باب کی ابتدا میں کیا ہے، اول نرسوں کی کمی اور دوم مرض دق کا آسمانی عذاب۔

ایک کانگریسی پروپیگنڈسٹ ان افسوسناک حقائق کا ذمہ دار بھی برطانیہ کو قرار دے گا۔ وہ کہے گا کہ تم یہاں ڈیڑھ سو سال سے ہو تم نے اس سلسلہ میں کیا کیا؟

بہت خوب! ہم کیا کر سکے، اور کیا اس سلسلہ میں کر سکتے ہیں؟

نرس بننے کو ہندوستانی خواتین کی اکثریت عیب سمجھتی ہے وہ سمجھتی ہیں کہ مریضوں اور مجروحین کی خدمت گزاری سے ذلیل ہو جائیں گی۔ عہد وکٹوریہ

کا رکھ رکھاؤ جس کے خلاف فلورنس نائٹنگل نے علم جہاد بلند کیا تھا۔ ذات پات کے اس نظام کے مقابلہ میں جو ہندو عورت کی سرشت میں ہے اور آج بھی اس کے دل و دماغ پر حکمرانی کر رہا ہے۔ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ حق تو یہ ہے کہ ہندوستان اب بھی مسز گمپ کے عہد سے گزر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نرسوں کی اس چھوٹی جماعت میں بھی اینگلو انڈین لڑکیوں کا تناسب بہت زیادہ ہے اور ان میں سے اکثر مذہباً عیسائی ہیں۔ ان لڑکیوں کو اکثر مواقع پر جس تحقیر اور ذلت آمیز سلوک کا نشانہ بننا پڑتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ انھیں کسی مریض کی خدمت کے لئے اس کے گھر جانا پڑے۔ ایک نہایت شائستہ اور ذہین لڑکی نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک جگہ اس سے بھنگیوں کے ساتھ کھانا کھانے کی امید کی گئی اور اس کا مریض مانع تعفن ادویہ سے دھوئے جانے کے بعد ہمیشہ اصرار کرتا تھا کہ نرس کے چھونے سے جو ناپاکی ہو گئی ہے اسے رفع کرنے کے لئے پھر دوبارہ غسل کرے۔

اگر ہندوستان میں صرف پینسٹھ ہزار نرسیں ہیں تو اس میں برطانوی عورت کا کیا قصور ہے، ہندوستان بھر میں کل برطانوی عورتوں کی تعداد پینسٹھ ہزار نہ آج ہے اور نہ کبھی تھی، صرف نرسیں اتنی کہاں سے ہوتیں۔

ہاں! اور دق کے ساٹھ ہزار مریض؟

غور کیجئے! ان میں آدھے مریض تو ان اسباب و وجوہ کی بنا پر اس مرض میں مبتلا ہوئے جن پر برطانیہ کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا ——— ایک پردہ ہی کو لیجئے ——— آپ پشاور کی سڑکوں پر مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک گھوم آیئے، ایک بھی زنانہ چہرہ آپ کو نظر نہ آئے گا جو دو چار عورتیں آپ کو ملیں گی وہ سرتاپا کپڑوں سے ڈھکی ہوں گی۔ آنکھوں

کے لئے دو ننھے ننھے سوراخ اور منہ کے لئے پردہ میں اِک ذرا سا شگاف بس یہ ہے تازہ ہوا کے حصول کا ذریعہ۔

میرے وارڈ کا ڈاکٹر کہتا تھا کہ اگر کوئی شخص کوشش کرتا کہ جراثیم کی پرورش کے لئے ایک مناسب ترین لباس تیار کرے تو غالباً پردہ سے زیادہ مناسبت تر لباس نہ بنا سکتا۔ ہم پردہ کی مخالفت تو برس ہا برس سے کر رہے ہیں لیکن اس ڈر سے کہ کہیں لوگوں کے نازک مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہنچے کھلے بندوں اس کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مذہب، ہر گھڑی مذہب، ترقی سے برسرپیکار، کبھی جراحی کے کمرہ کی کھڑکیوں کو بند کر رہا ہے، دواخانہ کی بوتلوں سے وہمی اور خیالی تکرار میں مبتلا ہے غرض کچھ ہی دنوں کے بعد میں یہ محسوس کرنے لگا کہ میں ایک جدید وضع کے ہسپتال کی بجائے ایک قسم کے مجانین کی خانقاہ میں ہوں۔

ایک دوشنبہ کی صبح کو میری نرس نے مجھ سے کہا کہ متصلہ عمارت کے ایک وارڈ میں ہنگامہ بپا ہے۔ ایک لڑکی ہے سخت قسم کے اپنڈیسائٹس کی مریضہ اس کا فوراً اپریشن ہونا چاہیئے، مگر چہارشنبہ تک اپریشن نہیں ہو سکتا۔

کیوں نہیں ہو سکتا؟

کیوں کہ کل سبتھ دن نہیں ہے، اور چہارشنبہ تک وہ مر چکی ہوگی۔

دوسرے دن اس نے کہا "لیجئے! یہ ایک اور ہنگامہ"

آج کیا ہوا؟

ایک چھوٹا لڑکا ابھی ابھی ہسپتال میں آیا ہے، اس کے اٹھارہ رشتہ دار ہیں، اور سب کے سب اس کے قریب ہی سونے پر اصرار کر رہے ہیں۔

اٹھارہ!

جی ہاں، اٹھارہ، ماں باپ، دادا دادی، پھوپھی، چچا، بھائی بہنیں اور چچیرے بھائی۔ اور ان سب پر اضافہ تین شیرخوار بچے جو چیخ و پکار سے آسمان کو سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور مریض لڑکے کو ضرورت ہے مکمل سکون کی۔

تم ان سب کو نکال کیوں نہیں دیتیں؟

ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک سے بھی باہر چلے جانے کی درخواست کریں تو وہ لڑکے کو یہاں سے لے کر چلے جائیں گے اور لڑکا کل صبح سے پہلے مر جائے گا ——— لڑکا بیچارہ تو اس چیخ و پکار میں بہرحال مر ہی جائے گا۔

بتائیے! اس قسم کے معاملات کو سلجھانے کا مشورہ ہمیں کیونکر دیا جا سکتا ہے؟ ہندو مشترک خاندانوں کا طریقہ کچھ ہم نے تو پیدا نہیں کیا! اور اگر ہم کسی دم اس طریقہ کو ختم کرتے ہوئے پائے جائیں تو یوں سمجھئے کہ آسمان ہی پھٹ پڑیگا بیس یا اس سے بھی زیادہ افراد خاندان ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کرتے ہوئے ہندوستان میں عام طور پر ملتے ہیں۔ یہی وہ نسلی اتحاد ہے جس کے ذریعہ ہندو قانون باپ، ماں، بیٹا، پوتا اور بیٹیوں، اور پوتیوں کو کھانے میں پوجا پاٹ میں اور جائیدادوں میں باہم مشترک رکھتا ہے[1]۔

اتنا اضافہ اور ہونا چاہیئے کہ ہسپتال کی مہم میں بھی یہ اشتراک باقی رہتا ہے۔

جب میں اس قابل ہوا کہ مریضوں کی کرسی پر بیٹھ کر ادھر ادھر جا سکوں تو دوسرے مریضوں کے کمروں میں جانے لگا۔ ان میں سے اکثر کمروں کو میں نے چھوٹا سا پاگل خانہ پایا۔ فرش کا ہر انچ مریض کے خاندانی

---

[1] انڈیا مصنفہ ٹی۔ اے رامن (آکسفورڈ پریس)

افراد سے بھرا ہوا تھا۔ بڈھے ڈھچر سے لے کر رونے اور چلانے والے شیر خوار بچے تک سب ہی موجود تھے۔ کمرہ کے ایک گوشہ میں کچھ لوگ چاول پکا رہے تھے دوسری طرف کچھ عورتیں ساڑیاں دھو رہی تھیں، اور وسط میں بے چارا مریض پژمردہ، پریشان حال سانسوں کے ذریعہ طرح طرح کے جراثیم کی ایک بڑی مقدار فرو حلق کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں انسانوں کے اس بھیڑ میں راستہ بناتی ہوئی نرس آتی اور مریض کے منہ میں تھرمامیٹر رکھنے سے پہلے اسے مانع تعفن محلول میں ڈبوتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کا یہ سارا فعل ایک قسم کا طنز ہو۔

۳.

میری عیادت کے لئے لوگ متواتر آتے رہے۔ مسلمان، ہندو، اور سکھ سب ہی آئے، لیکن ...... اب جو میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی "ہندوستانی" نہ تھا۔

شمالی مشرقی صوبہ میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے۔ فرقہ دارانہ جذبات کی شدت کو میں پہلی مرتبہ پوری طرح سمجھ سکا۔ اس وقت تک یہ چیز ایک علمی مسئلہ معلوم ہوتا تھا۔ ایسا مسئلہ جو کتابوں میں پڑھا جا سکتا ہے لیکن اب یکایک یہ نہایت واضح حقیقت بن گیا۔ یکے با دیگرے مسلمان میری چارپائی پر جھکے اور ہر ایک نے قابل نفرت ہندوؤں کے خلاف شعلے برسائے۔

ہندو مت ایک گندگی ہے، ایک مشہور مسلمان نے مجھ سے دہلی میں کہا تھا۔ ہندو مت ایک نجاست ہے اس نے بہت سے واقعات بھی سنائے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہندو مت ایک سماجی روگ ہے۔ اس نے خصوصیت کے ساتھ اپنے ایک اسمبلی کے ساتھی مسٹر کرشنا چاری

کے خلاف سخت سُست کہا تھا۔ اس نے بیان کیا تھا کہ ایک بار مسٹر کرشنا چاری نے اعلان کیا کہ گاندھی جی ہندوؤں کے لئے خدا سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس مشہور مسلمان نے کہا تھا کہ کسی انگریز کے لئے اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ اس قسم کا اعلان مسلمانوں کیلئے کس قدر تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔

اگرچہ یہ شخص اسمبلی کا ایک مشہور ممبر اور قابل لحاظ حدتک ذمہ دار شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے جب اس کے یہ خیالات سنے تھے تو خیال کر لیا تھا کہ اس قدر تلخی گفتار ایک استثنائی صورت ہے، غالباً اس میں شخصی مخالفت کام کر رہی ہوگی۔ اس لئے میں نے اس گفتگو کو تقریباً بھلا دیا تھا۔

* میرے پاس آنے والے مسلمان مجھ پر ہندوں سے اپنا گہرا اختلاف واضح کرنے کے لئے پر جوش اور بے چین نظر آتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ:-

"تم عوام تک پہنچ سکتے ہو، اور انگلستان کے عوام تک مسلمانوں کے دعاوی کبھی نہیں پہنچ سکتے، ہم غریب ہیں، ہم پروپیگنڈا پر لاکھوں روپیہ صرف نہیں کر سکتے"

مجھے دیکھنے کے لئے اولین آنے والوں میں قابل تعظیم بزرگ ملک خدا بخش بھی تھے، ملک صاحب ایڈوکیٹ جنرل اور یجسلیٹو کونسل میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک حزب الاختلاف کے لیڈر رہے ہیں انھوں نے مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا، یہ حقیقت فراموش نہ کیجئے کہ مسلمان اور ہندو صرف مذہب ہی میں مختلف نہیں بلکہ یہ دو مختلف کلچر ہیں۔ یہ ہے قابل غور نکتہ، ان کا چہرہ تبسم سے چمک اُٹھا۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا۔ خدا ہر جگہ ہے درخت اس شخص کو سایہ دینے سے انکار نہیں کرتا جو اس درخت کے وجود کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

ملک صاحب پاکستانی خیالات نہیں رکھتے، اور نہ انھیں اسلام کی سیاسی وحدت کا یقین ہے لیکن پھر بھی انھیں اصرار ہے کہ مسلمان بالکلیہ ایک دوسری قسم کے انسان ہیں۔ زبان کے مسئلہ میں ملک صاحب خصوصیت کے ساتھ شدید اللہجہ تھے، انھوں نے کہا کہ:-

ہندو اردو کو ہٹا کر ہندوستانی کو اس کی جگہ بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اردو بڑی سخت جان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ لفظ اردو کیا معنی رکھتا ہے؟ اس لفظ کے معنی ہیں، لشکر گاہ یا یہ ایک لشکر ہے جس پر ہندوستانی کبھی فتح نہیں پا سکتی۔

دوسرے ممتاز ملاقاتی جو اول الذکر سے بالکل ہی مختلف عقائد رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خاں صاحب تھے، یہ صاحب صوبہ کی کانگریسی وزارت میں جس نے ۱۹۳۷ء میں عہدے سنبھالے تھے وزیر اعظم کا عہدہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کی شہرت کی سب سے بڑی بنیاد یہ ہے کہ عبد الغفار خاں کے بھائی ہیں جو سرحدی گاندھی کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ ان بھائی صاحب کی افادیت بہت ہی شاندار رہی۔ آپ اپنے ڈیل ڈول میں خاصے دوبیکر ہیں، آپ مسلمان ہیں اور سپاہی بھی ہیں، لیکن آپ گاندھی جی کے ہاتھوں میں ایسے کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں کہ اب عدم تشدد کے چیلا بن گئے، اور اپنے اس اعتقاد کو اپنے "لال کرتی" ——— پیروؤں کے دلوں میں بھی راسخ کر دیا ہے۔ "لال کرتی" کی تنظیم جیسا کہ خود اس کے نام میں مضمر ہے بہت سے فاشستی تصورات رکھتی ہے۔

جب ان کے بھائی صاحب مجھے دیکھنے آئے تو سرحدی گاندھی جی جیل میں تھے۔ ان کی تشریف آوری سے میں کسی قدر ممنون و متحیر ہوا ———

ڈاکٹر صاحب سراپا اخلاق تھے۔ بہرحال، جب انھوں نے گفتگو شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے متضاد خیال پرستیوں کے کیچڑ میں پھنسکر فوراً ہی اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔

آپ ایک بار گاندھی جی کے مخالف صنعت پروگرام کی تعریف کرتے رہے، اصول عدم تشدد کو عالم جدید کے لئے عملی پالیسی کے طور پر پیش فرماتے رہے، اور یہ بھی بتاتے رہے کہ جب تک اہل برطانیہ ہندوستان کو چھوڑ کر چلے نہیں جاتے ہندو مسلم اختلاف کو بیخ و بن سے مکمل طور پر اکھاڑ کر نہیں پھینکا جا سکتا، لیکن فوراً دوسرے لمحہ میں آپ نے نہرو کے صنعتی پروگرام کی تعریف شروع کر دی، آپ نے اس حقیقت پر بھی ٹیسوئے بہائے کہ ہندوستان کو پوری طرح مسلح نہیں کیا گیا ہے، آپ نے مجھے بہت سے ایسے قصے بھی سنائے جن میں ہندو مسلم اختلاف آفتاب کی طرح نمایاں تھا، اور آخر میں آپ نے اپنی گفتگو اس مشورہ پر ختم کی کہ ہندوستان کے دکھ درد کا علاج صرف اشتراکیت ہے۔

جب ڈاکٹر خاں صاحب مجھ سے رخصت ہونے کے لئے اٹھے تو مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ ان کا مقصد کیا ہے اور حقیقتاً ان کے خیالات کیا ہیں؟ اس کا کوئی دھندلا سے دھندلا خاکہ بھی میرے دماغ میں نہیں آسکا۔ انھوں نے ایک دلفریب تبسم کے ساتھ فرمایا۔ کوئی حرج نہیں ہم ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کو تیار تو ہوں گے، مگر یہ بھی ممکن نہیں، تم دھوئیں کی چادر سے دور کیسے ہو سکتے ہو صرف یہ ہو سکتا ہے کہ تم اس چادر میں گم ہو جاؤ اور بس۔

جب وہ جا چکے تو میرے معالجین میں سے ایک ڈاکٹر میرے پاس آیا اور اس نے کہا۔ ارے تمہارا بخار تو بڑھ گیا، کس کی غلطی سے بڑھا؟ میں نے کہا ڈاکٹر خان صاحب کی۔ وہ اگرچہ ایک خوشگوار شخصیت ہیں لیکن

کسی قدر رتھکا دینے والے آدمی ہیں۔

میں نے اس کے بعد کہا، خصوصیت کے ساتھ فرقہ واری معاملات کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ ہم (انگریزوں) نے فرقہ وارانہ خیالات کو بڑھایا، اور دوسرے ہی سانس سے وہ مجھے ایسی کہانیاں بھی سنا گئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے اس معاملہ میں کچھ کیا ہی نہیں۔

ڈاکٹر نے کہا کہ میں تمہیں ایک اور قصہ سناتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے وزیر اعظم ہوتے ہی پشاور میں بڑے زور کا فساد و ہنگامہ ہو گیا، پہلی شام کو چھ آدمی مارے گئے اور ایک درجن بری طرح زخمی ہوئے، حالات نہایت خراب نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے مجروحین کے علاج کے لئے کسے بھیجا تھا؟ ایک برطانوی ڈاکٹر کو، کیوں؟ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ برطانوی ڈاکٹر اس لئے بھیجا گیا کہ ڈاکٹر خان صاحب ہندو یا مسلمان ڈاکٹر سے زیادہ انگریز ڈاکٹر پر بھروسہ کرتے تھے۔ ایک مجروح مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ ہندو ڈاکٹر اس کا گلا کاٹ دے گا، اور اسی طرح ایک ہندو مجروح مسلمان ڈاکٹر کے متعلق خیال کرتا ہے۔ لیکن یہ دونوں انگریز ڈاکٹر پر بھروسہ کر سکتے ہیں کیونکہ انگریز مذہب کا چاہے کچھ بھی ہو، ذرہ برابر لحاظ نہیں کرے گا۔

اس قصہ سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب ہنگاموں میں زیادہ اچھی طرح سوچ سکتے ہیں۔ اگر یہ اتنے زیادہ باتونی نہ ہوتے تو شاید اچھے لیڈر ثابت ہوتے۔ بہرحال! اتنا تو مجھے اقرار ہے کہ ان کی گفتگو کے دوران میں ان کی موشگافیوں اور سخن طرازیوں نے میری صحت پر ناقابل برداشت اثر ڈالا اور یہی موشگافی ہے جو تمام حامیاں کانگریس کو

بڑی عزیز ہے۔

۴

ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہا۔ ان میں سے اکثر مسلمان تھے، اور تقریباً سب ہی بری طرح ہندوؤں کے خلاف جذبات رکھتے تھے۔ ہندوؤں سے ان کی یہ نفرت کچھ سیاسی وجوہ کی بنا پر نہ تھی، اسی طرح یہ بھی واضح تھا کہ اس کا سبب معاشی بھی نہ تھا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان مسلمانوں کو ہندوؤں سے طبعاً سخت نفرت ہے، اور یہ نفرت ان کے دلوں میں پوری طرح راسخ ہے۔
اگرچہ ان کے سامنے پاکستان کا کوئی واضح نقشہ نہ تھا مگر پھر بھی آنے والے ملاقاتیوں میں سے اکثر پاکستان کے موئدین تھے۔ میں نے جب ان سے کہا کہ ہندوستان کے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانے سے مسلمانوں کیلئے معاشی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ تو انھوں نے کہا کہ:-

"یہ ہمارا اندرونی مسئلہ ہے کہ ہم مفلس ہو کر زندہ رہیں گے یا دولتمند ہو کر، اوروں کو اس کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

جب ان سے سوال کیا گیا کہ وہ کس طرح اپنے سرحدوں کو محفوظ رکھ سکیں گے تو یہ ہنس پڑے اور انھوں نے کہا کہ:-

جنوبی سرحد یعنی ہندوستان کی سرحد کا معاملہ ہم نہایت آسانی سے نبٹ لیں گے، رہی شمالی سرحد تو یہ شاہی ذمہ داری ہے؟

مجھ سے ملاقات کرنے والے مسلمانوں نے ہندو فلسفہ کی ابتری

مجھ پر واضح کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ایک شخص نے مجھے لکشمی دیوی (ہندوؤں کے ہاں دولت کی دیوی) کے متعلق بتایا، اور ان مراسم کا ذکر کیا جو ہر سال روپیہ کی پوجا کے لئے ہوتے ہیں، ایک دوسرے شخص نے جو کشمیر سے آیا تھا مجھ سے بیان کیا کہ اس کے کسی دوست کو ساری عمر کی جلا وطنی کی سزا اس لئے دی گئی کہ ایک بار اتفاقی طور پر اس سے گاؤکشی کا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ دنوں پہلے تک اس جرم کی سزا موت تھی۔

انھوں نے گائے کا پیشاب پینے سے لے کر لڑکوں کے مندروں میں جا کر لنگ پوجا تک ہندوؤں کے بے شمار رسم و رواج پر لعنتیں کیں، انتہا یہ کہ ایک دن شام کے وقت ایک ہونہار بیرسٹر اور ریاست دان نے جن کا نام لے کر میں انھیں بدنام کرنا نہیں چاہتا میرے سامنے ہندوؤں کے ہر طور طریقہ کو اتنی شدت اور اتنے کرخت لب و لہجہ میں برا بھلا کہنا شروع کیا کہ مجبوراً مجھے اس سلسلہ کو ختم کرنے کی درخواست کرنی پڑی۔

...... بہت اچھا میں کچھ نہیں کہتا۔ میں ایک کتاب آپ کے پاس بھیج رہا ہوں آپ اس میں سے صرف ایک ورق مطالعہ فرمائیں۔

.... کون سی کتاب۔ ۔ مور ٹیمپس ایپروڈ۔

مصنفہ مارک ٹوئن۔

——— مارک ٹوئن کو ہندو مذہب کے متعلق کچھ کہنے کی کیا بنیاد مل گئی ہے؟

——— یہ مطالعہ سے خود معلوم ہو جائے گا۔ کیا آپ بنارس جا رہے ہیں؟

—— امید تو ہے۔

—— بہت خوب! میں کتاب کا جو حصہ آپ کو مطالعہ کرنے کو کہہ رہا ہوں وہ بنارس ہی کے متعلق ہے، وہ بنارس جو ہندوؤں کا مقدس ترین مقام ہے۔ کتاب کا یہ حصہ ہندوؤں کے اس عقیدہ سے متعلق ہے کہ جو ہندو گنگا کے دوسرے کنارہ پر مرتا ہے وہ ایک ...... کی شکل میں جنم لیتا ہے، لیکن نہیں، آپ خود اس کتاب کو پڑھ لیجئے۔

کتاب اسی شب مجھے مل گئی، مارک ٹوین کی غالباً یہ ایک ہی کتاب تھی جو میرے مطالعہ سے اب تک نہ گزری تھی۔ ابتدا کے چند فقرے واضح مگر مشتبہ اور مستند بیان کا درجہ رکھتے تھے، ایک سرمئی صبح کی طرح، لیکن ہمیں اولاً اس کے وہ فقرے پڑھنا ہیں جو ہندو مذہب سے متعلق ہیں۔

ان فقروں کو پڑھتے ہوئے یہ یاد رکھئے کہ یہ ایک بہت بڑے امریکی فاضل کے جملے ہیں جو اپنے پڑوسیوں سے محبت بھی رکھتا ہے اور جس کے دل میں خدا کا خوف بھی موجود ہے۔

"بنارس میں لوگ تم سے کہیں گے اگر کوئی جاتری گنگا کے پار دوسری طرف چلا جائے، اور وہیں اس کی موت آجائے تو فوراً اسے ایک گدھے کے جون میں دوسرا جنم دیدیا جاتا ہے۔ ذرا غور کرو اتنی زحمتوں اور اتنے اخراجات کے بعد، یہ نتیجہ! تم دیکھتے ہو کہ ہندو گدھا بن جانے سے طفلانہ انداز میں بے وجہ نفرت کرتا ہے اس کی کیا وجہ ہے، معلوم نہیں۔ قاعدہ کی بات تو یہ ہے کہ گدھا بھی لازماً ہندو ہو جانے سے نفرت کرتا ہی ہوگا۔

گدھا اگر ہندو ہوجائے تو اپنا ذاتی وقار، اعزازِ نفس اور اپنی ذہانت کا $\frac{9}{10}$ حصہ کھو دے گا۔ بخلاف اس کے ہندو گدھا بن کر ـــــ حقیقتاً کچھ بھی نہیں کھوتا۔ لے دے کے اگر تم اس کے مذہب کو قابلِ شمار سمجھو، تو یہ ضرور ختم ہوجاتا ہے۔ بلکہ ہندو بہت کچھ حاصل کرلیتا ہے گدھا بن کر وہ بیس لاکھ دیوتاؤں، اور دو کروڑ مذہبی رہنماؤں اور بھکاریوں سے نجات پا جاتا ہے۔ اسے مقدس دریوزہ گروں اور واجب التعظیم جونکوں سے چھٹی مل جاتی ہے وہ ہندو جہنم سے بچ جاتا ہے ہندو جنت سے چھوٹ جاتا ہے ـــــ یہ ہیں وہ فوائد جن کا لحاظ کرنا چاہیئے، اور ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ گنگا کے دوسرے کنارے پر جائیں اور وہیں مرجائیں۔

یقیناً یہ ایک حیرت ناک بات تھی کہ امریکہ کی ایک قدیم کتاب نے جس کے کاغذ امتدادِ زمانہ سے پیلے پڑ گئے تھے مجھے حیران کردیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا جدید ہندوستان پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ مارک ٹوین کا چاہے جو بھی زمانہ رہا ہو۔ لیکن اس کے مندرجہ بالا بیان کا کوئی زمانہ نہیں، یہ آج بھی جدید ہے۔ باوجودیکہ یہ بظاہر مذاق ہے مگر اس سے روح پر پژمردگی سی چھا جاتی ہے۔ اس دیہاتی مزاج نگار نے صرف ایک بار نقاب الٹا اور ایک ایسا چہرہ دکھایا جو عبوس بھی ہے اور ہولناک بھی۔

"وہ ہندو جہنم سے بچ جاتا، ہندو جنت سے چھوٹ

جاتا ہے۔

ہندو جہنم کیا ہے، اور ہندو جنت کیا ہے؟

یہ تھے وہ سوالات جو آئندہ کے پروردہ ہفتہ میں۔ میں اپنے آپ سے کرتا رہا۔ تم اس کا جواب دوسرے حصہ میں پاؤ گے۔

حصّہ دوم

پہلا باب

ہندو مت پر تحقیقی نظر

تمہیدی اشارات

یقیناً یہ باب دلوں میں گرانی پیدا کرے گا۔ اس لیے چند تمہیدی کلمات ناگزیر ہیں۔

یہ ہندو مذہب پر تنقید و تبصرہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ ان سارے ہندو مذاہب، ہندو فلسفوں، ہندوانہ تہذیبوں پر تنقید ہے جو ہندو مت کے نام کے جھنڈوں کے تلے صف آرا ہیں۔ اس حد تک اس کی تردید تو ایک مضحکہ خیز حرکت ہے۔ لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں کہ ہندوستانی اخلاق اور ہندوستانی اقوام پر بیجا حملہ کیا جائے۔

اس کتاب میں رنگ کے تعصب کا کوئی عنصر کارفرما نہیں، نفسیاتی

روحانی اور تمدنی اعتبار سے میں نے ان امتیازات سے قطع نظر کر لیا ہے میرے خیال میں کوئی بلندی ایسی نہیں ہے جہاں تک ہندوستانیوں کی رسائی نہ ہو سکتی ہو۔ بلندی سے میری مراد اس کے لاطینی مفہوم کے مطابق نیکی اور سیرت کی بلندیاں ہیں۔ جن میں ذہنی رفعت بھی شامل ہے۔ ہندوستان ٹیگور اور جگدیش چندر بوس کی سی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ اپنے ویبر فورسمس ــــــ فلارنس نائٹنگیلس ــــــ اور مقدس باپ ڈیمینس ــــــ جیسی ہستیاں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ہندوستان کی خاص کمزوری ایسے بے نفس اشخاص کی کمی ہے جن کے نام تاریخ مغرب کی زینت ہیں۔ اس کا باعث ہندوستانی فطرت کی کوئی محرومی نہیں۔ بلکہ ہندو مذہب کا ہلاکت آفریں اثر ہے۔ ہندومت کا اصلی منبع (اس حال میں نہیں جیسا کہ وہ اس وقت ہے بلکہ اس حال میں جیسا کہ وہ کبھی رہا ہوگا، خواہ وہ کچھ بھی رہا ہو) تو بلور کے مانند صاف اور شفاف رہا ہوگا اور روحانیت کی بلند چوٹیوں سے جاری ہوا تھا۔ لیکن صدیوں سے وہ گندگیوں سے آلودہ ہوتا چلا گیا۔ یہانتک کہ آج وہ وسیع لیکن گندہ اور آلودہ چشمہ ہے۔ جو پست اور غیر صحت بخش وادیوں سے گزر رہا ہے۔ ان کثیر صاحب ذوق، صداقت شعار، بے نفس ہندوستانیوں میں سے جن سے میری ملاقات ہوئی، شاید ہی بمشکل کوئی ایک آدھ ہوگا۔ جسے پکا اور مخلص ہندو کہا جا سکے تقریباً سب کے سب نے اس گندگی سے جو اس وقت ہے اپنے آپ کو مبرا قرار دیا۔ یہ بات شاید کسی لحاظ سے بھی برطانوی اثر کی مرہون منت نہ ہوگی اگرچہ کہ برطانوی افراد سے وہ حسن سلوک پر حامل تھے۔ لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر پکے قوم پرست تھے۔ نہ وہ عیسائیت کی طرف کسی میلان کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

اور وہ ایک مذہب کو ترک کرکے دوسرے مذہب کے اختیار کرنے کے لئے مضطر و بے چین بھی نہیں دکھائی دیتے۔ اس کا سبب صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبعاً قلب سلیم رکھتے ہیں۔ خدا کی طرف سے انھیں حسن باطن ملا ہے اور خدا کبھی اپنی رحمت سے قلب سلیم بھی دیتا ہے۔ چونکہ ایسے لوگوں سے میری دوستی ہے۔ اس لئے اس باب کا لکھنا میرے لئے خاص طور پر تکلیف دہ ہے ممکن ہی نہیں بلکہ اغلب ہے کہ اسے ایک قوم پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ درحقیقت [1] اس قوم کے احوال واقعی کی تشریح ہے۔ اگر یہ کسی ہندوستانی کو عصر حاضر کے عیسائی کی کمزوریاں بے نقاب کرنے پر ابھارے تو چشم ما روشن دل ما شاد یہ ہمارے لئے عین بصیرت و عبرت کا باعث ہوگا۔

مذہبی تذکرہ کے بغیر ہندوستان پر کوئی کتاب درحقیقت ہندوستان سے متعلق کتاب ہی نہیں کہی جاسکتی۔ یہ بے لاگ بیان ان اصحاب کے لئے

---

[1] ناظرین خیال رکھیں کہ اس کتاب کے اس حصہ میں لفظ ہندوستان سے مراد "ہندو ہندوستان ہے" اس علاقہ کی کثیر آبادی ہندو ہے۔ ۲۸ کروڑ ہندو، دس کروڑ مسلمان اور صرف چار کروڑ دوسرے مذاہب کے پیرو یہاں آباد ہیں۔ اگرچہ ہندومت اور اسلام میں فرق بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ دن اور رات میں۔ لیکن پھر بھی ہندومت کی یہ عجیب خاصیت ہے کہ وہ اپنے قریب آنیوالے ہر مسلک پر کچھ نہ کچھ اپنا رنگ چڑھا دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہوگی جیسے کسی ہندو جنگل میں کوئی مسلم عبادت گاہ ہو اور آہستہ آہستہ وہ اس جنگل سے بالکل گھر جائے صرف کمال باخبری اور ہوشمندی ہی سے اس کی حفاظت و بقاء ممکن ہے۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں یہی حادثہ پیش آیا ہے کہ اسلام کے سادہ اور صاف خط و خال، صدیوں کے ہندو اثرات سے مسخ و محرف ہو گئے ہیں (مصنف)

نہایت سنسنی خیز ہوگا۔ جنھوں نے اس ملک کی بابت اس نئی اور نوجوان تعلیم یافتہ پود کو دیکھکر اپنی رائے قائم کی ہے۔ جو مغربی اسٹیج پر نہایت آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ نوجوان اپنے عقیدوں کا وضاحت کے ساتھ اظہار نہیں کرتے انکی گفتگو نرم، مانوس اور بڑی حد تک لاادریت کا رنگ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ ہندوستان کی روحانی امامت و پیشوائی کے بلند بانگ دعوی کی تردید نہیں کرتے۔ (کیونکہ یہ ایک تحسین آفریں پروپگنڈا ہے خصوصاً چکاگو کے نسوانی کلب میں) وہ ہندوستان کی افسانوی روحانیت و مذہبیت کی ہوا باندھتے ہیں۔ یہ سب کچھ افسانۂ ماضی ہے۔ اب بادل چھٹ چکے ہیں مطلع صاف ہوگیا ہے قربان گاہ کی خوشبوئیں رفوچکر ہوچکی ہیں۔ اور اب تو یہ نوجوان اس پر بھی آمادہ دکھائی دیتے ہیں کہ مندروں سے متصل ہی بلدیہ کی طرف سے پیراکی کے حوض بنا دیئے جائیں۔

اپنے طور پر تو بہت ممکن ہے یہ بالکل سچے ہوں۔ کثیر خام کار نمائندگان جرائد جو کسی مسافر و زائر اہل قلم سے ملاقات کے لئے آ دھمکتے ہیں قطعاً کوئی مذہب نہیں رکھتے لیکن اس حقیقت کے اظہار میں ناگواری بھی محسوس کرتے ہیں۔

اگر آپ ان سے سوال کریں کہ بھئیا یہ کیوں؟ تو اس بابت میں وہ گاندھی جی کی اندھی تقلید جواب میں پیش کرتے ہیں۔ اور گاندھی جی نے گائے پوجنے کا بار ہا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سوال پر یہ لوگ آپ کو ایک بے تکا اور بے ڈھب سا آدمی تصور کریں گے۔ یقیناً آپ بڑے ہی بے ڈھب آدمی ہیں کیونکہ آپ نے ہندوستانی سیاست کی دکھتی رگ پکڑلی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندو نوجوان فیکٹری، ورکشاپ کا رخ کرتا ہے لیکن ان کا لیڈر انھیں مندر کی طرف کھینچتا

چاہتا ہے۔
یہ بھی ایک سوال ہے کہ ایسے لاادری نوجوان اس جزیرہ نما میں کتنے ہیں
۳۴ کروڑ ہندوستانی تو ناخواندہ ہیں۔ لہذا وہ کس شمار و قطار میں ہیں بلاخوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ گنتی کے پڑھے لکھوں میں صرف بڑے بڑے شہروں
میں بود و باش رکھنے والے ہی مغربی اثرات کے تحت اپنے آبائی عقائد و
تصورات کا جوا گردن سے اتار چکے ہیں۔ بڑے ہی کھلے دل سے شمار کرنے
کے باوجود ایسے مذہب بیزار شاید چند ہزار سے زائد نہ نکلیں گے۔ باقی
کروڑوں باشندے اصنام کے قدموں پر سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔
اس باب میں ہندوستان ہی کی گواہی اور توثیق قبول کیجئے۔ ذیل میں
ہندوستان کے ایک فاضل محقق ڈی۔ پی۔ مکرجی پروفیسر جامعہ لکھنؤ کی تشخیص
ملاحظہ ہو:۔

"اُمیدواران امتحان اپنے جوابات اور راہلکار و
دوکاندار اپنے کاموں کا آغاز اپنے اپنے محبوب دیوتاؤں کی
یاد سے کرتے ہیں۔ امتحانات میں امتیاز، ملازمت میں ترقی
تجارت میں گرم بازاری سب کچھ خدا کی عنایت اور مذہبی
اوتار کے وسیلہ ہی سے ممکن الحصول ہے۔ مسٹر گاندھی سے
زیادہ کوئی لیڈر الہام کا منتظر دکھائی نہیں دیتا۔"

"نہ اس باب میں کسی کی اس قدر تحسین کی جاتی ہے۔ نہ کوئی اور سیاست
و مذہب کا ادنیٰ سے ادنیٰ معاملات میں اس درجہ مبالغہ آمیز اختلاط کرتا ہے
ہندوستان میں کسی ماہر عمرانیات کی توہم پرستوں کے آگے ایک نہیں چلتی کبھی
غیر دینی مابعد الطبعیاتی مکتب کی یہاں کبھی کوئی وقعت قائم ہوئی اور نہ

ہو سکتی ہے۔[1]"

اگرچہ یہ ایک قدیم بحث ہے مگر یہ ایک نیا موضوع بھی ہے۔ ان صدہا اہلِ قلم میں سے جنھوں نے ہندوستان کی مذہبیت پر بہت زور دیا ہے مجھے ایک بھی ایسا نہیں یاد آتا جس نے عہد جدید میں اس مذہبیت کے مضمرات پر بھی جرأت سے گفتگو کی ہو۔ جس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہو کہ اب بھی اس سال ۱۹۴۴ء میں یہ رہبانیت اور یہ مذہبی عصبیت کس طرح فن جراحی میں داخل ہو جاتی ہے کمروں کے دستوں کو پھیر دیتی ہے، صنعت کے پہیوں کو متحرک کرتی ہے بلکہ اپنی انتہائی شدت پسند صورت میں ایک زندہ اور طوفانی طاقت ہے۔ اس کی آواز فیکٹریوں اور دربار شاہیوں کے ہنگاموں پر غالب آجاتی ہے۔ وہ مجالس وضع قوانین پر بھی چھایا ہوا ہے اور طلبا کی انجمنوں پر بھی۔

یہ بہت ہی ضروری ہے کہ دنیا اس حقیقت کو جان لے اور اس کے مضمرات کو اچھی طرح محسوس کرے۔ ذیل کے صفحات ان چند لوگوں ہی کی امداد کی ایک کوشش ہے جو اس حقیقت کو جاننا اور اس کے مضمرات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے مباحث کو تین حصوں میں تقسیم کرلیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

پہلے ہم ہندومت کا ایک واضح نقشہ معلوم کریں۔ دوسرا حصہ یہ ہے کہ ۱۹۴۴ء کے ہندوستان میں جہاں تک ہندومت ایک زندہ اور اثر انداز طاقت ہے۔ ان حدود کو واضح کیا جائے۔ تیسرے مرتبہ میں ضروری ہے کہ ہم ان تمام قرین قیاس ردِّعمل کا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کریں جو تیزی سے سمٹتی جانے والی موجودہ دنیا میں اس قوت سے ہوگا۔

---

[1] ماڈرن انڈین کلچر (مصنفہ ڈی۔ پی۔ مکرجی (انڈیا پبلشرز الہ آباد ۱۹۴۲ء)

۲

میں حوالہ جات اور مذہبی کتب نصاب سے دو پہاڑوں کی خاموش فضاء میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ کتابیں میرے پاس ہوتیں بھی تو میں انہیں کچھ زیادہ مفید نہ پاتا۔ فی الجملہ ہندو مذہب کی تعریف اور تعئین ممکن نہیں۔ کیونکہ ہندومت ہراس، خوف، خواب اور پرچھائیں کا معجون مرکب ہے جس کا کبھی ذہن انسانی کے پیچیدہ اور گھنے جنگل میں گزر ہوا تھا۔

ہندو مذہب میں کوئی کلیسا نہیں۔ اس میں کوئی پوپ نہیں اس کی کوئی ایک بائبل نہیں۔ بلاشبہ اس میں قدیم نوشتوں، گیتوں اور خرافات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ جنہیں بائبل کا قائم مقام کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی مرکزی اور آخری کتاب نہیں جسے اس کثیر ناقابل عبور ذخیرۂ آثار قدیمہ کی تحقیق تردید اور توثیق کے لئے فیصلہ کن معیار و استناد قرار دیا جا سکے۔ یہ آپ کی پسند پر ہے کہ جس پر چاہیں ایمان لائیں اور جس کا چاہیں انکار کریں[1]۔

---

[1] میرے خیال میں ہندو بائبل کا تصور شاید بھگوت گیتا سے متعلق ہو سکے یہ ایک روحانی جمال کی اہم کتاب ہے۔ حیات باطن کا کوئی طالب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ افسانوی روایت کے مطابق یہ سری کرشن جی کا خطاب ہے کورکشیترا کی جنگ میں لیکن اس کی تصنیف کی اصل حقیقت افق تاریخ کی تاریکی میں گم ہے۔ ممکن ہے اس کی تصنیف میں مختلف اصحاب کا حصہ ہو۔ اس کی خاص تعلیم یہ ہے کہ حقیقی علم کا حصول اپنے باطن ہی میں ممکن ہے۔ یہ بیک وقت ہندو مذہب کا قوی پہلو بھی ہے اور ضعیف بھی۔ (مصنف)

ہندو مذہب میں صرف ایک ہی اُصول ہے جس پر آپ کو اپنے قلب اور اپنی روح کے ساتھ یقین رکھنا چاہیئے یہ ہے ذات پات کا نظام یعنی آپکو اس کا کامل ایقان ہونا چاہیئے کہ آپ کے چھ کروڑ ساتھی اچھوت ہیں۔ آپکو ایمان رکھنا چاہیئے کہ اگر آپ خاص خاص غذائیں کھالیں تو آپ نکمے اور ناپاک ہو جائیں گے۔ اسی طرح کچھ لوگ ہیں جن کے ساتھ آپ کچھ کھا پی لیں تو آپ مردود بارگاہِ خداوندی ہو جائیں گے ذات پات کا امتیاز ہندو جہاز کا لنگر ہے۔ اگر اس کے لئے اس لنگر کا سہارا نہ ہوتا تو زیادہ محکم اور مضبوط ادیان سے ٹکرا کر یہ جہاز پاش پاش ہو گیا ہوتا۔

یہ کہنا شاید غیر ضروری ہے کہ ذات پات اور چھوت، چھات کی پابندی نہایت مختصر پیرایہ میں اس جمہوریت کے بالکل منافی ہے، جس کے لئے ہندو اس قدر شور مچاتے ہیں۔

نہ کوئی چرچ، نہ کوئی بائبل، نہ کوئی پوپ، اور سب سے بڑھ کر نہ کوئی تاریخ۔

ہندو مذہب دنیا کے بڑے مذاہب میں ایک ہی ہے جس کی قطعاً کوئی تاریخی بنیاد نہیں بہتیرے ایسے مورخ ہیں جو حضرت مسیح علیہ السّلام کی الوہیّت کا انکار کرتے ہیں لیکن ایسا کوئی شاذونادر ہی ہوگا جس نے آپ کے تاریخی وجود ہی سے سرے سے انکار کیا ہو۔

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وجود پر تو تاریخی شہادتوں کا ایک سلسلہ ہے[1] اس سے کم تر ہی سہی لیکن مہاتما بدھ کے وجود کی تاریخ

---

[1] (از مترجم) حضرت مسیح کی نسبت کتنے سوالات ہیں جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے۔

بھی موجود ہے۔ رہا ہندو صنم کدہ تو یہ تمام تر تخیلات اور تمثیلات کے بتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس بتکدہ میں کسی ایسے نبی کی تصویر تلاش کرنا بے سود ہے جس نے بشر کی حیثیت سے تعلیم و تبلیغ کے فرائض انجام دیے ہوں[1]۔

یہاں اوہام کے سیاہ بادلوں میں ایک گنیش جی ہیں جن کا سر ہاتھی کا اور سواری چوہے کی ہے۔ ایک طرف سری کرشن جی ہیں جو اپنے پانچ یا سات ہاتھوں سے بانسری بجانے میں محو ہیں۔ دوسری طرف فنا کے دیوتا شیو جی کا ہیبتناک چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ پھر اندرا اور ورونا کے دیوتا اجسام ہیں جو بارش اور پانی کے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے ہیں ہندو دیوتا۔ ان کے معبود اور مسجود ہونے کی حیثیت پر بحث کرنا غیر متعلق سی بات ہے۔ یہاں ہمارا مقصود کلام صرف یہ بتانا ہے کہ یہ لوگ انسانی اور تاریخی وجود نہیں نہیں رکھتے۔ تاریخی اور واقعاتی پس منظر کا یہ مکمل فقدان ہے جس نے ہندو مذہب کو ایک غیر واضح، غیر متعین اور مبہم چیز بنا دیا ہے۔

(بقیہ بر صفحہ گزشتہ) لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے۔ یہاں دھندلا پن نہیں ہے۔ ہم تاریخ رکھتے ہیں۔ کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے نہ دوسرے کو۔ . . . یہاں دوپہر دن کی روشنی ہے۔

با سورۃ اسمتھ (محمد اینڈ محمڈن ازم ص ۱۴-۱۵ ۱۸۸۹ء) خطبات مدراس ص ۶۹)

[1] "بے سود تلاش" کہنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ ہندو صنمیات میں ہمیں کوئی ایسی تاریخی اور حقیقی شخصیت نہیں ملتی جس نے عقائد اور اصول کو کوئی مستقل عملی صورت بخشی ہو۔ بلکہ ایسی تاریخی شخصیتیں بھی نہیں ملتیں جنہوں نے کم از کم سینٹ پال کی طرح تفسیر و تعبیر کا کام انجام دیا ہو۔ ہر چند بعد کو شرح نویسوں اور حکماء کی ایک

۳

سلب ونفی ـــــــ محض سلب ونفی ـــــــ یہ بتائیے کہ ہندومت کیا ہے؟ یہ نہ کہیئے کہ وہ کیا نہیں ہے۔

بیچارہ پڑھنے والا ایسی مداخلت پر حق بجانب سمجھا جائیگا۔ لیکن ہندومت تو ایک بتخانہ ہے گھنے جنگل میں گھرا ہوا۔ خود رو روحانی درختوں نے اسے ایسا اور اسی زمانہ سے گھیر لیا ہے کہ جب، کہ ابھی اس کا کوئی واضح خاکہ بھی نمایاں نہ ہونے پایا تھا۔

اب دنیا کی عظیم ترین سلبی حقیقت ہمارے سامنے ہے۔ بے شک اس طرح ایجابی بحث سے ہماری نظر بہت دور ہٹ جاتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے یہ ناگزیر ہے۔ اگر ہم ہندوستان کے مذہبی منظر کو صحیح طور پر دیکھنا چاہیں تو نظر کے لیئے اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔

ہندومت عیسائیت نہیں ہے!

اس بیان پر ممکن ہے قارئین تعجب و تحقیر کا اظہار کریں اور کوئی کہہ اٹھے یہ کون سی بیان کے قابل بات ہے۔ یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ ہندومت عیسائیت نہیں ہے۔ اس کو ہر شخص جانتا ہے۔

لیکن واقعہ یہی ہے کہ ہر شخص اس حقیقت سے کما حقہٗ آگاہ نہیں ہے مغرب میں ہزاروں غیر معین اور غیر واضح تصور رکھنے والے مرد اور عورتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۲) بڑی تعداد ملتی ہے لیکن ان میں ہر شخص اپنا جداگانہ مستقل مسلک رکھتا ہے۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ (مصنف)

ہیں جو نہایت مبہم طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب ایک عام اور مشترک حقیقت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سارے مذاہب (جیسے کہ وہ پائے جاتے ہیں) ایک عظیم حقیقت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ مثلاً ادمن رولینڈ ہی کو لیجئے جس نے اس خیال کے پرچار میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا۔ ان کے نزدیک ہندومت اور عیسائیت ایک ہی جوہر تاباں کی مختلف شعاعیں ہیں۔ یا ایک ہی بحر مطلق کے شفاف پانی کی یہ مختلف دھاریں ہیں۔ ان ہمہ گیر مسلک کے مدعیوں کے پاس سستی تشبیہات اور استعارات کا غالباً ایک بڑا دلچسپ ذخیرہ ہے۔

یہ اصول "فریب سکون" میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایک مشتاق روح کے لئے شاید اطمینان آفریں بھی ہو۔ لیکن اس میں یقیناً ایک بہت بڑی کمی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس پر اندھا دھند ایمان لانے کے لئے انسان کا دینیات اور تاریخ سے قطعاً جاہل ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک طرف تو حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی بالکل سمجھنا نہ چاہیئے۔ دوسری طرف ہندو صنم کدہ اور صنمیات پر نظر بھی نہ ڈالنی چاہیئے۔ جو حق و باطل کی تمیز سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور اپنی آنکھیں بند کرنے اور بند رکھنے ہی پر مائل ہیں۔ ایسے اصحاب کے لئے مذاہب کی یکسانیت اور اضافیت کا نظریہ بہت ہی مناسب ہے۔ اس مفروضہ یکسانیت کا ایک فائدہ شاید یہ ہے کہ یہ ہندوستانیوں سے مختلف ہونے کے ناگوار احساس کو یک سر محو کر دیتا ہے۔

سیدھے اور نیک لوگ اختلاف کا احساس ہی پسند نہیں کرتے۔ اس تصور ہی سے گھبرا اٹھتے ہیں کہ وہ برتر و افضل سمجھے جائیں۔ اگر ہندومت اور مسیحیت ایک ہی حقیقت کے اظہار کی دو مختلف راہیں اور صورتیں ہیں اور ان میں فرق و امتیاز کی کوئی خاص بات نہیں ہے تو یہی مفروضہ سہی

پھر تو ہندو ہو یا عیسائی سب خدا کی جنت میں ہوں گے۔ اس کے بعد دنیا میں ہر تصور اور ہر مسلک ٹھیک ہے۔ ہمیں ان ناگوار سوالات و استفسارات میں نہ پڑنا چاہیئے چلیئے ہم سب کے سب لنچ کھانے کے لئے اسی مسٹک ویجیٹرین ٹیا ورن ——————— میں چلیں جسے ایک دلچسپ عمر رسیدہ تھیوسوفی عورت چلا رہی ہے، گاندھی اور حضرت مسیح کی شباہت پر عجیب وغریب لکھ دیا کرتی ہے۔

بہرحال کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنی آنکھیں بند رکھنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ میں ایسے ہی اصحاب کے لئے یہ بحث قلمبند کر رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے اتنی سطریں بھی درکار نہیں۔ عقلمند را اشارہ کافیست۔ زیادہ نہیں، دور کیوں جایئے۔ صرف دو بتوں اور مجسموں ہی پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ یہی ایک نظر مذاہب کی یکسانیت، مساوات، اور اضافیت کے خیال میں نہایت وزنی شکوک اور شبہات پیدا کرنے کے لئے کافی ثابت ہوگی۔ آیئے ان دو تمثیلات و مجسموں پر ایک غائر نظر ڈالیں۔

صلیب پر حضرت مسیح کی تصویر عیسائیت کا نشان ہے۔ یہ ایک کامل انسان کی تصویر ہے ——— جس نے ——— اگر ہم ان کی الوہیت کا عقیدہ نہ بھی رکھیں تو دنیا کو بہترین کہانی اور بلند ترین لائحۂ عمل عطا کیا۔

اب ہندو مت کا نشان ملاحظہ ہو ——— یا یوں کہیئے کہ اس کے بہت سے پوجے جانے والوں میں ایک اہم دیوتا کا مجسمہ ——— دیکھئے گنیش جی کا مجسمہ ہے ——— نصف آدمی اور نصف ہاتھی۔

آیئے گنیش دیوتا کی ذرا قریب سے جانچ پڑتال کریں۔ گنیش مندر میں میرا پہلی بار داخلہ، مجھ سے کبھی بھلایا نہ جائے گا۔ یہ بنگلور کا واقعہ ہے۔ ہم

ایک مقدس پہاڑی پر مغرب کے وقت پہنچ گئے۔ ہندوستان میں شفق اور غروب آفتاب کا منظر نہایت دلفریب ہوتا ہے۔ سورج کی آخری شعاعیں ایک تھیٹر کا سا ڈرامائی منظر پیش کر رہی تھیں۔ یہ شعاعیں محلاتی اینٹوں کی ایک چھوٹی سی عمارت پر پڑ رہی تھیں۔ اس عمارت میں ایک بھوت دھونی رمائے بیٹھا تھا ـــــ ہمارا منتظر ـــــ یہ ایک ہی چمکدار سیاہ پتھر سے تراشا ہوا تھا۔ اس کی سونڈھ اور اس کے ناتناسب اعضا ایک غضب ناک ناگ کی طرح پیچ و تاب کھائے ہوئے تھے۔ وہ گمنام بت تراش جس نے شاید صدیوں پہلے چٹان سے اس بت کو تراشا ہوگا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شیطان کے ہاتھوں مخبوط شدہ آدمی ہوگا ـــــ یقیناً بڑا ذہین و چالاک لیکن مجسم ابلیس اس لئے کہ اس گنیش میں متعدی اور جارحانہ شر کو مجسم کیا گیا ہے۔ ہلکی سی روشنی میں اس کے اعضا دیرینہ شہوت سے جکڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا سونڈھ کی ایک حرکت پیچیدہ بازوؤں کے ایک اشارہ کے ساتھ وہ اندھیرے میں بھاگ نکلیگا اور مندر کی دیواریں منہدم ہو جائیں گی۔

مسیح علیہ السلام صلیب پر ہیں۔ دنیا کو آخری وصیت کرتے ہیں۔ یہ زریں حروف ہیں "انھیں معاف کر دو کیونکہ انھیں خود اس کا شعور نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں" ـــــ ادھر دیکھیے گنیش جی اپنی غار نما نشست پر کیسے بیٹھے ہیں۔ اپنی سونڈھ کو پیچ دیئے ہوئے ـــــ ایک گاڑی پر سوار جسے ایک چوہا کھینچے لئے جا رہا ہے۔ کیا کسی مجنون کے سوا کوئی سنجیدہ طور پر دعویٰ کر سکتا ہے مساوات مذہب کے حال میں یہ دونوں مجسمے مساوی تحسین اور تعظیم کے مستحق ہیں ـــــ

یہ تو صرف تمثیلات ہیں ـــــ اس لئے نا قابل لحاظ ـــــ ممکن ہے کہ آپ یہی فرمانے لگیں ـــــ "ایک ہی آفتاب دونوں پر ضیا پاشی کر رہا ہے، یہ ربانی آفتاب ہے، بس یہی نقطہ قابل لحاظ ہے اور بس"

یہ گفتگو کس قدر احمقانہ ہے اور کتنی زہرناک۔ تمثیلات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ نہایت نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کچھ شبہ ہو تو آئیے ہندوستان کے ایک ممتاز قائد اور شخصیت کانگریس کے ایک سابق صدر مدراس کے وزیر اعظم اور گاندھی جی کے ایک عزیز قریب ـــــ سی راجہ گوپالاچاری کا بیان سنئے یہ فیل نما دیوتا کے متعلق ان کے تصورات ہیں۔

مغربی لوگ شاید گنیش مورتی میں کسی حسن و جمال کو نہ پاسکیں اور یہ کہہ اٹھیں کہ یہ مورتی تو مضحکہ خیز ہے۔ یہ تو ایک تماشہ کا پتلا ہے۔ لیکن ہندوؤں کے لئے گنیش وحدت کائنات کی ایک تصویر ہے۔ حسن اور بدصورتی کا اجتماع ـــــ ناقابل بیان ـــــ ان کا ایک موٹے آدمی کا جسم ہے اور ایک ہاتھی کا سر اور چوہے کی سواری ـــــ وہ اچھے کھانوں کے بڑے شائق ہیں۔ لیکن وہ کوئی احمق نہیں ہیں جیسے کہ کسی مغربی کا خیال یا ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم ایک نادر اور عجائب قوم ہیں، ہمیں عجائبات عالم ہی کی حیثیت میں رہنے دیجئے۔ یہی میری التجا ہے[1]

یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان اپنے معبود اور مسجود کی طرف سے عذر خواہی

---

[1] ماخوذ از تقریر بہار اشٹر امنڈل۔ مندرجہ اخبار ہندو ۸ ستمبر ۱۹۴۳ء

اور عذر تراشی پر اُتر آئے۔ شاید ہی کبھی مشکل سے کسی کو حضرت مسیحؑ کی طرف سے عذر خواہی کرنی پڑتی ہو اور عجیب تر یہ کہ اپنے معبود کی طرف سے عذر خواہ ہونے پر مجبور ہونے کے باوجود اس کی پوجا اور عبادت جاری رہے۔ راج گوپال چاری کی طرف سے مندرجہ بالا تقریر میں اسی قسم کی عذر خواہی ہے۔ بلاشبہ ہندو ایک عجائب قوم ہے۔

۴

ہم ابھی سلب و نفی ہی میں مبتلا ہیں۔ ہم "ہندومت کیا ہے" کا جواب دینے کی بجائے ابھی تک یہی بتائے جا رہے ہیں کہ ہندومت کیا نہیں ہے۔ لیکن یہ "روحانی خس و خاشاک کو دور کرنے کا شاید سب سے زیادہ قریب کا راستہ ہے تاکہ ہندو مذہب اور اس کے بتکدہ کو اس سے صحیح خط و خال کے ساتھ نمایاں کیا جا سکے۔

ہم نے مسیح علیہ السّلام اور گنیش دیوتا کے مجسموں کا مقابلہ کیا ہے یہ مقابلہ ڈرامائی تھا۔ شاید یہ کہا جائے کہ یہ محض لفظی جادوگری تھی، بے نتیجہ کوئی نقاد شاید یہ کہے کہ ہم بھی اس کے بالمقابل کسی چیز کے لئے مضحکہ خیز طرز بیان اختیار کر سکتے ہیں۔ حضرت مسیح کا کوئی ادنیٰ سا بت لے لیا جائے پھر کاجی ورم کے کسی اعلیٰ درجہ کے بت سے مقابلہ کیا جائے۔ ہم شوق سے اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کی ہماری نگاہوں میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں۔ یہ تو بطور مثال تھا۔ ہمیں دراصل صرف تمثلات ہی سے نہیں بلکہ حقیقی تخیلات اور تصورات سے بحث ہے۔ ان تصورات اور تعلیمات کی تنقید اور تنقیح کا موقع اب آگیا ہے ہمیں یقین ہے کہ اس میدان میں کوئی نقاد ہمیں اپنے محکم موقف سے

نہ ہٹا سکیگا۔

حضرت مسیحؑ کا ارشاد ہے کہ " درخت کو اپنے پھل سے پہچانو " ہم اسی ارشاد کی تعمیل کریں گے۔ ہم ہندومت اور مسیحیت کے پھلوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھیں گے۔ یہ صرف دو تمثیلات کا مقابلہ نہوگا۔ یہ دو نظاموں کی ٹکر ہے۔ یہ دو مختلف عوالم کی جنگ ہے۔ ایسے دو عوالم جو کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔

ہم شاید اپنے دلائل اور مباحث کو اس اختصار اور عمومیت کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں کہ ہر عیسائی مقننہ کے دروازہ پر یہ الفاظ لکھے جا سکتے ہیں۔

عیسائیت آہستہ آہستہ قانونچہ میں داخل ہورہی ہے۔

غالباً یہ لارڈ مولے کی تحریر ہے۔ لکھنے والا کوئی ہو۔ اس کی عمومیت روشن اور درخشاں ہے۔ یہ الفاظ اپنی جامعیت سے متمدن ممالک میں جدید مقننہ کے میلان کو ظاہر کرتا ہے۔ وضع قوانین کا کام اسی نسبت سے ترقی پذیر ہے جس نسبت سے وہ عیسائیت کا اثر قبول کر رہا ہے۔ ہم نے بھی اسی تعمیم کی ایک صورت اختیار کی ہے۔

ہندومت آہستہ آہستہ قانونچہ سے غائب ہو رہا ہے۔

یہ ہندوستان میں جدید وضع قوانین کی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے قانون سازی میں اسی نسبت سے ترقی ہو رہی ہے جس نسبت سے ہندومت ترک کیا جا رہا ہے۔ یہ تقابل نہایت معنی خیز ہے۔ اس کے مضمرات ایسے افسوسناک تفریعات رکھتے ہیں کہ سرسری طور پر مطالعہ کرنے والوں سے درخواست ہے کہ دونوں کلیات پر ایک منٹ کے لئے غور کرلیں اور خود اپنے تجربہ سے اس کے لئے مصداق مہیا کریں اگر قریب تر تاریخ میں بھی نمونے تلاش کریں گے پھر بھی انھیں اس میں کوئی دقت نہ پیش آئے گی۔

: پچھلی صدی میں ہر برطانوی اور امریکی اقدام اور روشنی کی طرف ہر قدم عملی عیسائیت کی طرف ایک اقدام تھا۔ حضرت مسیحؑ نے بچوں کو آسمانی بادشاہت کے مشابہ قرار دیتے ہوئے اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ فیکٹری کے قوانین نے بچوں کو ایک جہنم سے بچا لیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے تعلیم دی کہ سب آدمی بھائی بھائی ہیں غلاموں کی تجارت کا انسداد حضرت مسیحؑ کے نصب العین کو حاصل کرنے کی کم از کم ایک سعی ہے۔ حضرت یسوعؑ نے مریضوں اور ضعیفوں کی خبر گیری کی ہدایت فرمائی۔ انھیں کی ہدایت کی مطابقت میں (اگرچہ ہم کھلے طور پر اس کا اعتراف نہ کریں) ہم نے خیراتی دواخانوں اور ضعیفوں کے وظائف کا ایک نظام جاری کر دیا۔

حضرت مسیحؑ کا ارشاد ہے کہ جو تلوار اٹھائیں گے تلوار ہی سے مارے جائیں گے۔ دنیا نے اس تلخ حقیقت کا مزہ چکھ لیا ہے۔ ہم نے کم از کم ان کے اس حکم کی تعمیل کی اپنی سی کوشش تو کی ہے۔ ہم نے اس شیطان کا مقابلہ کیا ہے۔ اس سے محفوظ رکھنے کی خاطر قلعے تعمیر کئے ہیں، ان قلعوں میں سے ایک کا نام جنیوا ہے۔ وہ تتر بتر ہو کر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اس کے کھنڈر میں بھی عظمت ہے۔ یہ وہ کھنڈر ہیں جن پر حضرت مسیحؑ بغیر افسوس اور رنج کے گزر سکتے ہیں۔

آدمی ترقی کا قدم اٹھا ہی نہیں سکتا سوائے اس کے کہ حضرت مسیحؑ کی طرف رخ کرے وہ پھر انسانی ترقی و عروج کی منزل ہیں جو بلندی اور نور کی طرف اسے پہنچاتی ہے۔[1]

[1] یہ صفات حضرت مسیحؑ سے زیادہ کاملاً پیغمبر اسلامؐ پر صادق آتی ہیں خود عیسائیت بھی تاریخ اور تعلیم کے لحاظ سے ایسی کامل نہیں جیسی کامل و اکمل اسلام کی تعلیمات اور رسولؐ

ہمارے کارنامہ کا خواہ کتنا ہی غیر مسلسل اور مختصر کیوں نہ ہو ہندومت کے کارنامہ سے مقابلہ کرو۔

اگر آدمی کا وضع کیا ہوا کوئی ایسا قانون ہو سکتا ہے۔ جسے حضرت مسیحؑ کی منظوری اور توثیق حاصل ہو سکے تو وہ کمسنی کی شادی کے اِمتناع کا قانون ہے جو اپریل سنہ ۱۹۳۰ء میں کمسنی کی شادی کو تعزیری جرم قرار دینے کے لئے نافذ ہوا۔ یہ قانون ہندومت پر عیسائیت کی فتح و امتیاز کا ایک کھلا ہوا نشان تھا۔ یہ زیادہ تر "مادرِ ہند" نامی کتاب کے پیدا کردہ غلغلہ انگیز احتجاج کا نتیجہ تھا۔ اس کی مصنفہ بھی ایک عیسائی تھی۔ کٹر ہندوؤں کی طرف سے ہندو مذہب کے نام پر اسکی شدید مخالفت کی گئی۔ ہندوؤں کی طرف سے جس مذہبی جوش کے ساتھ کمسنی کی شادی جیسے تباہ کن رسم کی حمایت کی گئی، وہ ایک مغربی آدمی کے لئے حیرت انگیز ہے۔ شاید کسی کو یہ حسنِ ظن ہو کہ یہ قانون ہندومت کے بلند و اعلیٰ عناصر کی بدولت نافذ ہو گیا۔ حاشا و کلّا یہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ ہندو عناصر کی شکست کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ سارے ہندوستان میں عام جلسوں میں اسی قسم کی تجویز منظور کی گئی۔

"آلی ورتی رنگیر کے باشندوں کا یہ جلسہ عام سارواپل (قانون اِمتناع شادی اطفال) کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے کیونکہ یہ دھرم شاستر کے ان بنیادی اصول کے خلاف ہے جو

(بقیہ برصفحہ ۱۲۰) اِسلام کی تا بندگی اور جامعیت ہیں۔ کوئی اور شہادت کیوں ہو۔ انجیل میں خود حضرت مسیحؑ کا اِرشاد ملاحظہ ہو: "مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنا ہیں۔ لیکن تم اب برداشت نہیں کر سکتے۔ جب وہ روحِ حق آئیگا تم کو صداقت و عدالت کی کامل ہدایت کریگا۔" (انجیل یوحنا باب ۱۶۔ آیت ۱۲ و ۱۳) (از مترجم)

ہندو سوسائٹی کی رہنمائی کرتے ہیں ہمیں سخت افسوس ہے کہ
مجالس وضع قوانین، ہندوؤں پر اثر انداز ہونے والے خاص
مذہبی امور میں غیر محدود مداخلت کرتی ہیں۔"

آلی ورتی رنگیر کے باشندے بالکل بجا کہتے ہیں۔ اس قانون نے ان کی مذہبی بنیادیں ہلا دیں۔ جو لوگ عیسائیت اور ہندو مت کو "عمومی مذہب" کے نام سے باہم مخلوط کرنا چاہتے ہیں وہ اس بارے میں کیا حکم لگائیں گے؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی انیسویں صدی میں کسی ایسے قانون کی مخالفت کرتا ہو جو جادوگرنیوں کی سزا کے لئے نافذ ہوتا، صرف اس بنا پر کہ یہ ایسا رواج ہے جسے مسیح کے الفاظ کا استناد حاصل ہے۔

شاید کوئی معترض یہ کہے کہ یہ ساری باتیں تو افسانۂ ماضی ہیں تو یہ قول صحیح نہ ہوگا۔ کوئی طویل عرصہ نہیں گزرا۔ سارد ا ایکٹ ابھی قریب کے زمانہ کا قانون ہے ایسے رواج کے افسانۂ ماضی نہ ہونے پر بے شمار دلائل لائے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان کے ایک بڑے خیر اندیش سر ایڈورڈ بلنٹ پرزور لہجہ میں کہتے ہیں۔

" شادی کے رواج میں اصلاح کرنیوالے مصلحین کو
ہمیشہ پکے ہندوؤں کے ہاتھوں شکست ہوئی سارد ا ایکٹ
کو تقریباً بے اثر کر دیا گیا۔

(دیکھو سوشل سروس ان انڈیا مولفہ اڈورڈ بلنٹ)

یہی خود بنارس کے "ہنومان مندر" میں موجود تھا۔ لڑکیوں کی ایک قطار لگ جاتی جو مشکل ہی سے بارہ برس سے زائد عمر کی ہونگی یہ مورتیوں کی برکت حاصل کرنے کے لئے لائی جاتی ہیں تاکہ ان میں بلوغ کی تازگی جلد پیدا ہو۔ ان کے چہرے بے وقت کے ازدواجی تعلقات کے باعث وحشت زدہ تھے۔ اور ان کے بدن

مارے شرم کے سمٹے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ ابھی انھوں نے مادری فرائض انجام نہیں دیئے تھے۔ میں نے ایسی ہی کمسن لڑکیاں کلکتہ کے کالی مندر میں بھی دیکھی ہیں جو اپنے لمبے لمبے کالے بالوں سے کچھ بال کتر کر ناگ پھنی کی مقدس شاخوں میں لپیٹ دیتی تھیں۔ اور اس اثنا میں برہمن پجاری ان کے حمل کی عجلت کے لئے منتر پڑھتے رہتے۔

کیا یہ عہد کہن کے افسانے ہیں؟

اگر عملاً یہ امور افسانہ ماضی ہوتے (واقعتاً وہ نہیں ہیں) پھر بھی یہ عقیدے کے اعتبار سے حقیقت حال ہے۔ مقدس نوشتے، قدیم روایات برہمن شاستر یہ سب ان اصلاحات کے خلاف ہیں۔ ہندو مذہب میں تجدید و اصلاح کا تصور ناقابل قیاس ہے۔ اگر آپ ہندو مذہب کی اصلاح کسی جزو میں شروع کریں تو آپ کو محسوس ہوتا جائے گا کہ اس میں کوئی جزو ایسا نہیں جو قابل اصلاح نہ ہو۔

پھر بھی، اس کا اعتراف ضروری ہے کہ الحمد للہ اب کسی قدر صورت حال بہتر ہے۔ شاید دس فیصد اندھیرا چھٹ رہا ہے اگرچہ بہت سست رفتار سے۔

۵

ہندو مت آہستہ آہستہ قانونچہ سے غائب ہو رہا ہے۔

ستی، ٹھگی[1]، قتل اولاد، اور کمسنی کی شادی، جبریہ بیوگی ـــــ یہ سب کے سب دھرم شاستر کے اجزا تھے۔ یہ سب کے سب منسوخ اور موقوف کر دیئے گئے

[1] ٹھگ، پیشہ ور مذہبی خونی لٹیرے تھے۔ یہ کالی دیوی کے پجاری تھے اور اپنے

ہیں۔ کم ازکم کاغذی عمل تو یہی ہے۔ اور وہ بھی عیسائی اہل برطانیہ کے ہاتھوں۔ ہندوؤں کی طرف سے ہندو مذہب و دھرم کے نام پر ان قوانین کی تنسیخ کی شدید مخالفت ہوئی ـــــ وہ مذہب و دھرم جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جہاں سے عیسائیت ظہور میں آئی۔

یہی حال دیو داسی طائفہ کا تھا۔ یہ دراصل مندروں کی کسبیاں ہیں۔ یہ طفلی ہی سے پجاریوں اور زائرین کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ اب ان کی تعداد پہلے کی طرح کثیر نہیں ہے۔ اب وہ بڑے بڑے شہروں سے ہٹا دی گئی ہیں، خاص طور پر جنگ کے بعد سے جس کے باعث یہ شہر امریکی سپاہیوں سے معمور ہو گئے ہیں۔ کانگریس کے لئے یہ کوئی مفید پروپگنڈا نہیں ہے کہ بِل واکی کے نوجوان اپنے گھر کو خطوط لکھنے میں ہندو دھرم کے خالص ہونے کا ذکر کریں۔ یہ ایک روحانیت کا ادعا رکھنے والی قوم کے لئے شرمناک ہے۔ جس کا یہ خیال ہو کہ انسانیت کے لئے اس کا روحانی پیام برطانوی زنجیروں کی بدولت نہیں پھیل سکا۔ بہرحال ابھی بہ کثرت دیو دسیاں پائی جاتی ہیں۔ آپ معروف مقامات کو چھوڑ کر ذرا غیر معروف مقامات پر جایئے جنوبی ہند کے قلب میں داخل ہو جایئے۔ انھیں آپ مندروں کے اطراف کمروں میں دروازوں کے قریب بیٹھی ہوئی پائیں گے۔ دیو داسی طائفہ کا وجود جدید ہندوستان میں سری رنگم اور تری پتی کے مندروں میں بھی پایا جاتا ہے ان کے بال معطر اور ان کے ناخن رنگین کئے جاتے ہیں۔ زائرین ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ پاؤں گرد آلود ـــــ نگاہیں گرم تلاش۔ ہاتھ میں ایک فرسودہ تھیلی میں ریزگاریاں لئے ہوئے اپنی پسند کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳) قتل و غارت کا ایک حصہ کالی کے چڑھاوے میں دیتے تھے۔

لڑکی کے سامنے وہ ذرا ٹھیر جاتے ہیں۔ اکثر وہ محض کمسن لڑکی ہوتی ہے
اب لڑکی مسکراتی ہے۔ اُٹھ جاتی ہے۔ زائر بھی پیچھے چلتا ہے۔ دروازہ بند ہوتا ہے
دیوتاؤں کی خوشی حاصل کی جاتی ہے۔ برہمن اپنا حصہ پاتا ہے۔

شاید مِل واکی میں ہندوستان کی اس روحانیت کا خیر مقدم نہیں کیا جائے گا۔ اگر ان سب باتوں کی تردید بھی کیجائے جیسا کہ امید ہے تو وہ اپنے بڑے معتبر حامیوں کے مطبوعہ بیانات کی تردید تو نہیں کر سکتے۔ ان بڑے تردید کرنے والوں میں سی۔ ایس رنگا آئر "فادر انڈیا" کے مصنف بھی ہیں۔ پروفیسر رنگا آئر اپنی کتاب کے صفحہ ۱۵ پر بیان کرتے ہیں:-

"نوجوان بچیوں کو مندروں کی مخلوط جماعت میں
داخل کرنا دراصل ان میں مذہب پیدا کرنا اور مذہبی روح
کو بڑھانا ہے تاکہ جب وہ عمر کو پہنچ جائیں تو اس فحش میں
گرفتار نہ ہوں"

گویا ہندوستان کی کسبیاں بڑی خدا ترس اور ثابت قدم ہیں انھیں
بالکل وہ خوف نہیں جو کہ اس بدبخت پیشہ سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔

۶

پس ہندومت کیا ہے؟

صاف بات یہ ہے کہ اس سوال کا کوئی متعین جواب نہیں دیا جا سکتا
وہ سب کچھ ہے ـــــ وہ کچھ بھی نہیں۔
جو کچھ ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ اپنی ابتدائی بنیادوں میں
وہ کوئی صوفیانہ طریق حیات ہوگا ـــــ غیر معمولی اشکال اور تجرد پسند کیا گیا

کی طرح بعض شاہکار کتب میں مرقوم ہیں۔ چونکہ اس کا کوئی تاریخی پس منظر اور استناد نہیں اس لیے کثیر انسانوں کے لئے ناقابل عمل ہی نہیں بلکہ ناقابل فہم بھی ہے۔ لہذا یہ عقل و فہم سے دور ہو کر مسخ ہو گیا۔

ہندو مذہب نے یہاں وہاں، اِدھر اُدھر سے بلکہ یوں کہئیے ہر جگہ سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس نے بے شمار انسانی توہمات کو جمع کیا۔ اس میں کہیں نفسانی خواہشات اور بے لگامی کی تقدیس ہے اور کہیں انسانی جذبات کو الہٰی استناد کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں تک کہ سینکڑوں دیوتاؤں کا ایک جمگھٹا ہو گیا ہے۔ ان میں بعض تو ناقابل اظہار سیرت و اخلاق کے حامل ہیں — حرص و ہوس کے دیوتا۔

جیسے آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے ابی ڈبو بائس نے لکھا ہے۔

" ابتدا میں ہندو سچے خدا کا ایک تصور رکھتے تھے اگرچہ وہ کتنا ہی ناقص رہا ہو۔ یہ علم آہستہ آہستہ غیر واضح ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جہل اور اغلاط کے اندھیروں میں یہ روشنی غائب ہو گئی اور حقیقت بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ذات خالق و مخلوق کے امتیاز میں التباس ہو گیا۔ وہمی اور تخیلی دیوتاؤں نے اُن کی جگہ لی۔ اور اپنا پوجا پاٹ اور اپنی دعائیں انھوں نے انہی سے وابستہ کر دیں۔ یہ فعل ایسا ہی مغالطہ آمیز تھا۔ جیسا کہ وہ صفات جنھیں انھوں نے ان دیوتاؤں سے منسوب کر دیا۔ اور واقعہ یہ بھی ہوا کہ یہ مسخ شدہ رنگ ان کے مذہبی اداروں کی طرح ان کے اجتماعی اخلاق پر بھی چھا گیا۔ اس ملک میں نیکیاں کیا پھول

پھل سکتی ہیں جہاں برائیاں دیوتاؤں کی طرف سے حق
بجانب قرار دیجاتی ہیں"۔
یہ بڑے تلخ الفاظ ہیں۔ لیکن ناقابل تردید۔ ممکن ہے کہ بہت سے
لوگ یہ اعتراض کریں کہ عیسائیت بھی اسی طرح توہمات کا شکار رہے انھیں اس کا
حق ہے لیکن ان کے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ عیسائیت بھی اسی طرح تباہ کن ہے
عیسائی بچوں کو اعضاء تناسل کے بتوں اور مجسموں (یعنی لنگ) کے آگے
سجدہ ریز ہونا سکھایا نہیں جاتا۔ وہ ایسے ذہنی اور خیالی فحشیات کے سایہ میں
جوان نہیں کرتے جنھیں مستور کرنے کا خیال تک کسی ہندو کو نہ آتا ہو۔ عیسائی بچوں
کو اپنے دوسرے بھائیوں سے نفرت کرنا اور اپنے سایہ تک سے بد کنا نہیں
سکھایا جاتا۔
یہ لنگ وغیرہ کے بت ۱۹۴۴ء میں بھی قائم ہیں۔ اچھوت قوم کی مظلومیت
اور پستی بھی ۱۹۴۴ء میں باقی ہے۔ ہندو مت بھی پوری طاقت سے اس
عہد میں جاری ہے۔ یہ ہے مقصود بحث۔ اس لئے دنیا کو اسے قوت کے
ساتھ دفع کرنا چاہیئے۔ چاہے اس کے اثرات کتنے ہی سنسنی خیز کیوں نہ ہوں۔
اگر ہندو مت ایک "جان بلب" عقیدہ ہوتا تو ہم اس کے عملی نتائج کو نظر انداز
کر سکتے۔ لیکن وہ زندگی سے اسی طرح معمور ہے جیسے کوئی جنگل جو خود درندوں
کی پیدائش کا مرکز ہو۔
یہ کوئی خوشگوار بات نہ تھا۔ یہ بھی قطعی واضح ہے کہ ہندو اس سے ناراض
ہوں گے۔ برطانوی حکومت ہند کا ناخوش ہونا بھی ناگزیر ہے۔ یہ ہماری مسلسل
روایاتی پالیسی رہی ہے کہ اپنی رعایا کے مذہبی عقائد وغیرہ کو نہ چھیڑیں ایسے
ہمیں کوئی خسارہ نہیں ہوا۔ سبب بالکل سادہ ہے۔ ایک اوسط برطانوی ملازم

یا پاہی مذہبی مباحث کو پادریوں کے حوالہ کردیتا ہے جنھیں خود یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص عقائد کا بے ضرورت مظاہرہ نہ کیا کریں۔

ہم میں جو لوگ خاص مذہبی میلان رکھتے ہیں اور حضرت مسیح ع کے ظہور کو کائنات کا اہم ترین واقعہ تصوّر کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ عیسائیت نہ صرف حق ہے بلکہ وہ جدید ترین ضروریات کی بھی کفیل ہے، مذہبی مسائل کو زیر بحث جدید مسائل سے خارج نہیں کرسکتے ہیں وہ معیار ہے جو ہمارے لئے قابل قبول ہے۔ اگر یہ معیار دوسرے معیاروں کو ناکارہ ثابت کرتا ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں؟ ہم فضا کو صاف کرنا چاہتے ہیں، ہم روشنی پھیلانا چاہتے ہیں چاہے یہ روشنی ہماری محرومیوں کو بے رحمی کے ساتھ نمایاں کردے۔

مکرّر

آخر میں دوبارہ اس مقصد کو واضح کیا جاتا ہے کہ یہ باب کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہ ایک نظام زندگی پر نقد وجرح ہے۔ یہ کسی قوم پر حملہ نہیں ہے۔ اس امتیاز پر زور دینے کی ضرورت اس لئے داعی ہوئی کہ ایک مسلمان دوست نے جو ان صفحات کے مطالعہ سے ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں، اس طرف پرزور تنقیدی اشارہ کیا۔ انھوں نے فرمایا۔۔۔۔۔۔ کیا آپ کا یہ مفہوم ہے کہ کوئی ہندو اچھا آدمی نہیں ہے؟

جواب قطعاً نفی میں ہے۔

مارنس[1] ــــــــــ میں بھی نیک لوگ ہوئے

---

[1] امریکہ کے ایک مسلک کا نام ہے جس میں شادی کے لئے قانونی معاہدہ یا مذہبی رسوم کی حاجت نہیں سمجھی جاتی بلکہ یہ تعلق صرف باہمی رضامندی پر قائم ہو جاتا ہے۔ (مترجم)

ہیں۔ ملحدین میں بھی نیکوکار پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر شعبۂ
حیات میں ایسے اچھے ہندو افراد، عورت اور مرد پائے
جاتے ہیں۔ جو نہایت نیکدل اور نیک کردار ہیں۔ لیکن وہ
اپنے مذہب کے برخلاف نیک ہیں نہ کہ اپنے مذہب کے
باعث۔

حرف آخر

خلاصۂ کلام دو نکتے ہیں۔

(ا) ایک یہ کہ ہندو مذہب گیتا کی تعبیر کے مطابق نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اس کے مطابق حصول ایک استثنائی حالت ہے اس میں خودی پر کامل تمرکز خیال لازم ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی خودی کو ذات مطلق کے ساتھ واصل کیا جائے۔ لیکن ایک اجتماعی اصلاح و نظام کی قوت کی حیثیت سے یہ کسی شمار و قطار میں نہیں۔

(ب) عام ہندو مذہب جیسا کہ وہ کروڑوں آدمیوں میں سکھایا اور عمل کیا جاتا ہے، بلاشبہ نہایت مسخ شدہ ہے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی تاریخی سند ہے اور نہ کوئی واضح اور متعین اصول

بدھ، عیسائی اور اسلام کے مذاہب کا اس نوعیت کا زوال ناقابل تصور ہے اگرچہ ان کے پیرو کتنے ہی زوال پذیر ہو جائیں۔

چند معینہ اصول ہیں جن پر ایک بدھ، عیسائی اور مسلم کو ایمان لانا پڑتا ہے اس کے برخلاف ہندو جس چیز پر چاہے ایمان لا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو مذہب ایک معجون مرکب بن گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ شہوانی جذبات کو

مشخص کر لیا گیا ہے، ان کے مجسمے بنائے گئے ہیں اور برہمن ذات نے اُن کو
تقدیس بخشی ہے۔ اس میں دیوی دیوتاؤں کا ایک ہجوم ہے جو ایسے ہی وحشت
ناک ہیں جیسے ان کو ظہور میں لانے والے جذبات۔ کسی دن کوئی نفسیاتی تحلیل کا
ماہر ہندو صنم کدے کے بتوں کا جائزہ لے گا تو اس کو ہر محسوس اور معلوم برائی
انسان یا بھوت کی شکل میں مجسم اور مصور ملے گی۔

یہ ہے ہندو مذہب کا اثر اور طاقت جو بنی نوع انسان کے ۱/۵ حصے
پر مستولی ہے۔ اس لئے یہ دنیا کی فوری اور مسلسل توجہ کا مستحق ہے۔

دوسرا باب

لمحۂ سکون

ہندوستان کی جھاڑیوں میں آوارہ گردی نے، واقعات کو تاریخ وار ترتیب میں رکھنے کی ساری کوششیں رائیگاں کردیں۔

ہم کہاں تھے؟ پشاور کے شفاخانہ میں۔ اب کہاں ہیں؟ بمبئی میں اس اثنا میں کانگریسی سیاست کی چڑھی ہوئی گنگا اترنے لگی ہے۔ ہم گو سنبھلے ہیں۔ تاہم پہلے کی بہ نسبت زیادہ دانشمند ہیں۔ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ مصنفین کا دُکھ درد ایسی جنس نہیں جو بازار میں بیچی جاسکے۔ اس لئے صرف اس قدر کہنے پر قناعت کی جائے گی کہ ہندوستانی برسات کے زمانۂ شباب میں دو دفعہ کا مکمل جراحی آدمی کو جلد ہی کسی کام کے قابل نہیں ہونے دیتا۔

گذشتہ باب میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے۔ کئی ماہ تک ذہن و دماغ میں اس کی صورت قائم نہیں ہوئی تھی اب بعد از وقت ہم اس کو سپرد قلم کر رہے ہیں۔ یہ تاثرات سارے ہندوستان میں —— پانڈیچری کے آشرم سے لے کر بنارس کے مندروں تک —— حالات کے مشاہدہ و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ بمبئی میں جہاں اب میں مقیم ہوں میرے خیالات مبہم تھے اور عملاً میں بالکل ناواقف اور پھر اس ناواقفیت پر مسرور بھی تھا۔ ایک متجسس انسان

کے لئے اس کا جہل باعث مسرت اور دوامی محرک ہونا چاہیئے۔ جہل کی محرکانہ صفت ایک ایسے نقشے کے مماثل ہے، جس میں ساحل، دریا، چٹان، وغیرہ کے حدود ظاہر نہ کیے گئے ہوں۔ وہ اپنے آپ سے استفسار کرتا ہے۔

"یہاں فلسفہ کا ایسا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ شکوک اور شبہات کے ایسے پہاڑ ہیں جن کی میں نے سیر نہیں کی ہے۔ اس طرح وہ توجیہ کرتا رہتا ہے اور ان ذہنی وسیع خطہ ہائے اراضی کے تصور سے اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے جو ہنوز محتاج تحقیق ہیں۔

میں ہر شئے کا مشاہدہ اور ہر چیز کا عملی تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا جبکہ میں سہ پہر کے وقت میز کے سہارے سے صرف اس کے اطراف ایک، دو لمحوں کے لئے آہستہ آہستہ چل پھر لیتا تھا۔ اور ہر روز ایک دو قدم آگے بڑھتا تھا۔ پھر وہی درد وہی تکلیف کی شدت!! لیکن سکوت کے اس عالم میں کم از کم ہندوستانی زندگی کے بعض پہلوؤں کی نسبت میرا احساس بہت قوی ہو گیا۔ میری اس حالت کا انہی افراد کو اندازہ ہو سکتا ہے جو کبھی ہفتوں تک بستر علالت پر ایڑیاں رگڑتے رہے ہوں۔

علالت کے بعد صحت اور توانائی کے انتظار میں بستر پر پڑے پڑے ہمیں ضرور کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہیئے۔ اس زمانہ کی ڈائری کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ اگر اس سے کچھ حاصل نہ ہو تو کم سے کم اس مقام اور وقت کا سماں تو نظروں کے سامنے کھینچ جائے گا۔

۴

آوازیں۔ عجیب و غریب آوازیں سن، سن کر میں اپنے دن گزار رہا ہوں۔

نرس اور ڈاکٹر کی روزانہ حاضری سے قطع نظر کیجیئے تو یہی آوازیں زندگی کی صبح و شام کا پیمانہ ہیں۔

بازار میں مختلف چیزیں بیچنے والوں کی آوازیں بہت دلفریب ہیں سب سے زیادہ دلچسپ آئسکریم والے کی پکار ہے۔ اس کے پاس دو ڈنڈے ہیں جن سے "س" اور "ف" کی سی آواز نکلتی ہے، سڑک کے ایک کنارے کھڑے ہو کر وہ ان پٹیوں کو بجاتا ہے سب سے زیادہ غمگین آواز کیک بیچنے والی کی ہے، ابتداً اس کی آواز کچھ بلند ہوتی ہے درمیان میں ایک غیر متوقع سُر کے ساتھ بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے۔ پہلی دفعہ جب میں نے پکار سنی تو خیال گزرا کہ کوئی خاص موقعی آواز ہے ۔ ـــ جس کا زیر و بم کچھ غلط سلط ہے لیکن ـــ نہیں ـــ ہر وقت یہ آواز اسی انداز سے بلند ہوتی ہے۔ اور اس قدر پیچیدہ کہ بڑے سے بڑے ماہر موسیقی کی اُپج بھی اس کا چربہ اُتارنے میں ناکام رہے۔

دقیانوسی آواز بجا طور پر اسی کی ہونی چاہیئے جس کا پیشہ بھی دقیانوسی ہے۔ یہ دُھنیے کی آواز ہے جو لحاف اور توشک کی روئی صاف اور درست کرتا ہے۔ (توشک سے کھٹمل الگ کرنے کا کام بھی اسی سے لیا جاتا ہے۔) اس کا بھدا سا آلہ ہے جس میں ایک ڈوری لگی ہوتی ہے۔ اس سے گہری آواز پیدا ہوتی ہے جب وہ اس ڈوری کو مرتعش کرتا ہے۔ تو دور دور تک

اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔

آواز کے لحاظ سے تو اس کا کوئی جواب نہیں۔ آرکسٹرا کے اوّلین موجدوں کو اس کا علم ہوتا تو یقیناً وہ اس کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے۔ اُس کی آواز گنبد کی گونج کے مشابہ ہے۔ فی الحقیقت کوّے ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہوتے ہیں میرے سوا کوئی ان کی طرف توجہ نہیں کرتا کمبختوں نے مجھے تقریباً پاگل بنا دیا۔ مگر اس کی وحشیانہ شوخی کی خواہ مخواہ تعریف کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ اگر کوّا قطار میں ہو تو کائیں کائیں کرتے اور چونچ مارتے ہوئے اپنا راستہ پیدا کر لیتا ہے۔ صبح سویرے میرے کمرے کے دریچے کے باہر کوّے کرخت آوازیں نکالتے ہیں جب میں اپنے بستر ہی سے دستک دیتا ہوں تو ایک تکلیف دہ آواز میں گویا "جہنم رسید" کہتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے ہیں جب میں تندرست ہو جاؤں تو انھیں بھگا دوں گا۔ تب بھی وہ قریبی ناریل کے درخت پر اڑ کر وہاں سے کائیں کائیں کریں گے۔

۳

پارسی رسوم | میں چند خوبصورت پارسیوں کے پاس مقیم ہوں جنھوں نے ازراہ کرم مجھ پر ترس کھایا ہے اگر انھیں خبر ہوتی کہ میرا کیا لفوا ہوں، نامہ نگاروں، اور نرسوں کا سلسلہ عرصے تک جاری رہے گا تو مجھے مہمان بنانے کی دعوت دینے سے پہلے وہ غور ضرور کر لیتے۔

جیسے ہی یہ اسٹریچر مکان کے کمرہ تک لایا گیا۔ میں نے ایک عجیب وغریب مسرت بخش چیز کا مشاہدہ کیا۔ دروازہ سے گھر کے دونوں جانب چکنے فرش پر چونے کے پھول بنے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں آپ کو گمان ہوگا کہ کسی نے ڈیزی کے پھولوں کا گلدستہ زمین پر گرا دیا ہے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ یہ قدیم پارسی رسم ہے۔

قدیم زمانہ میں چونا جراثیم کش تعدیہ ہے۔ کچھ تو حفظانِ صحت کے خیال سے

اور کچھ بد روحوں کو دور کرنے کے لئے گھر کے سامنے چھڑکا جاتا تھا۔

ہر روز چونے کا سفوف بکھیرا جاتا ہے۔ اور پھولوں کی وضع قطع بدلی جاتی ہے۔ باریک سوراخدار ڈبیوں میں چونا بھر کر یہ پھول بنائے جاتے ہیں فرش پر ڈبیہ اوندھی کر دیجئے، لیجئے پھول بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے ان گنت نمونے ہیں۔ ایک روز مچھلی کی شکل ہے، دوسرے روز پرندہ کے پر یا کسی پھول کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خوبصورت جادوئی حروف کا مجموعہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی ایرانی افسوں یا جنتر ہے جس سے مریضوں کو شفا حاصل ہوتی ہے۔ گھر کی آیا اس افسوں کا اثر روزانہ دیکھے گی کہ یہ اچھا کرتا ہے یا نہیں؟

۴

برسات۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا ہے۔ اس کا ظاہر تو شور انگیز لیکن انجام خوشگوار ہے۔ اگر قدرت نے ہندوستانی برسات کا ریہرسل (مشقی مظاہرہ) کیا ہوتا تو دیکھنے والا فوراً پکار اٹھتا "اس کو بند کرو" یہ اسراف ہے۔ اس پر لوگ ہنس پڑیں گے۔ جب گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں تو حبس کی کیفیت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اب تقاطر شروع ہوتا ہے ایک قطرہ "ٹپکتا" ہے جو آنے والی بارش کا شگون ہے۔ طوفان خیز بارش حیات بخش طغیانی، ابلتے چشموں اور اسی قسم کے باقی سب لوازم کی تمہید ہے۔ جس میں غلہ کے موٹے تازے ہندو تاجروں کا منافع بھی شریک ہے کیونکہ سرمایہ داروں کے لئے کامیاب فصل گویا جوئے بازی کا سامان ہے مجھے برسات کا موسم پسند ہے لیکن یہاں کی برسات بہت شدید ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساتوں آسمانوں میں چھید پڑ گئے ہیں۔ بازار ندیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور انسان اس میں مچھلیوں کی طرح تیرتے دکھائی دیتے ہیں۔

خدمتگار

میں ان سب ملازموں سے مانوس نہیں ہو سکتا جو ہماری منزل
میں مقرر ہیں۔ بٹلر، اس کا مددگار، باورچی، اس کا مددگار، گھر کا
چھوکرا، آیا اور خود میرا خدمتگار حسین ایک چھوٹی سی منزل میں صرف تین کمروں
کے لئے سات نوکر ہیں۔ انگلستان میں اسی نوعیت کے کمروں کا ایک معمولی ملازمہ
پوری باقاعدگی کے ساتھ انتظام کرلیتی ہے۔ یہ بیچارے رات کو عجیب و غریب
مقامات پر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی رات گئے واپس آئے تو اسے اپنے کمرے
میں جانے کے لئے کم سے کم تین آدمیوں کو پھلانگنا پڑتا ہے جو پیش دالان میں
لوٹ پوٹ کرتے ہیں۔ غریب باورچی تو مطبخ کی میز پر دراز ہو جاتا ہے۔ اور آیا
بیچاری بعض وقت کسی کونے میں دبک جاتی ہے۔ ایک دن صبح گھر کا لڑکا
دکھائی نہیں دیا۔ خیال ہوا کہ غائب ہے دوپہر کے کھانے سے کچھ پہلے ایک چھوٹا
سا پاؤں صوفے کے نیچے سے باہر کو نکلا ہوا نظر آیا۔ یہ اسی لڑکے کا پاؤں
ہے جو گہری نیند سو رہا تھا۔ معمہ یہ ہے کہ اتنی ذرا سی جگہ میں وہ کیسے سما گیا؟
کل ہی ایک واقعہ پیش آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک متوسط درجہ کا
ہندوستانی ہندو بھی توہم کا کس طرح شکار ہو جاتا ہے۔ باورچی خانہ میں کام کرنیوالا
لڑکا کسی وجہ سے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پاؤں میں خطرناک
زخم تھا۔ اس رات جب ڈاکٹر صاحب آئے تو میں نے ان کو چھوکرے کے علاج
کی طرف توجہ دلائی۔ کئی ہفتوں سے میں اس کو شفا خانہ بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں
لیکن وہ ہے کہ جانے سے انکار کرتا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بیان کرتا ہے
"پہلا زخم پیپل کے درخت سے گرنے کا نتیجہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پیپل ایک متبرک
درخت ہے اس پر مجھے چڑھنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دیوتا ناراض
ہو گئے اور میں گر پڑا۔ ان کی دی ہوئی سزا سے پہلوتہی کرنا بہت ہی برا ہے۔"

میرے خدمت گار حسین کا اس سے پہلے ہی تعارف ضروری تھا۔ وہ ہر جگہ میرے ساتھ رہتا ہے۔ جب میں چلنے پھرنے سے معذور تھا تو وہ اکثر مجھے لادے لادے پھرتا تھا۔ یہ افغانی ہے جس کا قد چھ فٹ سے زیادہ طویل ہے مختلف النوع لباس پہنا کرتا ہے جس سے دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے میں اس کی ایک بات سے متاثر ہوا جو اس کے سابقہ مالک کے پیشہ کے متعلق میرے استفسار کے جواب میں اس نے کہی تھی۔

میرے دوستوں سے اس کو چڑ سی تھی۔ مثلاً یہاں ایک حسین چینی لڑکی رہتی ہے جو کبھی کبھی بات چیت کرنے کو میرے پاس آتی ہے۔ حسین دشمن کی طرح اس کو گھورتا ہے اور جب میں خاص طور پر اس لڑکی کو بلاتا ہوں تو وہ بری طرح غضبناک ہو جاتا ہے۔

ہر صبح وہ میری طرف دیکھتا ہے اور سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے" صاحب! آپ کو ہندوستان میں بڑی مصیبت ہے۔ لیکن خدا ایک دن ضرور اپنا فضل کرے گا۔"

میں حسین کو بہت زیادہ معاوضہ ادا کرتا ہوں اتنا زیادہ کہ اگر کوئی انگریز مجھ سے معاوضہ کی نسبت سوال کرے تو میں صرف اس کی نصف مقدار بتاتا ہوں۔ یہ میری سخاوت نہیں کمزوری ہے۔ کمزوری اس مفہوم میں کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میرا ملازم صرف اتنی تنخواہ پائے جتنا روزانہ میں اپنے پھولوں کے لئے صرف کرتا ہوں۔

اس سے قطع نظر یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ میں ایثار پسند ہوں شہر میں ایک خدمتگار کی ماہانہ تنخواہ پینتیس روپیہ ہے یعنی ہفتہ میں

تیرہ شلنگ، اسی آمدنی سے اس کو اپنے اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنا پڑتا ہے۔ عزیز و اقارب کو مدد دینی پڑتی ہے۔ دوا دارو اور کچھ تفریح و تفنن کی چیزیں مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ جب میں آجرین سے کہتا ہوں کہ اس کی معاشی زندگی مشکل ہو جائے گی تو غضبناک لہجہ میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ تو ٹکڑوں پر بھی بسر کر سکتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرا ہمسایہ ٹکڑوں پر بسر کرے۔ معاشرہ کے تعلق سے یہ صورت میرے لئے پریشان کن ہے۔

گزشتہ رات میرے ایک دوست کو بلا تحقیق حسین کے معاوضہ کا علم ہو گیا۔ میرے کمرے میں داخل ہو کر انھوں نے مجھے ایک طویل اور غیر ضروری لیکچر پلانا شروع کیا کہ میں بازار کا بھاؤ خراب کر رہا ہوں۔ میں غصہ سے لرزنے لگا۔ ان سے کہا میں خوش ہوں کہ بھاؤ خراب ہو رہا ہے جس قدر جلد یہ بھاؤ بگڑے بہتر ہے۔

ہماری اس بحث میں نرس خلل انداز ہوئی۔ اس نے تھرما میٹر لگایا تو میری "حق پرستی" کی حرارت (۱۰۱) درجہ پہنچی۔

ایک نوجوان ہندوستانی طالب علم تشریف لائے۔ اور کہا اگر میں ہندوستان پر کوئی کتاب لکھوں تو اس میں ایسی فاش غلطیاں نہیں ہونی چاہیئے جیسے لوئس برامفیلڈ کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ غلطیوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست سنائی گئی جس میں سے صرف دو کا ذکر کرتا ہوں۔

"بمبئی میں ایک رات" کے عنوان سے لکھا ہے کہ بندرگاہ کے قریب کشتی میں سیر کرتے ہوئے ان کے ہیرو نے مشرق میں "بلیفنٹا" کے غار اور مغرب میں جوہو دیکھا اتنے بڑے فاصلے سے ان مقامات کو طاقتور دوربین ہی کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے۔

"فلم برسات" میں ایک مہاراجہ کو پگڑی باندھے دیکھا جو ایک معمولی خاکروب ہی باندھ سکتا ہے اور مہارانی ننگے پاؤں جا رہی ہیں۔ یہ تماشا اتنا ہی بعید از قیاس ہے جتنا یہ تصور کہ "امریکین ریولیوشن" کی خواتین کے آگے مسز روز ویلٹ ازار پہنے لیکچر دے رہی ہیں۔

تیسرا باب

اربابِ صحافت

بہت آرام لے چکا۔ وقت آگیا ہے کہ اپنی ملتوی شدہ جد و جہد کو از سرِ نو شروع کروں۔ تعطل کی حالت میں بستر پر پڑے رہنے سے میں جرائد کی توجہ کا مرکز بن گیا ہوں۔ ایک صبح میرے دوست اخبارات لے کر آئے اور کہنے لگے۔ آپ کی نسبت ایسے جلی حروف میں خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ روسی جارحانہ اقدام کی اطلاعیں بھی اتنی نمایاں نہیں ہوتیں آپ کی شخصیت جارحانہ سہی لیکن اتنی نہیں ہے۔ انھوں نے بستر پر رسائل و اخبارات کا بڑا سا پلندہ پھینکا۔ ان سب میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ ہی مضحکہ انگیز خبریں درج تھیں۔

"ہیورلی مکلس کی شخصیت روز بروز معمہ ہوتی جا رہی ہے ———— مکلس اب بھی ساکت ہے ———— وغیرہ"

میرے مشن کے بارے میں افتتاحیے تھے جن میں جی کھول کر تنقیدیں کی گئی تھیں۔ میرے نشان کے اشاروں اور کنایوں سے بھرے ہوئے نکاہات سپردِ قلم کئے گئے تھے، پر جوش مراسلات کے کالم، دو کارٹون اور متعدد تصاویر۔

معمولاً اس قسم کی شہرت تو خوشی کا باعث ہوا کرتی ہے لیکن یہ آج میرے
لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ میرا قصد تھا کہ ایک آزاد محقق کی طرح خاموشی
کے ساتھ ہندوستان کا سفر کروں لیکن یہاں تو ہر قسم کے مسائل پر سوالات
کئے جا رہے تھے۔ اور ان کے جوابات کے لئے ہند و جرائد شور مچا رہے تھے
لیکن میری طرف سے جواب ادا کرنے کی کوشش مصلحت نہ تھی۔ ایک اخبار
میں تصویر دکھاتے ہوئے میرے دوست نے کہا جتنا آپ کے ساتھ کیا جا رہا ہے
اسٹیفورڈ کرپس کے ساتھ اس سے کچھ کم نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ایک نوجوان کی بڑی
تصویر تھی جو بستر پر دراز تھا۔ اور اس کے پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ تصویر کا
عنوان تھا "میرا پاؤں" اس کے نیچے عیارانہ عبارت درج تھی جس سے صاف
معلوم ہوتا تھا کہ یہ تصویر میری ہے۔

یہ وہ اخبار تھا جو کئی دن سے تصویر کا تقاضہ کر رہا تھا: "آپ اس کے
خلاف کیا کرنا چاہتے ہیں؟" میرے دوست نے کہا۔ میں نے جواب دیا کچھ نہیں
انھوں نے کہا۔ مضمون پڑھنے کے بعد شاید اپنی رائے بدل دیں۔ میں نے
مضمون بھی پڑھا۔ فی الحقیقت پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اور اخبار کے خلاف
کارروائی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ اشارۃً نہیں وضاحۃً تحریر کیا گیا تھا کہ
میں حکومت برطانیہ کا کارندہ (ایجنٹ) ہوں۔ میری رائے حکومت کے
اصول و مسلک کی غماز ہے۔ حتیٰ کہ مجھے گفتگو کا بھی اختیار حاصل ہے۔ اگرچہ
کہ اس کی صراحت نہیں کی گئی تھی کہ کس سے اور کس مقصد کے لئے گفتگو
کی جائے گی۔ چند روز کے بعد میں بستر سے کشاں کشاں بالائی منزل
کے نیچے لایا گیا اور وہاں سے امبولنس کار میں ہندوستان کے ارباب
صحافت تک پہنچایا گیا۔

۴

ہندوستانی ارباب صحافت دیوانہ وار ٹوٹ پڑے۔ بیورلی نکلس نے تلخ تجربہ حاصل کیا[1]" صورت حال کی توضیح کا یہ عام طریقہ تھا جو صحافت نے اختیار کیا۔ یہ گویا اہمیت کو گھٹانے کی تدبیر تھی۔ میں لنگڑاتے ہوئے ایک کمرہ میں داخل ہوا جو چھت سے لیکر فرش تک جرائد نگاروں سے پٹا پڑا تھا۔ ان میں سے اکثر نوجوان تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سب پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ سبھوں نے میز کے اطراف ہجوم کرکے گھیر لیا تھا اور میری گردن کے قریب سانس چھوڑ رہے تھے۔ ان سب میں صدر محترم کے سوا جن کا نام "ہارنیمان" ہے، میں تنہا انگریز تھا۔ ملک کے ایک قدیم اخبار "بمبئی سنٹینل" کے وہ مدیر رہ چکے تھے جو حکومت برطانیہ کا سخت مخالف ہے۔ ہر شام کو اخبار کے پہلے صفحہ پر ایک مقالہ بعنوان "نغمہ سنجانِ شفق" کے ذریعہ قارئین کی تفریح

(حاشیہ صفحہ ۱۴۱) اس سے ہندوستان کی ہندو صحافت مراد ہے۔ ہندوؤں کے ہاں چونکہ دولت زیادہ ہے اس لئے وہ شور بھی زیادہ مچاتے ہیں۔ اس کے برخلاف دس کروڑ مسلمانوں کی تو کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ ان کا خاص ترجمان "ڈان" ہے۔ اگرچہ کہ وہ برطانیہ کا موافق نہیں ہے تاہم اپنے مخالفین کے ساتھ شایانِ شان تہذیب و شائستگی برتتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انتہا پسند مسلم جرائد بھی پائے جاتے ہیں لیکن شور و غوغا مچانے والے ہندو اخباروں کے مقابلہ میں مسلم صحافت زیادہ سنجیدہ، دانشمند اور سب سے زیادہ قابل ذکر یہ کہ دیانت دار ہے۔

[1] قیصر ہند مورخہ ۵ مئی ۱۹۴۳ء۔

وتفنن کا سامان بہم پہنچایا جاتا ہے۔ عنوان نہایت معقول ہے۔ اس کا پہلا جز مصنف کی ذہنیت کا اظہار بالعکس اور دوسرا جز ان کی طرز انشاء پر صحیح صحیح تنقید ہے۔

لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ اس کا نہایت کامیاب مقالہ ہوتا ہے قارئین کو شاید یہ خیال نہ ہو کہ میں نے مسٹر ہارنیمان کی طرف توجہ نہیں کی یہ بالکل درست ہے۔ لیکن انھوں نے بھی میرے ساتھ کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ملاقات کے ہفتوں بعد بھی وہ اپنے اخبار میں طعنے دیتے ہجو لکھتے اور مضحکہ اڑاتے رہے۔" بمبئی سینٹینل "کے لئے کوئی طنز معمولی اور کوئی افواہ خیالی نہ تھی۔ سب سے زیادہ سنسنی خیز افواہ جو اس اخبار نے پہلے صفحہ پر شایع کی یہ تھی کہ حکومت برطانیہ نے مجھے ہندوستان کا آئندہ وائسرائے منتخب کیا ہے۔ گو اپنی حفاظت کی خاطر اس نے اس افواہ کی تردید کی تھی یعنی اپنے قارئین کو ان الفاظ میں یقین دلایا! "نکلس نے صاف انکار کر دیا ہے۔ اس منصب کی سنگین ذمہ داریوں سے وہ بہت خائف ہیں" ان تمام اجتماعات کے مقابلہ میں جن کو میں نے بعد میں مخاطب کیا جریدہ نگاروں کے اس اجتماع کی بالکل خاص نوعیت تھی کیونکہ ابتدا ہی سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کوئی مجھے سننے کے ارادے سے نہیں آرہا ہے۔ ہندوستان کے متعلق ابھی میں کچھ کہہ سکنے کے قابل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کی بجائے انگلستان کے عام مردوں اور عورتوں کی نسبت میں نے کہنا شروع کیا کہ ان کے خیالات کیا ہیں؟ ان میں کس طرح تبدیلی پیدا ہو گئی ہے؟ جنگ کے بعد عالمی مسائل کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہوگا؟ ان تمام سوالات کے جواب میں بخوبی ادا کر سکتا تھا ان کی

اہمیت وسیع اور واضح تھی اور ہندوستانی مسائل پر بھی روشنی پڑ سکتی تھی۔

چند لمحوں کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا ناممکن ہوگیا۔ چیخ و پکار شور و شغب اور آوازوں سے ساری فضا معمور تھی۔ انھوں نے سوالات سوالات" کا شور مچانا شروع کیا یہاں تک کہ نصف سامعین کھڑے ہوگئے اور باقی انھیں پکڑ دھکڑ کر بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں کاغذ کی گولیاں جن میں سوالات مندرج تھے میز کی طرف پھینکی جانے لگیں۔

بڑی محنت کے بعد قابو میں آئی ہوئی حرارت اب اندر ہی اندر تیز ہونے لگی جیسے کسی نے گرم گرم چائے کی پیالی میں تھرمامیٹر ڈبو دیا ہو۔ نفرت اور ایک عام نفرت و حقارت سے میں دو بدو تھا" ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرہ میں زندگی آگئی تھی۔ مجمع میں سے چند لوگوں نے تاریکی میں باہر جاکر نہ معلوم کھریا سے دیواروں پر کیا کچھ لکھ مارا۔ اگر عمل میں نہیں تو روح کے اعتبار سے یہ جماعت مفسدہ پرداز اور کم ظرف فوج کی ہراول بنی ہوئی تھی۔ اس موقع پہ ہندو قوم پرستی بے حجاب اور عریاں نظر آرہی تھی۔ اور صاف بات تو یہ ہے کہ یہ قوم پرستی بھونڈی بھی تھی اور ننگی بھی۔

صدر نے اس افراتفری پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اور چند لمحے میں نے بھی اپنی گفتگو جاری رکھی۔ لیکن بے سود ان کی آنکھوں کے سامنے تو قتل کا منظر تھا۔ انھیں انگریز کے خون کی بو آرہی تھی۔

مجھ جیسے شخص کے لئے جو ایک غیر رسمی گفتگو کی غرض سے آیا تھا یہ ایسا انکشاف تھا جس سے میری آنکھیں کھل گئیں۔

(۱) آپ چلے کیوں نہیں جاتے اور موقعہ کیوں نہیں دیتے کہ حکومت میں تبدیلی کی غرض سے ہم جاپانیوں کو آزمائیں؟"

(۲) "چرچل کو سولی پر کیوں نہیں لٹکایا جاتا؟"

(۳) "برطانیہ اور جرمنی میں کیا فرق ہے؟"

یہ تین سوالات تھے جو میں نے توجہ کے ساتھ سنے"

جس قدر وہ برطانیہ کے مخالف تھے اتنے ہی امریکہ کے بھی دشمن معلوم ہوتے تھے۔ کم از کم چھ آدمیوں نے یہ سوال کیا ــــــ "امریکی افسر کالے سپاہیوں کو اپنے کلب میں داخلہ کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟"

روزولٹ نے منشور اوقیانوس پر دستخط کیسے کر دیئے جبکہ امریکہ میں حبشیوں کو مساوی حقوق عطا نہیں کیے گئے ہیں؟"

"کیا برطانیہ نے روزویلٹ کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ حبشیوں کو امریکہ میں اسی طرح قتل کیا جائے جس طرح انگریز ہندوستانیوں کا خون بہا رہے ہیں؟"

ایک گھنٹہ سے زیادہ عرصہ تک اس طوفان بدتمیزی کا سلسلہ جاری رہا۔ اب میں اس پر مزید رائے زنی نہ کرونگا۔ اس کا فیصلہ تو کمرے میں بیٹھے ہوئے ان چند ہندوستانی جریدہ نگاروں ہی پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ جو بظاہر بہت شائستہ معلوم ہوتے تھے۔ اگرچہ کہ اس موقعہ پر انھوں نے مداخلت کی کوئی کوشش نہ کی دوسرے دن ایک جریدہ نگار نے ازراہ کرم "ٹائمز آف انڈیا" میں یہ شائع کیا کہ ہم اس حیرتناک علم و برداشت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جس کی مدد سے انھوں نے اس خوفناک صورت حال کا مقابلہ کیا" ــــــ انڈین انالسٹ نے اپنے اداریہ میں تحریر کیا۔

"ہمیں امید ہے کہ نکولس اس ناگوار سلوک کی بنا پر ہندوستان کے متعلق کوئی حکم نہیں لگائیں گے۔ جس کو ناپختہ کار جریدہ نگاروں لئے روا رکھا ایسی سنسنی خیزی سے رسوائی کے سوا، انھیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ——— سنڈے اسٹانڈرڈ نے لکھا:" اپنے مہمانوں کے ساتھ جن کا کوئی جرم ثابت نہیں ہے اگر اس طرح حق میزبانی ادا کیا جائے تو دنیا کی نظر میں ہمیں کوئی باعزت مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

بدقسمتی سے دنیا کی رائے میں ہندوستانی صحافت کو کوئی باعزت مقام حاصل ہی نہیں ہے آیئے تھوڑی دیر کے لئے اس کی تحقیق کریں۔

۳

متوسط ہندوستانی اخبار کی جس خصوصیت کی جانب ایک پیشہ ور جریدہ نگار سب سے پہلے متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت کی حیرتناک قلت ہے لیکن وہ ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کا اخبار نہایت مقبول ہے اس ملک میں اگرچہ کہ ہر چیز بکثرت ہوتی ہے لیکن اخبار کی اشاعت دو، تین ہزار اور بعض صورتوں میں صرف دو، تین سو تک محدود ہوتی ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس وضاحت سے جرائد کے محاسن پر روشنی ڈالنی مقصود نہیں ہے جن معنوں کو اشاعت کی تعداد سے اکثر معکوس نسبت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ وار مجلہ جس کی اشاعت صرف چند ہزار ہوتی ہے۔ وہ مقبول عام جرائد کے مقابلہ میں زیادہ باثر ہوتا ہے بہر حال اس حقیقت میں کہ ہندوستانی اخبارات کی اشاعت نہایت قلیل ہوتی ہے۔ چند اہم مضمرات پوشیدہ ہیں۔

اول یہ کہ جریدہ نگار اپنے اخبار سے اتنا نہیں کما سکتے کہ وہ ان کے

گزارے کے لئے کافی ہو۔ لیکن اس کے برعکس انگلستان میں ایک کامیاب جریدہ
نگار دوسرے ہر پیشہ والے سے کامیاب مسابقت کرسکتا ہے۔ ہندوستان میں
وہ بڑی سے بڑی ترقی بھی کرجائے۔ پھر بھی غریب رہ جاتا ہے۔ ہندوستانی
ارباب صحافت تقریباً فاقہ کی زد میں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ
ہندوستان کے بہترین دماغ پیشۂ صحافت کی جانب مائل نہیں ہیں۔
ناکارہ افراد، ناکام بی۔ اے اور گھر کے آوارہ مزاج نوجوان یہ پیشہ
اختیار کرتے ہیں۔ ہندوستان میں نامہ نگاروں (بہ استثنا چند) کو ملاقات
کا موقع دینا مصیبت مول لینے کے برابر ہے۔ اکثر الفاظ کا املا تک بتانے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ مشاہیر عالم میں سے جب کسی کی طرف تلمیح ہوتی ہے تو
نامہ نگار منہ کھول کر گھورنے لگتے ہیں۔ اس قلیل آمدنی کا دوسرا خطرناک
نتیجہ ناگزیر بداخلاقی ہے۔ اگلے باب میں، میں نے کل ہند فلمی تشہیر کے چیف
ڈائرکٹر کا جو ہندوستانی ہیں ایک قول نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان
میں فلمی تنقید دیانتداری کے ساتھ نہیں کی جاتی یا تو وہ رشوت ہوتی ہے یا
پھر دھمکی جو رشوت وصول کرنے کے لئے دیجاتی ہے" دوسری) اور تنقیدوں
کے متعلق بھی یہ رائے درست سمجھی جاسکتی ہے۔ دراصل ہندوستان میں
کوئی آزاد ناقد نہیں ہے جس کے ساتھ رائے عامہ ہو۔

یورپ میں مسلمہ طور پر یہ رجحان ہے کہ اخبارات کسی کے آزادی فکر
میں مداخلت نہ کرنے پائیں۔ ناقدین کے نقطۂ نظر کی تبلیغ یا نشر و اشاعت
کا واسطہ عموماً جرائد ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ ناقدین کسی اثر و رسوخ سے
متاثر نہیں ہوتے مثلاً لندن ایوننگ اسٹانڈرڈ ______
میں لو______ کے کارٹون ہمیشہ لارڈ بیوربروک کے مسلک کے خلاف

شائع ہوتے ہیں۔ جنگ کے ابتدائی زمانہ میں ڈورتھی تھامپسن ——— کا بین الاقوامی نقطۂ نگاہ اس کی مجلسِ ادارت کے لئے بلائے بے درمان بنا رہا۔ لیکن ہندوستان میں ڈورتھی تھامپسن کے اصول و زاویہ نظر سے کوئی واقف تک نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ والٹر لپمن ——— نے کیا کہا ہے؟ جے۔ بی۔ پریسٹلے ——— نے کیا رائے ظاہر کی؟ ہندوستان میں کوئی ایسی شخصیت ہی نہیں جس کا کسی درجہ میں بھی ان نقادوں سے موازنہ کیا جا سکے۔ ماہرینِ سیاست سے ہٹ کر ہندوستان میں کوئی قومی مدبر نہیں ہے مدبرین کا تو کیا ذکر ہے کوئی ایسا ظریف بھی نہیں ہے جو امتیازی خصوصیت کا حامل ہو۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آرٹ کے نقاد یہاں پائے نہیں جاتے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں آرٹ سرے سے مفقود ہے۔ کوئی تمیز جانے کے قابل نہیں ہے۔ ہندوستان "نفی محض" کا ایک مہتم بالشان سلسلہ ہے اور یہ افسوسناک حقیقت پورے کمال کے ساتھ صحافت میں نمایاں ہوگئی ہے۔

سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت سے قطع نظر کیجئے تو یہاں رائے عامہ کا وجود ہی نہیں ہے، اس کے برخلاف اختلافِ رائے کی کثرت ہے۔ ایسے ملک میں جہاں ایک قوم آباد ہوتی ہے۔ آپ اس کے مزاج کا آسانی اندازہ کر سکتے ہیں۔ کم از کم مصائب کے انتہائی زمانہ میں اس قوم کی ہمنوائی اور یگانگت بہت ہی نمایاں ہوتی ہے لیکن ہندوستان کی رائے عامہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا وہ باہمی اختلاف و تصادم کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے اخبارات کی اس فہرست سے جو حکومتِ ہند کی سلسلہ ہے ذیل میں ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جس

ہندوستانی سیاسی رائے عامہ کا حیرتناک تضاد مترشح ہوتا ہے۔

جرائد	تعداد اشاعت	خصوصیات
(۱) بمبئی کرانیکل	۱۸،۰۰۰	کانگریس کے مسلک کا مستند ترجمان ہے۔
(۲) بھارت	۵،۰۰۰	بڑا قدامت پرست، ہندو مہا سبھا کا حامی ہے۔ جو ہندوؤں کی جماعت دست راست ہے۔
(۳) بمبئی سینٹینل	۹،۰۰۰	کٹر اشتراکی حکومت برطانیہ کا مخالف اور کانگریس کے مسلک کا نقاد ہے۔
(۴) انڈپینڈنٹ انڈیا	۳،۰۰۰	کانگریس کے موجودہ مسلک کا کٹر مخالف اور جنگ میں ہندوستان کی شرکت کی حمایت کرتا ہے۔ اشتراکی رجحانات رکھتا ہے۔
(۵) جنتا	۳،۰۰۰	اچھوتوں کے مقصد کی حمایت کرتا ہے۔
(۶) جنم بھومی	۱۲،۰۰۰	ریاستہائے ہند کی رعایا کی

لہ یہ اعداد برطانوی ہند اور ریاستوں میں شائع ہونے والے انگریزی اور ہندوستانی زبان کے ممتاز جرائد و رسائل کی سرکاری فہرست سے حاصل کئے گئے ہیں۔

خصوصیات	تعداد اشاعت	جرائد
تائید کرتا ہے۔		
پارسی فرقہ سے متعلقہ امور پر تبصرہ کرتا ہے، روش معتدل ہے۔	۳،۰۰۰	(۷) کام سیوک
سخت فرقہ وار اور مسلم لیگ کا حامی ہے۔	۳،۰۰۰	(۸) مسلم گجراتی
کیساری مکتب خیال سے تعلق رکھتا ہے روش معتدل ہے۔	۶،۵۰۰	(۹) پربھات
فرقہ وارانہ طریقہ پر تحفظ حقوق کا مؤید ہے۔ کانگریس پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے۔ سیاسی حیثیت سے انتہا پسند ہے۔	۴،۰۰۰	(۱۰) روزنامہ خلافت

اِن چند جرائد میں ہندوستانی رائے عامہ کی صحیح ترجمانی کہاں تلاش کی جاسکتی ہے؟ اگر یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان میں سے اکثر جرائد ممتاز اور باثر ہیں۔ اِن کے علاوہ تقریباً چار ہزار جرائد اور بھی ہیں جن کی اِشاعت کی اوسط تعداد ایک ہزار سے کم ہے اگرچہ کہ اِن پرچوں کا کوئی علمی معیار نہیں ہے اور ان کی رائیں بھی متضاد ہوا کرتی ہیں۔ لیکن کانگریسی مبلغین ان میں شائع شدہ بیانات کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ بطور سند

پیش کرتے ہیں۔[1]

۴

اگرچہ کہ یہ رائے بہت ہی سخت ہے لیکن تلخ تجربات کا نتیجہ ہے۔ ہر وہ شخص جسے عالمی صحافت کے متعلق وسیع معلومات حاصل ہوں۔ مجھسے اتفاق کرلیگا کہ

---

[1] یہ حقیقت بہت معنی خیز ہے کہ ہندوستان کے کثیر الاشاعت جرائد "ٹائمز آف انڈیا" اور کلکتہ "اسٹیٹسمین" دونوں انگریزی زبان میں شایع ہوتے ہیں۔ ان جرائد کے تخمیناً ستر ہزار قارئین ہیں۔ "ٹائمز" کا کوئی تاجرانہ مفاد وابستہ نہیں ہے۔ اس کی اپنی ایک مخصوص راہ ہے۔ انگریزی زبان کے دوسرے مشہور جرائد" "سیول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور اور "پائنیر" ہیں۔

"آخر الذکر" لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے۔ اس کے صفحات سے اب بھی رومانیت جھلکتی ہے کیونکہ یہ کپلنگ کا اخبار تھا۔ اور قدیم زمانہ میں فی پرچہ ایک روپیہ کی شرح سے ہندوستان بھر میں فروخت ہوا ہے۔ یہ نہایت ہی رجعت پسند اخبار تھا۔ اگرچہ کہ اس نے زمانہ کے اقتضاات کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔ مگر یورپ بھر میں اپنے نامہ نگاروں کی وجہ سے یہ پر از معلومات اخبار تھا۔ جدید اختراعات کو نظر حقارت سے دیکھتا تھا سنہ ۱۹۲۶ء تک اس کے مطبع میں تقریباً (۳۰۰) مزدور کام کرتے تھے۔ ہمیشہ دیر سے شائع ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے سے پہلے اخبار کی طباعت شروع نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانہ سے لے کر اب تک متعدد انقلابی ادوار سے گزر چکا ہے۔ اس کو پڑھ کر ایک ایسے سن رسیدہ ضعیف کا تصور ہوتا ہے جو حزن و یاس کے عالم میں ایسے دور کے ساتھ توافق پیدا کرنے کوشش کرتا ہو جس کے رجحانات کو سمجھنے پر بھی وہ قادر نہیں ہے۔

یورپ و امریکہ کے کسی حصے میں اس کو کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا ہوگا جسے ہند وصحافت کی بداخلاقی اور غیر دیانتداری دور کی بھی مماثلت ہو۔ جھوٹ کے ڈانڈے فن لطیف سے ملائے جاتے ہیں۔ یہاں جھوٹ بالواسطہ بھی بولا جاتا ہے اور بلاواسطہ بھی" ادعا کے ساتھ بھی اور اغماض کے ساتھ بھی کبھی کنایہ کے ساتھ کبھی تہمت طرازی اور کبھی ترغیب و تحریص کے طور پر اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اپنی علالت کے زمانہ میں ہندوستانی اطبا کو جو میرے معالج تھے خراج تحسین کے طور پر میں نے ایک مضمون بحری تار کے ذریعہ انگلستان کو روانہ کیا اس مضمون میں ہندو نرسوں کی مہارت و ایثار نفسی کی بھی تعریف کی گئی تھی ـــــ اگرچہ کہ اس میں اس امر کا بھی اظہار کیا گیا تھا۔ کہ ملک میں نرسوں کی افسوسناک قلت تعداد اس پیشہ کے ساتھ عام ہندوستانی عورتوں کی ناقدری کا نتیجہ ہے۔ مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا گیا تھا۔

فن طبابت کو نہ صرف انگریز بلکہ خود ہندوستانی بھی اگر آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقعہ دیں تو ہندوستان میں اس کا مستقبل نہایت شاندار ہے"

مضمون بحری تار کے ذریعہ پھر ہندوستان کو واپس بھیجا گیا۔ چونکہ یہ ہندوستانی صحافت کے خلاف نہ تھا اس لئے اس کو شائع کر دیا گیا۔ البتہ محولہ بالا عبارت میں سے لفظ "صرف" حذف کر دیا گیا۔ اگر اس حذف کے ساتھ آپ جملہ کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ پورا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مضمون کی اشاعت کے بعد ہند وصحافت میں پھر ایک ہلچل مچ گئی۔ بار بار ایسے ہی اتفاقات پیش آتے رہے بالآخر جب نامہ نگاروں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تو میں نے ان کو حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کرنا شروع کیا:۔

"آپ مجھ سے کچھ سننا نہیں چاہتے اگر سن بھی لیں
تو اُسے سمجھیں گے نہیں اگر سمجھیں تو اس کو غلط شایع
کریں گے۔ اس ملاقات کے صرف دو ہی اغراض معلوم
ہوتے ہیں۔ یا تو مجھ سے جھوٹ بلوائیں یا خود جھوٹ
بولیں۔"

میری اِس اشتعال آمیز گفتگو کے بعد جرائد نگاروں نے کہا کہ آپ ہماری نسبت بہت بری رائے رکھتے ہیں۔ میں نے جواب دیا "جی ہاں نہایت ہی بدترین۔" اس گفتگو اور تھوڑی سی تواضع کے بعد معمولاً یہ ملاقات ختم ہو جایا کرتی تھی لیکن تعجب ہے کہ اِس اہانت آمیز سلسلۂ کلام کے باوجود میں ان جرائد نگاروں سے صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جایا کرتا تھا۔

۵

اِس ناخوشگوار عنوان پر اِک حرف آخر ——— ہندو جرائد کے اندر جن کی دنیائے صحافت میں ایک مفلوج طفل نوزائیدہ کی حیثیت ہے۔ حکومت برطانیہ نے افواہ، تعصب اور جہل کے ہر معجون مرکب کی اشاعت کی آزادی دے رکھی ہے جو زمانۂ امن ہی میں ایک خاص رعایت ہے لیکن زمانۂ جنگ میں سخت حیرت و تعجب کا باعث ہے

اس کتاب کی ترتیب کے زمانہ میں مخالف برطانیہ، مخالف امریکہ اور مخالف جنگ پروپگنڈے کے سلسلہ میں سستے داموں اس کثرت کے ساتھ مطبوعات دستیاب ہوتی تھیں کہ اگر ڈاکٹر گوئبلز کو

یہ فراہم کی جائیں تو اس کے لئے عرصۂ دراز تک یہ مواد کافی ہو سکتا ہے۔
ہر قسم کی بدنیتی اور ذلیل قسم کی سازش چرچل اور روز ولٹ سے منسوب کی جاتی ہے وائسرائے کے ساتھ ایسا ناگوار اور غیر شائستہ سلوک روا رکھا جاتا ہے جو کسی بدترین آدمی کے بھی شایان شان نہیں ہو سکتا۔ ایک ہندو جریدہ کا ایڈیٹر جس کو میرے متعلق غلط اطلاعیں ملی تھیں بڑا سا کارٹون لے کر ایک دن بڑی تیزی سے میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس کو میرے بستر پر رکھ کر کھولنے لگا اس میں لارڈ لنلتھگو کو بالکل عریاں تصویر میں دکھایا گیا تھا جو مسٹر جناح کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور ان کے پاؤں کا انگوٹھا چاٹ رہے ہیں (یہ کارٹون دراصل وائسرائے کی ایک تقریر پر تبصرہ تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کی جانب ایک محتاط اشارہ کیا تھا)

نوجوان مدیر نے اس کارٹون کے بارہ میں میری رائے دریافت کی۔ میں نے کہا کہ یہ بہت ہی بری تصویر ہے۔ مدیر نے کہا کہ تصویر بری سہی لیکن جو خیال اس میں پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا کہ ایسی بری تصویر میں مجھے تو کوئی خیال نہیں ملتا اس نے کہا خیر جو کچھ ہو میں اس کارٹون کو شائع کر رہا ہوں۔ میں نے کہا مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور شائع کریں گے ۔ کیونکہ ہندوستانی جرائد کو آزادی حاصل ہے۔ اس جواب پر اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا یہ بڑی اچھی اور دلچسپ بات ہے، میں ضرور اپنے احباب کو سناؤں گا۔

اِس قہقہہ کا کیا مطلب ہے؟ اِن اخبارات اور رسائل کو جو میری قیام گاہ سے متصل کتاب خانہ میں ہیں اگر قوت گویائی حاصل ہوتی تو صحافت کی آزادی کے بارہ میں ان سے سوال کیا جا سکتا تھا۔ ذرا اِن کتابوں پر نظر ڈالیئے ـــــــــــ

(۱) " ہندوستان چھوڑ دو"
از "گاندھی"

(۲) " انکل شام" " زوال امریکہ بے نقاب"
ایک ہندوستانی کے قلم سے۔

(۳) برطانیہ، ساعی، جنگ، مسلمانوں اور ہر غیر ہندو چیز اور شخص کے خلاف ان گنت پمفلٹ اور مضامین، افتراء پردازی دروغ بیانی غصہ و نفرت سے بھرے پڑے ہیں اور یہ سب کے سب کھلے طور پر بازاروں میں فروخت کئے جاتے ہیں۔

جنگ کے ایسے زمانہ میں جبکہ موت و حیات کا سوال پیدا ہو گیا ہے بعض دفعہ لی ہر ہے کہ نتیجۂ احتساب کو زیادہ سخت کر دیا گیا۔ ایسے ملک میں جہاں دشمن کے مفسدہ پردازوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بعض موقعوں پہ بے ضرر چیزوں پر بھی کوتوالی نے امتناع عائد کیا ہے۔ مگر میں چیلنج کرتا ہوں کہ بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کی کوئی ہندو تردید نہیں کر سکتا۔ جنگ کے اِس دوران میں کثیر التعداد ہندو جرائد نے حکومت برطانیہ کے خلاف ہمیشہ نفرت و حقارت کا اظہار کیا ہے۔ ان کا یہ طرز عمل خواہ کتنا ہی شدید، کتنا ہی غلط اور کتنا ہی خطرناک

کیوں نہ ثابت ہوا ہو لیکن حکومت نے کبھی اس کے انسداد کا خیال
نہ کیا۔ اظہار ملامت کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے جبکہ دشمن ہندوستان
کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ اگر یہ آزادی نہیں ہے تو کم از کم آزادی کی
"نقل مطابق اصل" ضرور ہے۔

چوتھا باب

ہندوہالی وُڈ

تندرست ہوکر جب میں چلنے پھرنے لگا تو سب سے پہلے مجھے ہندوستانی فلم دیکھنے کا شوق ہوا۔ اس سے قبل شاید ہی کسی انگریز کے دل میں یہ خبط سما ہوگا۔ ہندوستانی فلم کے بارہ میں متعدد خیالات میرے ذہن میں آنے لگے بہرحال شوق نے تجویز کا خیر مقدم کیا اور مجھے یقین ہوتا گیا کہ ہندوستانی فلم دلچسپ ضرور ہوں گے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلمیں قومی حیات کی آئینہ ہوتی ہیں۔ اس آئینہ میں نظر آنے والی کو ہر چیز سمجھ میں نہ آئے لیکن اپنی دلچسپی کے باعث اس کو دیکھنے کی چند گھنٹوں کی محنت ٹھکانے ضرور لگتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مجھے فلم اسٹوڈیو دیکھنے کا شوق تھا۔ تھوڑا سا اثر استعمال کرنے کے بعد ایک بڑے تاریخی فلم کی "شوٹنگ" دیکھنے کی اجازت مل گئی جو بمبئی سے کچھ فاصلہ پر ہو رہی تھی۔ آئیے ہم آپ ملکر اس کی سیر کریں۔

۲

فلم اسٹار آلتی پالتی مارے اسٹوڈیو کے فرش پر بیٹھی ہے۔ کبھی کبھی

آم کے ٹکڑوں سے بھرے ہوئے چمکتے سنہرے برتن میں چمچہ ڈالتی ہے۔ اپنے خوبصورت ہاتھ کے اشارہ سے قلی کو پنکھا اپنے قریب لانے کا حکم دیتی ہے جب قلی نے پنکھا قریب کر دیا تو اس کے مصنوعی لمبے لمبے بال بکھر گئے جو نہایت ہی دلفریب انداز میں اس کی کمر کے نیچے لہریئے کی طرح لٹک رہے تھے۔ یہاں شدت کی گرمی تھی سیر و گردش کا خیال کچھ اس طرح دماغ پر مسلط ہو چلا تھا کہ میں نے طے کر لیا کہ گھڑی بھر چہل قدمی کے لئے باہر چلا جاؤں۔ دروازے سے گزرنے والے کو تقریباً ایک درجن ننگے فلموں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ جو فرصت پاکر کھاک دھول میں پڑے لوٹ رہے تھے۔ اسٹوڈیو کے اندر اور نہ اس کے باہر کہیں ہالی ووڈ کا کوئی منظر دکھائی دیا۔ مضافات بمبئی کی ایک شاہراہ پر قدیم اور فرسودہ مکانات واقع ہیں۔ اس سڑک کے نیچے بیل گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ جو ہندوستانی شان و شکوہ کی ایک دائمی یادگار ہے۔ قریب ہی ناریل کے درخت پر چیل اور کوؤں نے اپنی آواز سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ باب الداخلہ پر ایک سنتری سفید اور ارغوانی رنگ کی پگڑی باندھے کھڑا ہے۔ جب چکر لگاتے ہوئے ایک مقام پر پہنچا تو میں نے فولاد اور کنکریٹ سے بنی ہوئی ایک عمارت دیکھی جس پر لکھا ہوا تھا "اسٹیج نمبر ۴" تمباکو نوشی کی ممانعت ہے "۔

"مشرق و مغرب کا یہ تصادم حیرت انگیز تھا۔ اس احاطہ کے کنارے ایک خوبصورت پیپل کا درخت تھا جس کا تنہ نہایت ناہموار اور رنگ ہاتھی دانت سے مشابہ تھا۔ جب میرے دوست نے اس منظر کی تصویر بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسٹوڈیو کے ڈائرکٹر نے کہا "آپ جلدی کریں کیونکہ اسٹوڈیو کی گنجائش کو وسیع کرنے کے لئے یہ درخت کاٹا جا رہا ہے۔ میں نے کہا یہ پیپل کا مقدس درخت ہے

یہ ہرگز نہ کٹنے گا۔ بفرض محال کٹ جائے تو اسٹوڈیو کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ پیپل کا درخت ہوتا بھی خوبصورت ہے۔ ہندوستانی متبرک کے تصور سے مرعوب ہوتا ہے کاش کہ انگلستان میں بھی چند متبرک درخت ہوتے۔ بہرحال پیپل کے درخت کا یہاں ضرورت سے زیادہ احترام کیا جاتا ہے۔ اس کی بنا پر تجنیس لفظی کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں "پیپل" ——— کی بجائے پیپل کی حکومت ہے ——— پیپل کی حکومت، پیپل کے ذریعہ اور پیپل کے واسطے ——— چلتے چلتے ہم ایک سایہ دار درخت کے نیچے ٹھہر گئے جس کا سایہ گھنا اور خوشگوار تھا۔

میں نے اپنے واقف کار دوست سے ہندوستانی صنعت فلم سازی کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں فلمی کاروبار خاصا وسیع ہے، اور روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ فلم سازی کی ایک سو سے زیادہ کمپنیاں موجود ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، پونا اور مدراس کے بڑے بڑے مرکز ہیں جہاں تقریباً اسی ہزار افراد کام پر مامور ہیں۔ سینما گھروں کے متعلق معلوم ہوا کہ بمبئی کی میٹرو جیسی بلند و ہوادار عمارتوں سے لیکر چھوٹے چھوٹے شہروں میں ایسے سینما گھر بھی ہیں جن میں کھٹمل سے بھری ہوئی بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔ بہرحال سارے ملک میں تقریباً ایک ہزار چھ سو سے زائد قابل ذکر سینما گھر موجود ہیں۔ دیہاتوں میں سفری سینما دورہ کرتے ہیں جن کی تعداد پانسو سے کم نہیں ہے۔ جو طویل مذہبی اور ایسی فلموں کا مظاہرہ کرتے ہیں جو حکومت کی نگرانی میں تیار کرائی جاتی ہیں ان چھوٹی فلموں کے ذریعہ تماشہ بینوں کو حفظان صحت، طبی امداد اور زراعتی معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اب یہ معلوم کرنے کے لئے اداکار کیسے ہوتے ہیں؟ ان کی آمدنی کیا ہے؟ آپئے کو

اسٹوڈیو میں واپس چلیں!

۳۱

وہی فلم اسٹار ایک جھونپڑے کے دروازہ پر کھڑی ہے۔ ڈائرکٹر پورے انہماک کے ساتھ کام میں مصروف ہونے کے باوجود سر سے گاندھی ٹوپی نہیں اتارتا اس عورت کے پہلو میں ایک داڑھی والا شخص کھڑا ہے جو گداگر کا پارٹ ادا کر رہا ہے منظر میں فقیر اور فلم اسٹار کے مابین جس کو دیہات کی حسینہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ایک پرجوش بحث ہوتی ہے۔ یہ طویل مکالمہ بالآخر لڑکی کے شوہر کی آمد پر ختم ہو جاتا ہے اتنے میں، روشنی، روشنی کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ روشنی ہو جاتی ہے اور پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے فلم اسٹار پھر نمودار ہوتی ہے۔ مکالمہ پھر شروع ہوتا ہے۔ کام کا سلسلہ از سر نو جاری ہونے لگتا ہے۔ لیکن یکایک اداکار اپنی اداکاری ختم کر دیتے ہیں پھر سے ایک طویل وقفہ شروع ہو جاتا ہے۔ . . . . اس کے بعد مدھم روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اب کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے کیونکہ یہاں بھی وہی پیش آتا ہے جو عموماً ہر اسٹوڈیو میں ہوتا ہے۔ آپ ہندوستانی "ہالی وڈ" کے مالیاتی امور پر روشنی ڈالی جائے گی کیونکہ اوروں کی آمدنی معلوم کرنا ہمیشہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔

ایک فلم کی تیاری میں فلم اسٹار کو پچھتر ہزار روپیہ فیس ملجاتی ہے جو پچیس ہزار ڈالر کے برابر ہوتے ہیں۔ سال میں تین مرتبہ اگر کسی فلم اسٹار کو کام مل جائے اور اکثر مل ہی جایا کرتا ہے تو اس کی مالی حیثیت "ہالی وڈ" کی فلم اسٹار سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ ہندوستان میں انکم ٹیکس کی مقدار کبھی کبھی کلکٹر کی جانب سے بالجبر وصولی کے باوجود انگلستان اور امریکہ کے

مقابلہ میں برائے نام ہوتی ہے۔ ہندوستانی فلم اسٹار بڑی احتیاط کے ساتھ اس دولت کی حفاظت کرتی ہے۔ نہ بڑی موٹر۔ نہ شاندار مکان۔ بیورلی کی پہاڑیاں جہاں خواتین اداکار قیام کرتی ہیں۔ بمبئی کی مضافات میں واقع ہیں۔ یہاں سیر و تفریح کے لئے نہ تو کوئی سیاح آتا ہے نہ کوئی فوٹوگرافر کبھی جھانکتا ہے۔ صبح کے وقت جب کوئی فلم اسٹار ٹہلتے ہوئے موٹر تک آتی ہے تو کوئی راہرو اس کی طرف نظر بھی نہیں اٹھاتا فلم اسٹار سے شخصی ملاقاتوں کا ہندوستان میں رواج نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس لئے وہ خاموش زندگی بسر کرتی ہو کہ اسکی مدت کارگزاری بہت قلیل ہوتی ہے۔ جس کا آغاز اور انجام دونوں ناگہانی ہیں۔ مغربی ڈائرکٹر کے لئے یہ سخت تعجب کا باعث ہوگا کہ پہلی آزمائش کے چند ہی روز بعد ایک ہندوستانی لڑکی طویل فلموں میں نمایاں حصہ لینے لگتی ہے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ چند سال تک فلمی دنیا میں اس کی شہرت رہتی ہے جس کی بڑی سے مدت عموماً تین سال خیال کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اچانک وہ غائب ہوجاتی ہے حسن اور اداکاری کے لحاظ سے وہ مقبول ہی کیوں نہ ہو لیکن اسٹیج سے علیحدہ ہو چکنے کے بعد کسی کی زبان پر اس کا ذکر بھی نہیں آتا۔ فلم اسٹار کے معاوضہ کے مقابلہ میں دوسرے فلمی افراد کا معاوضہ بہت حقیر ہوتا ہے۔ معاوضہ کے لحاظ سے فلمی تمثیل نگار بھی قابل رحم ہیں طویل فلم کے منظر نگار اور مکالمہ نویس کو اگر دو سو روپیہ یعنی (۶۰) ڈالر بھی ملجائیں تو وہ خوش قسمت خیال کئے جاتے ہیں۔

۳

جب ہم سہ پہر کو کچھ دیر میں اسٹوڈیو پہنچے تو اس وقت بحث کا منظر

فلمایا جا رہا تھا۔ دیہاتی دوشیزہ ایک نوجوان سے محبت کا اظہار کر رہی تھی لیکن
طالب و مطلوب بغلگیر ہوئے اور نہ انھوں نے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔
میں نے اپنے دوست سے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا ہندوستانی فلموں میں اس
قسم کی باتیں نہیں ہوتیں۔ بعد میں مجھے ہندوستانی فلم میں بوسہ بازی کی تاریخ
سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ بہرحال بوسہ بازی یہاں ممنوع ہے۔

دس سال قبل فلم "زرینہ" میں بوسہ بازی کا منظر دکھایا گیا تھا جس پر
سینما ہال میں تماشہ بینوں نے غم و غصہ کا اظہار کیا اور ملک بھر میں احتجاجی جلسے
منعقد ہوئے اور تنقید نگاروں نے متفقہ طور پر اس کے خلاف آواز بلند کی
"زرینہ" اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری فلم تھا۔

۵

مذہبی اثر کی بنا پر جس طرح ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ میں جمود
و تعطل طاری ہے اسی طرح ہندوستانی بالی ووڈ پر بھی (جس میں سب سے
زیادہ ہندو سرمایہ لگا ہوا ہے) جمود طاری ہے۔ اکثر ہندوستانی فلموں کا
پس منظر کسی نہ کسی صورت میں مذہب یا علم الاصنام ہوا کرتا ہے۔ بہت ہی
قدیم زمانہ کے قصے فلمائے جاتے ہیں۔ پردۂ سیمیں کے پیچھے دراصل
مقدس روحوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہوتا ہے جو تماشہ بینوں کو اوہام پرستی
کے قصے سناتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس ملک میں ہوتا ہے جس میں قصے،
کہانیوں کا بڑا زور ہے۔ جدید ہندوستان میں تو ہر درخت کے متعلق ایک
قصہ گھڑ دیا جاتا ہے۔ ساری فضا تمثیلوں کی فضا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن
ان میں سے کوئی قصہ یا تمثیل فلمائی نہیں جاتی۔

یہ درست ہے کہ کبھی کبھی ترقی پسند فلم ساز جدید قسم کا معاشرتی فلم تیار کرتا ہے لیکن اکثر تمثیل نگار چونکہ کوئی جدید تخیئل پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتے اس لئے ہندوستانی فلم سازوں کے لئے امریکی فلم سازوں کی کامیابی قابل رشک ہوتی ہے ایک کام جو کسی اداکار کے لئے پہلے مخصوص کیا جاتا ہے وہ فوراً دوسرے غیر موزوں اداکار کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اداکاری ناقص رہ جاتی ہے۔ اس کے باوجود فلم ساز اور تمثیل نگار کے لئے بڑی بڑی آمدنیوں کے بہت سے امکانات ہیں فلم اسٹار کا تو کیا پوچھنا ہے؟

مثالاً ایک، دو صورتیں بتانا چاہتا ہوں! پہلا موضوع تو "اچھوت" ہے ——— یعنی ایک لڑکا ہے جو "اچھوت" گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کو برطانوی یا امریکی آزاد فضا میں پرواز چڑھنے کا موقع دیجئے (ہاں! مگر امریکہ میں رنگ کا امتیاز برتا جاتا ہے۔ لیکن اچھوت کی غلامی کے مقابلہ میں رنگ ونسل کے امتیاز کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے) یعنی وہ دولت اور شہرت کا مالک بنے ——— پھر اس کو اپنے وطن مالوف میں واپس بھیجئے! اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اسے گاؤں کے کنوئیں سے پانی لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اچھا اگر اجازت نہیں ہے تو وہ اپنے لئے پانی کا خزانہ الگ بنا لیتا ہے۔ وہ اتنے کمتر درجہ کا آدمی ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ دھوبی اس کے کپڑے نہیں چھوئے گا۔ اچھا تو وہ اپنا دُھلائی کا کارخانہ الگ قائم کرلیگا۔ اس کے بعد بچوّں کو گاؤں کے قریب ترین مدرسہ میں داخل ہونے کی ممانعت ہوگی۔ وہ اپنا ایک جداگانہ مدرسہ قائم کرتا ہے جس کے لئے بہترین اساتذہ کا انتظام کرتا ہے۔ اگر کوئی باہمت فلم ساز اس قسم کی تصویر تیار کرے جس میں اس

موضوع کے تمام قابل افسوس پہلوؤں کو نمایاں کرسکے تو بہت مفید ہوگا۔

پردہ

دوسرا موضوع ہے جس کا تمثیلی فلم تیار ہونا ضروری ہے۔ پردہ مسلمانوں کی ایک روایاتی رسم ہے جس کے سبب سے مسلمان عورتیں عمر بھر کے لئے سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو چھپائے رکھنے پر مجبور رہیں۔ تاکہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھنے نہ پائے۔ اس رسم پر میں کوئی تنقید نہیں کرونگا۔ اس کا فیصلہ مسلمانوں ہی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ بعض ترقی پسند مسلمان اس پر سخت اور پیہم اعتراضات کرتے ہیں وہ اس کو ایک ایسی رسم سے تعبیر کرتے ہیں جو جابرانہ مضر صحت، غیر فطری اور جسم و دماغ کو ماؤف کر دیتی ہے اور کہتے ہیں کہ یہ تاریک دور کی ایک نہایت ہی بری یادگار ہے۔ فلم کے لئے یہ کتنا اچھا موضوع ہے ——— اس کی سینکڑوں فلمیں تیار کی جاسکتی ہیں جن میں یہ منظر کتنا دلچسپ ہوگا کہ سورج کی روشنی حاصل کرنے کے لئے پردہ کی دھجیاں اُڑائی جارہی ہیں۔ مگر اس قسم کے تمثیلی فلم تیار کرنے کے لئے فلم ساز کو رسم شکن بننا چاہیئے۔ ہندوستان میں ایسے فلم ساز ہیں لیکن انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک سہراب مودی قابل ذکر ہیں جنھوں نے حال ہی میں مجھے فلم "سکندر" دکھایا جو ہندوستان پر سکندر اعظم کے حملے سے متعلق ہے۔ اس میں شجاعت و بہادری کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ رفتار ترقی اور ذوق کے لحاظ سے یہ قدیم شاہکار برتھ آف اے نیشن ———

(ایک قوم کی پیدائش) کے معیار کا فلم ہے۔ دوسرے نہایت ہی ذہین اور قابل فلم ساز جے۔ بی۔ ایچ واڈیا ہیں جنھوں نے انگریزی مکالموں کے ساتھ

ہندوستان میں پہلا بولتا فلم موسومہ (کورٹ ڈانسر) بناکر فلمی تاریخ میں اپنی یادگار قائم کرلی ہے۔ یہ ان کی کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ اس کی تصویرکشی میں شعریت پائی جاتی ہے۔ لیکن مغربی نقطۂ نگاہ سے اس فلم کی مقبول عام اداکارسا دھنا بوس افسوسناک حد تک بھدّی معلوم ہوتی ہے اور فلم کے انگریزی مکالمے حد درجے خراب اور ناقص ہیں۔ مثلاً اکثر موقعوں پر اداکاروں کی زبان سے "اوہ" کا لفظ تکیہ کلام کے طور پر ادا کرایا گیا ہے جس کی وجہ سے غیرارادی طور پر مزاحیہ انداز پیدا ہوگیا ہے۔ ہیرو اپنی محبوبہ سے کہتا ہے "پیاری! وہ تمہارے قتل کے لئے آرہے ہیں" اس کے جواب میں محبوبہ کی زبان سے "اوہ" کا لفظ ادا کیا جاتا ہے۔ جن سے کسی تاثر یا جذبہ کا اظہار نہیں ہوسکتا۔ تاہم بوس اور واڈیا تخلیقی ذہن وقوت کے حامل ہیں جنھوں نے ہندوستانی فلم سازی کو اس کی مایوس کن پستیوں سے نکال کر ترقی کی بلندیوں پر پہنچانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردی ہیں۔ ان کا فرض مشکل اور اہم ہے۔ اگرچہ کہ ان کے ہم عصر ملک کے اکثر المناک واقعات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کے انسداد کے لیے وہ بطیب خاطر رضامند نہیں ہوتے مثلاً ایک اہم اور کامیاب فلم موسومہ "بھلائی" کا اشتہار ان الفاظ میں شایع کیا گیا۔

"ایک ہندو دوشیزہ کا بھائی مسلمان ہے ان کا پاک اتحاد پوری قوم کے رنج و الم کا باعث ہے" کیا اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ یہ موضوع "دلخراش طعن وتشنیع کا مستحق ہے۔ یہ بجا اور درست ہے کہ کسی فلم اسٹار مثلاً رمولا کو ہندوستانی فلم کی مقبول عام اور ہر دلعزیز اداکار کی حیثیت سے شہرت دیجائے یا فلم "میرا بچہ" کی تشہیر میں "ہالی ووڈ" کے طریقہ کی ریس کی جائے بجائے اس

رومن قانون کے باوجود ایسے اُمور میں بلا استثنا مذہبی عناصر داخل ہو جاتے ہیں اور اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ فلموں میں ان کے تیار کرنے والوں کے شخصی، مذہبی میلانات کا رنگ جھلکنے لگتا ہے جن میں سے اکثر ہندو ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں فلموں کی نسبت کوئی دیانت دارانہ تنقید نہیں کی جاتی۔ چند استثنائیات کے ساتھ نقاد کا قلم اس کے اپنے فرقہ مسلک اور سیاسی معتقدات کے محور کے گرد گھومتا ہے۔ یہاں میں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ خود ہندوستانی اصحاب کے بیانات سے بھی اس تحریر کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہندوستانی فلموں کے افسر تشہیر نے جن کا نام حذف کیا جاتا ہے کہا تھا "ہندوستان بھر میں فلموں کی نسبت کوئی دیانت دارانہ تنقید نہیں ہوتی کوئی ایسا اخبار یا رسالہ نہیں جس کو متاثر نہ کیا جا سکتا ہو فلموں کے بارہ میں اُن کی تنقید دن کو کوئی اہمیت نہیں دیجاتی ہنگری کے ایک سیاح نے ہندوستان کے سفر سے واپس ہو کر امریکہ کے ایک فلمی رسالہ میں تحریر کیا تھا۔

"ہندوستانی اپنے ناقدین کو جن القاب سے یاد کرتے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:۔
زمانہ بھر کے کمینے، صحافتی چوہوں کا گروہ، ناتراشیدہ کندے وغیرہ"

۶

صورت حال کی یہ ایک نہایت ہی مایوس کن تصویر ہے۔ جس کے پیش کرنے میں تنگدلی یا کم ظرفی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ یہ مرقع اگرچہ ایک انگریز کے قلم سے تیار ہوا ہے لیکن اگر ہندوستانی انشا پردازان احوال کو

قلمبند کرتے تو وہ اس سے زیادہ مایوس کن ہوتے کیونکہ خود ہندوستانیوں کو اب اپنی ترقی کی کوئی اُمید نہیں ہے۔

مذکورۂ بالا تمام تفصیلات کے باوجود میں پرامید ہوں کہ ہندوستانی صنعت فلمسازی کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اس کے بہت سے وجوہ ہیں جن کے منجملہ صرف تین وجوہ کے اظہار پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اب تک تو ہندوستانی فلموں کی طوالت برداشت سے باہر تھی۔ معمولاً فلموں کا طول پندرہ ہزار فٹ ہوا کرتا تھا اور تماشائی عام طور پر اس کا مطالبہ بھی کرتے تھے۔ ان کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ طویل فلمیں دیکھ کر ٹکٹ کی پوری قیمت وصول کی جائے۔ اداکاروں، تمثیلوں کے مصنفین اور ڈائرکٹروں سے انھیں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ جب پردہ پر یہ دیکھ لیتے کہ فلم کا طول فرض کیجئے (۱۵۴۸۷) فٹ ہے تو بس وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے گویا فلم کی طوالت اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے جنگ کی وجہ سے اب ایسے غیر معمولی طویل فلم تیار نہیں ہوسکتے کیونکہ سلولائڈ کی قلت کے باعث حکومت نے یہ حکم جاری کردیا ہے کہ کوئی فلم گیارہ ہزار فٹ سے زیادہ طویل نہ ہو۔ عام تماشہ بین گو اس پر بہت ششدر ہوئے حتیٰ کہ اس کو بھی انھوں نے برطانوی حکومت کے تشدّد کی ایک مثال قرار دیا لیکن فلمساز اور سمجھدار سینما بین اس امتناع پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں گو یہ ایک معمولی سی بات ہے مگر مستقبل کی ترقی کا اہم پہلو ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی فلمیں جدید میلانات کا ساتھ دیسکیں گی اگرچہ یہ صورت محض جنگ کی وجہ سے معرض وجود میں آئی ہے۔ دوسری دو وجوہ بڑی حد تک ایجابی ہیں۔

ایک کا تعلق ہندوستانی اداکاروں سے ہے۔ کیونکہ یہی ہندوستانی

صنعت فلم سازی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ ان میں تمثیل کے حسن و قبح کا
ایک فطری شعور موجود ہوتا ہے اور پرندوں کی نغمہ سنجی کی قدرتی صلاحیت
کی طرح اداکاری بھی ان میں ودیعت ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کسی
لڑکی کو ایک ہی دفعہ کی آزمائش کے بعد اداکاری کا موقعہ مل جاتا ہے اور
اس کی اداکاری کسی شخص کے نزدیک بھی قابل اعتراض نہیں سمجھی جاتی
تھوڑا بہت سیکھے بغیر وہ "فلم اسٹار" مشہور ہونے لگتی ہے جس سے ظاہر
ہوتا ہے کہ یہاں کے اداکاروں میں اس فن کی کتنی اچھی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ہندوستانی
فلم ساز اپنے مغربی متقدایان فن کے خلاف اداکاروں پر خواہ وہ مرد ہو یا
خواتین سخت پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ان کے چہروں کے نقش و نگار
دلکش، ان کے حرکات و سکنات پرمعنی اور جذبات اتنے وافر اور فطری
ہوتے ہیں کہ فلم سازوں کی طرف سے عائد شدہ پابندی حوصلہ افزائی کے
بجائے اداکاروں کی پست ہمتی کا موجب ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ
ملک میں شاندار انسانی نمونے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دنیا افغانوں سے
بہتر کوئی مردانہ نمونہ پیش نہیں کر سکتی۔ بڑے بڑے شہروں کی سڑکوں پر
آپ کو آہو چشم، دلفریب نقش و نگار والی نازک مگر مضبوط قد و قامت کی
خوبصورت لڑکیوں کی ٹولیاں نظر آئیں گی جن کا فلم ڈائرکٹر ہمیشہ خواب دیکھا
کرتے ہیں، جہاں تک نرالے اشخاص کا تعلق ہے ——— تشدد، متعصب
گنوار، جادوگر، اور مضحکہ خیز لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ دنیا بھر میں ہندوستانی
فلم سازی کے درخشاں مستقبل کا دوسرا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ قبل ازیں میں نے
اس کا اظہار کر دیا ہے۔ وہ مادر ہند کی اعماق چشم میں پوشیدہ ہے۔ وہ اس
کے ضعیف چہرے کی ہر شکن سے ظاہر ہے۔ مادر ہند دنیا کی سب سے بڑی

داستان گو ہے ۔ اس کے افسانے غیر مختتم منطقہ عادہ کے اس ملک کا ہر حصہ قربانی
جوش و خروش، تبرک اور مقدس قابل بیان داستانوں سے وابستہ ہے ۔ اب
جبکہ مادر ہند بیدار ہو رہی ہے اس کے قدیم تاریخی ذخیرہ میں تاریخ جدید کے
ہیجان خیز واقعات کا اضافہ کیا جائے گا جو یکے بعد دیگرے عدم سے وجود میں
آ رہے ہیں اور فضا جہل و غلامی کی ٹوٹتی ہوئی زنجیروں کی جھنکار سے معمور
ہو گی ۔ اب مادر ہند کا فرض ہے کہ تازہ ہوا میں سانس لینے اور جدید دنیا کے
آزاد خیالات پر غور و فکر کرنے کے لئے اپنے قدیم قید خانہ سے باہر آئے جو زیادہ
تر اس کے اپنے ہاتھوں کا تعمیر کردہ ہے اور ان خیالات کو آرٹ کی شکل میں
تبدیل کرے ۔ کیا یہ کام اس سے بن نہ پڑے گا؟ میں سمجھتا ہوں کہ جواب
اثبات میں ہے ۔
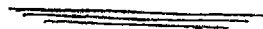
پانچواں باب

آرٹسٹ کی تلاش

یہ ہے وہ مقام جہاں سے حقیقتہً یہ کتاب شروع ہوتی ہے۔
مہینوں تک ہسپتالوں میں، اسٹریچروں پر گزارنے اور بستر علالت پر سے
اٹھنے، پھر جا لیٹنے کے بعد بہرحال میں اس قابل ہو گیا کہ اپنے پیروں پر چل
پھر سکوں۔ آدمی اپنے پیروں سے بھی آنکھوں ہی کے اتنا دیکھتا ہے۔
ذرا آج تک کے حالات کی تلخیص کر دوں۔ ہم نے تخت والسرائے کی
سیڑھیوں سے کسی قدر فاصلہ پر عوام کو دیکھا ہم نے چند مشاہیر سے ملاقاتیں
کیں۔ ہم نے شمال مغربی صوبہ کے اجڑے ہوئے علاقہ کی ایک جھلک دیکھی
اور ہم نے ایک ہندوستانی ہسپتال کا اندرونی حصہ دیکھا، ہمارے بستر علالت
کے گرد بہت سی آوازیں سنائی دیں جنھوں نے ہمیں مسئلہ ہندوستان کی روح
کے مطالعہ کا موقعہ دیا۔ ہم نے ہندو مت کو دیکھا جس نے ابتدا تاریخ کے قدیم
دھندلکے میں ہمیں لے جا کر پہنچا دیا۔ اور ہم نے دوسری طرف ہندوستانی
صحافت اور ہندوستانی فلم کو بھی دیکھا۔
یہ کچھ زیادہ اثر انداز ساز و سامان نہیں ہے اگرچہ یہ اس مواد سے بہت

زیادہ ہے جسے بہت سے مصنفین ہندوستان پر ایک کتاب تصنیف کرنے کے لئے کافی قرار دیتے ہیں۔ بہرحال، آخر تک ہم اس میں معقول اضافہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ہمیں بہت کچھ کرنا اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ابتداء کہاں سے کی جائے۔ اگر ہمارا مقصد صرف سیاسیات ہوتا تو ظاہر ہمیں گاندھی جی سے ملاقات کرنی چاہیئے تھی، لیکن اتفاق سے گاندھی جی اِن دنوں نظر بند ہیں ان کی نظر بندی بجا ہے یا بیجا؟ اس سوال پر تو ہم اپنے وقت پر غور کریں گے اس وقت یہ مسئلہ کچھ زیادہ غور و فکر کا محتاج نہیں۔ اگرچہ ہم کو سیاسیات سے بڑی دلچسپی ہے لیکن ہمیں پھر بھی عوام سے کچھ کم دلچسپی نہیں سوال یہ ہے کہ ہم عام آبادی کے متعلق کہاں سے اور کس طرح معلومات مہیا کریں؟ قومی نفسیات کو سمجھنے کی کوئی قریب کی راہ ہے؟ —— ہم عوامی جذبات کو یکجا مجتمع، اور عوامی تمناؤں کو ممتاز صورت میں جھلکتی ہوئی کہاں پر دیکھ سکیں گے۔

ظاہر ہے کہ آرٹ میں۔ جدید ہندوستانی آرٹسٹ اور جدید ہندوستانی ماہرینِ تعلیم وہ لوگ ہیں جو عوام تک ہماری رہبری کریں گے۔ یہ ہمیں وہ نمونے دکھائیں گے جن میں عوام اجتماعی حیثیت سے موجود ہوں گے اور اس طرح عوام کے خیالات کی بلند و پستی ظاہر ہو جائے گی۔ یقیناً سارا زور لفظ "جدید" پر ہے، مینار، مساجد، مقبرے، قدیم عمارتیں دوسرے درجہ پر ہیں۔ یہ چیزیں تو ہر شخص کی ثقافتی وراثت ہیں۔ تاج محل کے ہزاروں فوٹو دیکھے ہیں ان سے تاج محل کا اندازہ بھی ہے۔ اجنتا کی رنگ آمیز لیل کا مطبوعہ نقشہ ہم سب دیکھ چکے ہیں۔ دنیا کے عجائب خانے ہندوؤں کی گلی ہوئی مورتیوں مغل دور کی چھوٹی تصاویر اور راجپوتی کتب کی خطی شبیہوں سے بھرے پڑے ہیں۔

اِن چیزوں کو دیکھنا ایک دلچسپی کا باعث تو ہوگا مگر ویسی ہی دلچسپی کا جیسے کسی ایسے مغنی کا گانا جس کے گراموفونی ریکارڈ بار ہا سُن چکے ہوں ـــــ تلاش تو ہے نئے چمن اور نئے مرغزار کی۔

۳

یہ بد قسمتی ہے کہ ہمیں اپنی تلاش کو بمبئی سے شروع کرنا پڑا۔ کیونکہ یہ شہر تعمیری غلط کاریوں کا ایسا بے مثال نمونہ ہے کہ اس پر ایک سرسری نظر ہی کسی ذکی الحس سیّاح کو دوسرے ڈاک جہاز سے گھر واپس کر دینے کے لئے کافی ہے۔

باب الہند سے لے کر جو بادی النظر میں ماربل آرچ کا ایک بھاری بھرکم ایڈیشن ہے، اور اسے چالاکی سے اس طرح قائم کر دیا گیا ہے کہ مستقل طور پر ڈرائنگ کے حدود سے خارج ایک عجیب شئے بن کر رہ گیا ہے۔ روئی ملز کے چاروں طرف پھیلی ہوئی گندہ گلیوں تک پورا شہر بمبئی ایک طویل خارج الزوایہ اور تکلیف دہ نقشہ ہے۔ آلڈس ہکسلے نے کیوں بمبئی کو ہر دو نصف عالم میں تعمیری اعتبار سے سب سے زیادہ مہیب شہر لکھا ہے؟ کیوں لکھا ہے؟ یقیناً وہ کسی بدتر کے دو بدو نہ ہو سکتے ہوں گے؟ بمبئی میں مہیب پسندی کا ذوق جنون کی حد تک پایا جاتا ہے۔ آدمی شہر کے اندر اینٹ و چونے کے ہیبت ناک ہیکلوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اور یہ ہیکل ایک کے بعد دوسرا آتا رہتا ہے۔ آدمی یہ سوچتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ لیکن یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بد سے بدتر نمونے ملتے رہتے ہیں۔

بمبئی شہر کے اندر ایک معتدل احساس کا آدمی بھی ایک قسم کے

جمالیاتی اشتعال کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طرز تعمیر نہ صرف مہیب ہے بلکہ بلغایت درجہ دل آزار بھی ہے۔ سرکاری عمارتیں ڈراؤنے خوابوں کی کاکی بلا کی طرح کھڑی ہیں جو اُچھل کر آدمی کو نگلنے کو تیار معلوم ہوتی ہیں۔ یہ عمارتیں ایک ایسے بدنما پس منظر کے سامنے بنائی گئی ہیں جو غیر مرتب طور پر سارے ساحل سمندر پر پیدا ہو گیا ہے۔

یہ بے قاعدہ شہر جس کی کسی عمارت کو غنایت ہی سے تیسرے درجہ کا گنا جا سکتا ہے، برطانوی شہنشاہیت کے لئے ذلت آفریں ہے۔ یہ ہم کو ہُن عہد کی سطح تک پہنچا دیتا ہے اور حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ مسٹر کیسلے کے سوا کوئی آدمی نہیں جس کے دل میں اس کا ذرّہ برابر احساس ہو۔ مثال کے طور پر شہر کی بلدی عمارتوں کو دیکھو، ٹھیک وسط شہر میں تعمیر کی گئی ہیں اور ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے دو رجبری کے دیو کشتی لڑنے کو کھڑے ہوں۔ یہ عمارتیں نہ صرف دیو ہیکل ہیں بلکہ نہایت بیہودہ قسم کا فنی خلط ملط بھی ان میں پایا جاتا ہے۔ ایک ہی نظر میں تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ گوتھک، سارا سینی اطا دوری ہندو، اور عہد وینس سینرر کے طرز ہائے تعمیر ان میں مخلوط کر دیئے گئے ہیں۔ سر ایڈون آرنلڈ نے اس ہیبت ناک مظاہرہ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ سب کی سب بہت خوب ہیں، اور مشہور صحیفہ نویس جی۔ ڈبلو اسٹیونس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بمبئی میں ہندوستان بھر سے زیادہ عمدہ اور شاندار عمارتیں پائی جاتی ہیں، بلکہ انھوں نے دنیا کے سارے شہروں کو مقابلہ کی دعوت دی ہے۔ اس پر مزید اضافہ یہ کیا ہے کہ ایک برطانوی شخص بمبئی کو دیکھتے ہی یہ محسوس کرنے لگتا ہے وہ نسبتہً عظیم تر انسان واقع ہوا ہے۔

ان بیانات نے مجھے یہ خیال کرنے پر مجبور کیا کہ برطانیہ جتنا جلد ہندوستان کو چھوڑ دے اتنا ہی بہتر ہے۔

بہرحال، اس مسئلہ کو دیکھنے کا یہ کوئی معقول طریقہ نہیں۔ ہر قوم میں وہی طرز تعمیر پایا جاتا ہے جو اس کے حسب حال ہوتا ہے۔ باشندوں میں بڑی اکثریت ہندوستانیوں کی ہے، وہی لوگ بلدیہ کا نظم و نسق کرتے ہیں، اور ان کے کام میں عملاً باہر سے کوئی دخل اندازی بھی نہیں ہوتی۔ ان ہی نے ان شیطانی عمارتوں کے لئے روپیہ مہیا کیا ہے، چاہے وہ عمارتیں سکونتی مکانات ہوں یا تجارتی کوٹھیاں۔ برطانیہ یا کسی اور نے ہندوستانی کروڑپتیوں سے زبردستی یہ منزلیں نہیں بنوائی ہیں جو خدا اور انسان دونوں سے تمرد اور گستاخی کے برابر ہیں۔

یہ ہندوستانیوں کو پسند ہیں؟ نہیں! ایسا کہنا صحیح نہیں، ہندوستانی نہ اسے پسند کرتے ہیں اور نہ ناپسند، وہ بالکل بے پروا ہیں، اور ان کو بے توجہی سے چونکانا بھی ناممکن نظر آتا ہے۔

تاج محل ہوٹل کے ایک جلسۂ عام میں میں نے چونکانے کی کوشش کی۔ جلسہ میں اکثریت بمبئی کے تعلیم یافتہ لوگوں کی تھی۔ میں کھڑا ہوا اور میں نے کھڑے ہو کر ان کے شہر کی نہایت درشت اور غیر مصالحانہ لب و لہجہ میں تقریباً ۲۰ منٹ تک توہین کی۔ میں نے جی کھول کر گالیاں دیں، اور مزید برآں اسے ناقابل برداشت بنا دینے کے لئے شخصی و ذاتی حملے کئے، نام لے لے کر بتایا کہ فلاں کروڑپتی کا مکان بدنما ویڈنگ کیک کے مشابہ ہے۔ اور فلاں کا گھر طمع کی ہوئی چوہے دانی معلوم ہوتا ہے۔ کوئی غیرت دار گھوڑا اس شہر میں سے گزرنے کی بجائے سمندر میں کود کر جان دیدینے کو ترجیح دے گا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے تباہ کر دینے کا مشورہ بھی دیا اور کہا کہ اگر حاضرین میں سے کوئی ان مکانات کو منہدم کر کے پیوند زمین کر دے تو ــــ تو کراہتی ہوئی انسانیت کے حق میں اس کا یہ فعل حقیقتہً ایک رحمت ہوگا۔

ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ یہ تنقیدیں کس قدر تلخ ہیں بمشکل ہی سے ان کو شکوہ شکایت قرار دیا جا سکے گا۔ اگر کوئی شخص ملاحیوں میں مہارت نہ رکھتا ہو تو پھر اس سے زیادہ پر زور انداز میں اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتا۔

نتیجہ کیا نکلا۔ خوشگوار تبسم۔ دلآویز ہلکی سی بناوٹی ہنسی نہ سرخ چہرے اور نہ اظہار غیظ و غضب، اس قسم کی کوئی چیز نہیں۔ ان اثرات سے، یا اس بے اثری سے اگر تم اندازہ لگانا چاہو تو بس یہ سمجھو گے کہ شاید ان حاضرین سے یہ کہا گیا ہے کہ گلاب کی کتنی خوبصورت بیلیں تمہارے دروازوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔

دوسرے دن میں نے اس امید سے اخبارات خریدے کہ بہر حال حاضرین میں سے کسی نہ کسی کے ذریعہ پورا قصہ اخبار نویسوں تک پہنچ ہی گیا ہوگا۔ میں ایک ایسا شخص تھا جس کو نہ جانے کن اسباب کی بنا پر انھوں نے "سکاٹا تو آ" بنا ہی رکھا تھا۔ اب یہ کاٹا تو آ بول اٹھا، ورنہیں، بولا ہی نہیں بلکہ چیخا دانت نکالے، اور اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ یہ سب کچھ ان ہی کے اپنے گھروں ان ہی کی سڑکوں، اور ان ہی کی تجارتی کوٹھیوں کے خلاف ہوا۔

لیکن کسی اخبار نے ... ایک پیراگراف لکھنے کے قابل بھی اس تقریر کو نہ خیال کیا، البتہ معمولی درجہ کی متفرق سیاسی باتیں جو تقریر کے بقیہ حصہ میں مذکور تھیں، ایسی جلی اور نمایاں سرخیوں میں چھاپی گئیں جیسے خارش زدہ

حملہ کی خبر چھاپی گئی تھی ۔ وہ واحد چیز جو دلچسپ اور جدت آفریں چیز تھی بالکل نظر انداز کر دی گئی تھی (میں نے اس تنقید و تنقیص کے بعد ایک تفصیلی نقشہ فائن آرٹ منسٹری کے قیام کا بھی پیش کیا تھا) ۔ لیکن کسی نے پرواہی نہ کی ۔

یہ حالت سارے ہندوستان میں طاری ہے ۔ اگر تم ہندوستانی کروڑپتی کو اس کے منہ پر یہ کہہ دو کہ تمہارے یہ شاندار محلات کو منہدم کر کے زمین کے برابر کر دیا جانا چاہیئے یا گندے اور امراض پیدا کرنے والے حشرات الارض کا عجائب خانہ بنا دینا چاہیئے، تو وہ اس کے جواب میں صرف طنز آمیز تبسم کرے گا ۔ یہ لوگ نہایت ہی ناقابل توجہ سیاسی بیان پر تو بھڑک اٹھیں گے، لیکن اگر کہہ دو کہ تم لوگ پرلے سرے کے وحوش اور جنگلی ہو تو اس کے جواب میں صرف مسکرائیں گے ۔

یہ ایک ایسا رجحان طبع ہے جو کچھ ہی دیر میں تھکا دینے والا ثابت ہوتا ہے ۔

۳

ہم اب ایک بے داغ دیوار کے سامنے پہنچ گئے ۔

یہ بے داغ دیوار " بمبئی میں آرٹ " ہے ۔

اگر تم سرکاری " رہنمائے بمبئی " کی ورق گردانی کرو (جو ۱۲۲ صفحات کی باریک چھپی ہوئی کتاب ہے) تو کسی عنوان سے تمہیں آرٹ کا ذکر اس میں نہیں ملے گا ۔

اگر تم کسی معمولی درجہ کے یورپین سے سوال کرو گے کہ تصویریں کہاں دیکھ سکتے ہو تو پہلے وہ تمھیں قریب ترین سینما کا پتہ بتائے گا، اور اس کے بعد ایک قہقہہ کے ساتھ قحبہ خانہ کا۔ اگر تم نے کسی تعلیم یافتہ ہندوستانی شخص سے یہی سوال کیا تو وہ ایک سرد آہ کھینچ کر کہے گا۔ الف صاحب کے گھر بے صاحب کی متعدد تصاویر ہیں۔ وہ بڑی مسرت کے ساتھ تمھیں یہ تصویریں دکھائیں گے۔ ان کا گھر یہاں سے دو سو میل پر فلاں جگہ واقع ہے اور غالباً وہ تمھیں اپنے ہاں چائے پر مدعو بھی کریں گے۔

اب اگر تم نے بے صاحب کی تصاویر کے متعلق تحقیقات شروع کر دی تو پتہ چلے گا کہ ان حضرت کے علاوہ کسی اور نے آج تک بے صاحب کا نام سنا ہی نہیں۔

اگر اتفاقاً تم کسی سنکی دوست کے ہاں جا پہنچے جو جدید تصاویر دیکھنا چاہتا ہے، اور تم نے اس پر سوالات کی بوچھار کر دی تو پھر ان سوالات کے مختلف منفی جوابات ملیں گے جن سے تم عاجز ہو جاؤ گے۔

...... لیکن یہاں آرٹ کا کوئی نہ کوئی خزینہ تو ہوگا؟

...... کوئی نہیں۔

کوئی نہ کوئی نگار خانہ تو بہر حال ہوگا، شخصی، خاص نہ؟

بالکل نہیں۔

کچھ نہ کچھ تنقید و تبصرہ کا سلسلہ تو ہوگا۔ تنقیدی رسائل۔ حلقہ، مطالعہ وغیرہ؟

نہیں۔

تمھارے اس قدر سخت اصرار کو دیکھ کر آخر ش ایک اجمالی جواب ملے گا۔

ہاں! ایک "بمبئی آرٹ سوسائٹی" ہے۔

بمبئی کے طرز تعمیر پر اس قدر تھکا دینے والا اور طویل بیان لکھنے کے بعد میں اپنے ناظرین پر بمبئی آرٹ سوسائٹی کے نتائج عمل کی تفصیلات کا فضول بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں انھیں دیوار پہ جگہ بھی نہیں دی جاسکتی بہرحال جیسے ہی ہم ان بھدی اور بدنما تصاویر پہ سے پردہ ہٹاتے ہیں، ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ تصویریں سرسری طور پر دو اقسام پر مشتمل ہیں۔

اوّل، بڑی حد تک تو یہ اجنٹا[1]، مغل[2] دور اور راجپوت[3] عہد کی رنگ آمیزیوں کی اندھی تقلید کا سلسلہ ہے۔

دوم، فرانسیسی اثر پرست نقاشوں کی تابہ دور رینائر تقلید محض سے

---

[1] اجنٹا کے غار ریاست حیدرآباد میں ہیں۔ یہ غار پہاڑ کے پہلو میں چٹانوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں ان کا ابتدائی مقصد بودھی فقیروں کی قیام گاہ بنانا تھا۔ ان کی ابتداء تقریباً سنہ ۲ ق م میں ہوئی۔ دیواروں پر نقاشی و مصوری جو کی گئی ہے، اس کی تکمیل پانچویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ یہ ہندوستان کی بے مثال اور بہترین فن کاری ہے جو وراثت میں قدیم سے ملی ہے۔

[2] مغل دور حکومت (سنہ ۱۵۵۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء) تک رہا۔ خاکوں اور تصاویر کے لئے قابل ذکر ہے۔

[3] اس کا زمانہ سنہ ۱۵۵۰ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک ہے۔ یہ سراسر ہندوانہ آرٹ ہے۔ اور شمالی ہند کے دو علاقے راجپوتانہ اور پنجاب کے ہمالیائی حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔

زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں اس دوسری قسم سے سروکار رکھنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ لیکن پہلی قسم سے سروکار تو رکھنا ہی پڑے گا کیونکہ ہمیں سارے جزیرہ نمائے ہند میں ہر جگہ اسی قسم سے واسطہ پڑے گا۔

ہم بار بار یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کا نوجوان آرٹسٹ سیدھا ماضی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس کے نزدیک جدید آفتاب کبھی طلوع ہی نہیں ہوتا ان بچاروں کے لئے آفتاب کی کرن بہت دور صرف اجنٹا کے کھنڈروں ہی میں سے ہلکی ہلکی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک قابل لحاظ واقعہ ہے کہ ان نوجوان خیال پرستوں کی نظر میں ان کے لئے سرمایہ تخیل اجنٹا ہی سے مہیا ہو سکتا ہے بلا شبہہ یہ لوگ پکے قوم پرست ہیں، نعرہ ہمیشہ ہی لگاتے ہیں کہ "آگے بڑھو" اور نظر ہمیشہ پیچھے ہی ڈالتے ہیں۔

اس انوکھے مظاہرہ (اجنٹا) سے بھی کچھ معلوم کرنا ہی ہے ہم اس کو بہترین طریقہ پر اس طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ بمبئی کو چھوڑ حیدر آباد کی ٹرین پکڑیں۔

ہم نے حیدر آباد کا انتخاب اس لئے کیا کہ ہندوستانی ریاستوں میں حیدر آباد ایک ایسی جگہ ہے جہاں جائز طور پر کسی نوجوان آرٹسٹ کے پائے جانے کی امید کی جا سکتی ہے۔

ریاست حیدر آباد رقبہ میں فرانس کے برابر ہے۔ یہ ایک ترقی پذیر اور بڑا خوش حال علاقہ ہے۔ اس کے فرمانروا دنیا میں سب سے بڑے دولتمند انسان مشہور ہیں۔ صرف ان کے جواہرات کا اندازہ تقریباً بیس کروڑ پونڈ کیا جاتا ہے۔ ان کی شخصی ملکیت میں سونے کی اتنی بڑی مقدار ہے کہ اگر وہ کسی وقت اسے کاروبار میں لگا دیں تو ساری دنیا میں معاشی

زلزلہ آجائے وہ مسلمہ طور پر ایک روشن خیال بادشاہ ہیں۔ اگرچہ ان کی حکمرانی دستوری انداز کی ہے لیکن پھر بھی وہ عظیم الشان شخصی اختیارات رکھتے ہیں۔

اس کے ماسوا حیدرآباد میں شاہی آفتاب کے گرد چھوٹے چھوٹے معاشرتی ستاروں کا ایک جھرمٹ ہے۔ حیدرآباد شہر میں محلات اور ڈیوڑھیاں اسی طرح عام ہیں جیسے شہر پیرس میں سگریٹ کی دوکانیں۔ یہ بھی کافی ہو، تو سن لو کہ حیدرآباد میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو درخشاں مسز سروجنی نائیڈو کانگریس کی سابق صدر اور گاندھی جی کی مقرب ترین دوست کے کمرۂ ملاقات میں دکھائی دیتی ہے۔

یقیناً ایک نوجوان آرٹسٹ اپنے دل میں بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است وہمین است وہمین است

ہم اس فردوس ارضی میں داخل ہوتے ہیں۔

حیدرآباد میں جدید آرٹ کی ہماری تلاش اسی دن سے شروع ہوگئی جس دن کہ ہم وہاں پہنچے۔ تلاش کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ اس قدر امتیازی شان رکھتا ہے کہ ہم اسے آخر تک بیان کریں گے یہی طریقہ ہو بہو مدراس، میسور، کلکتہ اور لاہور وغیرہ میں کام آئے گا۔

...... میں کچھ جدید ہندوستانی آرٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔

..... بہت خوب! آپ کو اجنتا کے غار دیکھنا چاہیئے۔

کسی قدر توقف۔ جس میں یہ واضح کیا گیا کہ پانچویں صدی مسیحی کے بعد کی چیز دیکھنی مقصود ہے۔ پھر دوبارہ توقف، اور اس کے بعد ....

کیا مکہ مسجد آپ نے دیکھ لی؟
کسی قدر ترش ہو کر "اس خوشنما اور نفیس عمارت کی بنیاد تو ۱۰۲۳ھ میں رکھی گئی تھی ــــــــ لیکن ابھی تک کافی ترشی مزاج میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔

مسجدوں، اور مندروں کی ایک طویل فہرست کو ہم نے فی سٹ ایک صدی کی رفتار سے دیکھا۔ لفظ جدید کی اتباع کرتے اور جدید کی تلاش میں ہم انیسویں صدی کی ابتدا تک پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہم ٹھہر گئے۔
مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی ایسے ہندوستانی آرٹسٹ کا کارنامہ دیکھوں جو ابھی زندہ ہو؟

زندہ ہو، زندہ ہو، انھوں نے بات دہرائی۔
اس کے بعد تھوڑی دیر تک اپنے ذہن میں اس سوال کو بار بار دہرایا۔ یہ لوگ کسی ایسے ہندوستانی آرٹسٹ کو جانتے ہیں جو ابھی زندہ ہو؟ ہاں! صرف ایک کو ــــــ یہ ہر جگہ سب سے بڑا ہندوستانی آرٹسٹ ہوتا ہے اور ہر مقام پر اس کی شخصیت بدلتی رہتی ہے۔ بنگال میں یہ ٹیگور ہوتا ہے، اور دہلی میں جامینی رائے، مدراس میں یہ شخص چودھری ہو جاتا ہے۔
اور یہاں حیدرآباد میں یہ چغتائی تھا۔
لوگوں نے کہا "ہمارے ہاں چغتائی کی تصاویر کا بڑا اچھا مجموعہ ہے"

اگرچہ میں نے چغتائی کی کوئی تصویر دیکھی نہ تھی لیکن میں ان کا نام سن چکا تھا۔ اور اس وقت تو ان کے فن کا کمال اس لاثانی حقیقت سے کمتر معلوم ہوتا تھا کہ چغتائی صاحب ابھی تک مرے نہیں ہیں۔

کیا آپ کو اس کا یقین ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں؟
(پہلے رہنما نے کہا) ہاں! ہاں! وہ زندہ ہیں؟
(دوسرے رہنما نے تصدیق کی) بالکل زندہ!

جناب چغتائی صاحب کے زندہ ہونے کی پوری تحقیق ہوگئی، اب ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کے مرقع جات کو دیکھیں یہ مرقع جات اتنی دور پر تھے جتنا ہم خیال کر سکتے تھے۔ صرف یہی وہ جدید مرقع جات تھے جو پورے شہر حیدرآباد میں کہیں لٹکے ہوئے تھے۔

۵

لٹکے ہوئے، ارے! کیا میں نے "لٹکے ہوئے" کہہ دیا؟
یہ لفظ بے محل استعمال ہوگیا!

کیونکہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جو اگرچہ تھا تو محض معمولی مگر تاہم اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جب میں عجائب خانہ میں پہنچا اور میں نے ناظم صاحب سے (جو ایک دلکش شخصیت کے بوڑھے آدمی ہیں) اپنا مقصد بیان کیا تو وہ مجھے ساتھ لے کر چلے اور سیڑھیوں اور لمبی غلام گردشوں میں سے گزرے، یہاں سیکڑوں دھندلے قدیم مرقع جات لگے ہوئے تھے۔ آخر میں ہم پچھلے دروازہ پر پاخانہ کے قریب پہنچے۔ یہاں پر دیوار سے لگا اور گرد و غبار سے ڈھکا ہوا اس چغتائی کی تصویروں کا ایک ڈھیر تھا جس کا نام اس قدر مشہور اور معروف ہے اور جس کے بارے میں تمھیں یاد ہوگا کہ "ابھی تک زندہ ہیں"
لیکن کیوں . . . . میں سوال کرتے کرتے رہ گیا، سوچا کہ شاید

یہ سوال بے ادبی و گستاخی پر محمول کیا جائے۔ میں سوال یہ کرنا چاہتا تھا کہ جناب چغتائی گرد و غبار میں اٹے ہوئے پاخانہ کے دروازہ پر کیوں بیٹھے ہیں؟ بتایا تو یہ گیا کہ وہ اور صرف وہ ایسے جدید مصور ہیں جن کے کارناموں کو حیدرآباد کے مسلم الثبوت فن کاروں نے تسلیم کیا ہے اور بہر صورت، صرف وہی ایک ایسے مصور تھے جن کی طرف میری توجہ مبذول کرائی گئی تھی، پھر یہ ناخوشگوار پوزیشن کا کیا مطلب؟

ناظم صاحب نے معذرت کے انداز میں کہا کہ ہمیں اُن کی تصویروں کے لئے کوئی جگہ نہ مل سکی۔

لیکن یقیناً کوئی جگہ ہونی تو چاہیئے تھی؟

نہیں، کوئی جگہ نہیں ہے (افسوس، اس لئے کہ ہم اسے ہندوستان کا سب سے اچھا مصور سمجھتے ہیں)

یہ کتنے دنوں سے یہاں پڑی ہیں۔

کئی سال سے۔

اور اس کے بعد بھی آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ سارے حیدرآباد میں کوئی ایسا کمرہ نہیں جس کی ایک دیوار پر ایک ایسے شخص کی بنائی ہوئی تصویریں لٹکائی جا سکیں جسے آپ ہندوستان کا سب سے بہتر جدید مصور بتا رہے ہیں۔

حقیقتہً نہیں! یہ بات عجیب تو ہے لیکن سچی ہے۔

اس عجیب و غریب صورت حال پر اظہار تعجب کرتے ہوئے میں نے تصاویر کو دیکھنا شروع کیا، تصویروں پر غائر نظر ڈالنے سے مجھے صدمہ ہوا، کیونکہ چغتائی صاحب ممکن ہے کہ گوشت پوست سے زندہ ہوں لیکن جس زندگی کو انھوں نے پیش کیا ہے وہ مغربی معیار پر نہایت نمایاں اور واضح طور پر

بے جوڑ زرد اور پھیکا نمونہ ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے کارناموں کے متعلق فیصلہ کرنے میں مغربی معیار قابل قبول نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کوئی تقابلی جمالیاتی تنقید بے کار ہوگی۔ لیکن اگر ہم مغربی معیار کو قبول کریں تو چغتائی کے کارنامے باوجود ان کے قابل لحاظ فنی کمالات کے مجھے وہی پرانی کہانی کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہی المناک کہانی جو ہندوستان اپنی ہزاروں آوازوں سے کہہ رہا ہے۔ یہ آرٹسٹ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ماضی کے اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ وہ قدیم افسانوں کے مناظر کی صدق دل سے تمنا کرتا ہے اور یاس کے ساتھ کوشش کرتا ہے کہ اس چمک کی وہ ایک کرنیں اپنی تصاویر میں واپس لے آئے جو مدت ہوئی کہ بجھ چکی ہے۔ لیکن یہ مناظر جادو کی گڑیا کے سایے کی طرح ہیں جو بار بار اس سے بچ نکلتے ہیں۔

ان کے شاگردوں میں، جن کی تعداد بڑی کثیر ہے یہ ذہنیت تکلیف دہ مبالغہ کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ چغتائی صاحب بیرڈس لے ———— ———— اور اس کے ان نقالوں کے بڑی حد تک منت کش ہیں جو اپنے خاکوں کو بیرڈس لے کی خاص رنگ آمیزی سے مزین کرتے ہیں۔ چغتائی صاحب سولہویں صدی کے چینی آرٹ سے بھی بہرہ اندوز ہیں اور ان کے نقال اپنی تصویروں میں اسی طرح بانسوں کے سینگ لگاتے ہیں جیسے چینی اپنے بانسوں کو ہوا میں سرسراتا ہوا رکھتے ہیں۔ اور یہ شاگرد صرف اسے زمین میں گاڑ کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں دیکھو ہر جگہ اجنٹا کے اثرات موجود ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اجنٹا کے آرٹسٹوں نے ایک تیز روشنی دیکھی تھی اور اسے حاصل بھی کیا تھا۔ اور ان کے یہ جدید شاگرد افسوسناک طریقہ پر

صرف اندھیرے میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے ایک ٹوٹے ہوئے لیمپ سے ٹکرا کر رہ گئے ہیں۔

میں نے بری طرح نقصان محسوس کی اور جتنی جلد ممکن ہوسکا بوڑھے اور کرم فرما ناظم صاحب سے اجازت لی اور اپنی آنکھوں کو کسی قدر ماقبل کے لکھے ہوئے ایرانی طرز کے مخطوطات کی رنگا رنگی سے سکون دیا شکر ہے کہ مردہ حال سے زندہ ماضی میں واپس آگیا۔

ان سب کے باوجود میں یقین رکھتا ہوں کہ چغتائی صاحب کا کارنامہ اس قابل ہے کہ اس کو موجودہ مقام یعنی پاخانہ کے دروازہ پرڈالڈینے سے زیادہ بہتر جگہ دی جائے۔ وہ کم ازکم یہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اور فنی طور پر وہ اس قابل ہیں کہ جو کہنا چاہتے ہیں اسے کہہ سکیں۔ ان چھوٹے چغتائیوں کی جماعت نوجوان کے نقش قدم کی پیروی کرتی ہے، اس قدر دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔

۶

خدا کے لئے یہ شکوہ شکایت بند کیجئے، اور کوئی خوشگوار بات کہنے کے لئے تلاش کرکے نکالئے۔ ممکن ہے کہ کتاب کے پڑھنے والے گھبرا کر یہ کہہ اٹھیں۔ لیکن میں ان کی دل سے ہمنوائی نہیں کرسکتا کوئی خوشگوار بات کہاں سے، کس طرح اور کون سی بات نکالی جائے یہ اس قدر آسان کام نہیں جتنا تمھیں نظر آتا ہے۔

ایک ہندوستانی رائے ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مسلّم محقق ڈاکٹر کمار سوامی اپنی کتاب کلچرل ہیریٹیج آف انڈیا (ص ۱۰۵ ج ۴) میں فرماتے ہیں۔

"بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ آرٹ کی مقدار
اس کے معیار، چابکدستی، آرٹسٹ کے وجود، اور اثر
انداز ذوق سلیم میں ہمارا موجودہ افلاس تاریخ عالم میں
بے نظیر ہے۔"

شکل ہی سے کوئی تنقید اس سے زیادہ جامع ہوسکتی ہے میں ان
صفحات کو خود ہندوستانیوں ہی کی ایسی مختلف تحریروں سے پر کرسکتا ہوں
جن میں اسی طرح توہین کی گئی ہے۔

القصہ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ دوسرا مقام جستجو میسور تھا، یہاں ایک آرٹ
اسکول کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس آرٹ اسکول کا ناظم ایک مدت تک
اجنٹا میں رہ چکا ہے، اور اس کے جسم کا پیچ وخم ایسا ہے کہ گویا وہ خود بھی اجنٹا
کی تصویروں میں سے ایک تصویر ہے۔ اس کے طلبہ کی بنائی ہوئی تصویریں
بھی نتیجتہً اجنٹا کی تصویروں سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔

بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں سے گزرتا ہوا، اور ناکام جستجو کرتا
ہوا میں بالآخر مدراس پہنچا، مدراس ہندوستان کا تیسرا بڑا شہر ہے یہاں
بڑی بندرگاہ ہے، دولت کی فراوانی ہے اور شہر حیات سے بھرپور ہے۔

مقررہ سوالات پیش کیے گئے، مقررہ جوابات ملے، نہ کسی برطانوی
کو اور نہ کسی ہندوستانی کو مدراس میں کسی آرٹسٹ کی کوئی خبر نہیں (کوئی
کچھ نہیں جانتا۔ مطلب یہ کہ ٹیکسی ڈرائیور اور خدمتگار ہی نہیں بلکہ اچھے
اچھے شہریوں کو بھی کوئی خبر نہیں) ان کے خیال میں بھی نہیں کہ مدراس
میں آرٹ گیلری کے قسم کی کوئی چیز پائی جاتی ہے۔ البتہ انھوں نے
بڑی شان سے یہ بیان کیا کہ کنمارا ہوٹل کے بالکل قریب ہی ایک اچھا

خاصا فوٹوگرافر رہتا ہے۔

ان سب کے باوجود میں اپنے خیال میں لگا رہا۔ میرے تو دل میں یہ بات بسی ہوئی تھی۔ حالات بڑے بے تکے تھے، لیکن کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں تو ہوگا۔

یہاں آرٹ کا ایک مرکز تھا۔

یہ مرکز مسٹر چودھری کا آرٹ اسکول تھا۔

میں نے خود ہی اسے ڈھونڈھ نکالا۔ اور وہ بھی اتفاقی طور پر۔ ایک روز میں شہر کے اندر سے موٹر پر گزر رہا تھا کہ اتفاقاً میں ایک پرانی عمارت کے پاس پہنچا یہ عمارت اس قدر ہیبت ناک نہ تھی جتنی شہر کی اور عمارتیں تھیں۔ مجھے اس عمارت کو دیکھ کر ایک خوشگوار اچنبھا سا ہوا۔ خیال ہوا کہ اُتر کر ذرا اس عمارت کو دیکھیں۔ اس مکان کے گرد چمن تھا، اور سامنے سیڑھیاں تھیں یہ سیڑھیاں ایک کمرہ کو جاتی تھیں جو نگارخانہ کے مشابہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی آرٹسٹ چھپا بیٹھا ہو۔

وہاں حقیقتہً ایک آرٹسٹ تھا۔ میں سیڑھیوں پر چڑھا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک کمرہ میں پہنچا جہاں اس وقت آرٹ کلاس ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے میرے آنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ میں وہاں ٹھہر کر دیکھتا رہا۔

طلبہ کے کاموں پر تو میں حسب دستور توجہ نہیں کرتا۔ ہمارے احساسات پر پہلے ہی کافی بار پڑ چکا ہے۔ لیکن جب طلبہ وہاں سے روانہ ہو چکے تو میں نے مسٹر چودھری سے دیر تک گفتگو کی اور ان کے بعض کام دیکھے پانی میں آگ لگانے کی انوکھی کوشش تو نہیں کی گئی ہے لیکن کم از کم یہ بات

ضرور ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ مسٹر چودھری کے پاس تصویروں کے ذریعہ پہنچانے کو کچھ پیام ہے۔ اور فنی نقطہ نظر سے وہ اس کے اہل ہیں کہ یہ پیام دیں۔

لیکن وہ زبان سے جو کہتے تھے وہ ان کی رنگ کاری سے دیئے ہُوئے پیام سے زیادہ دلچسپ تھا جس حقیقت کا میں اس پورے باب میں ذکر کرتا چلا آرہا ہوں۔ وہ بالکل صحیح تھی۔ ہندوستان آرٹ کے اعتبار سے بالکل ویرانہ ہے۔ یہاں تو اتنی دلدہی بھی نہیں پائی جاتی کہ آرٹ کسی اہمیت کا مستحق ہے۔ البتہ فوٹوگرافر نسبتاً زیادہ اعلیٰ مخلوق شمار کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آرٹسٹ تجارت کے سلسلہ میں کسی قدر کارآمد ثابت ہوتا ہو ورنہ بیچارہ آج اچھوتوں کی سطح پہ ہوتا۔[1]

ہم اس جستجو کو مختصر کر دیتے ہیں۔ اگرچہ کہ یہ ایسی جستجو تھی جو مہینوں تک جاری رہی اور سارے ہندوستان کا ہم نے چکر لگایا لیکن صرف ایک آرٹسٹ ایسا مل سکا جو کسی قابل ہے۔ اس آرٹسٹ کا نام ہے جامینی رائے۔

میں نے پہلے پہل جامینی رائے کو حیدرآباد میں مسز سروجنی نائیڈو کے گھر پر دیکھا تھا، اس کے بعد ان کی تصاویر کے مجموعے کلکتہ، لاہور، اور دوسرے مقامات پر کافی مقدار میں دیکھنے میں آئے۔ جب کہ اس دور کے ہندوستانی آرٹسٹ روگی اور مبہم انداز کی کوششیں کرتے ہیں، جامینی

---

[1] گاندھی جی شاید ہندوؤں کے مکمل عدم احساس کا نمونہ ہوں۔ آرٹ کو وہ نہ صرف اپنی اسکیم میں کوئی مقام نہیں دیتے بلکہ آرٹ کے متعلق وہی کہہ سکتے ہیں جو چسٹرٹن نے ایک بار موسیقی کے متعلق کہا تھا "میں اسے اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ وہ میری یک سوئی میں خلل انداز ہو"۔

کی تصاویر میں زبردست اور اشتعال انگیز اثر پایا جاتا ہے۔ یہ بہت سی
حیثیتوں سے ممتاز اور ایک خاص قاعدہ رکھتے ہیں ان کے ابتدائی کارناموں
میں فان کوگ سے بڑی نسبت پائی جاتی ہے لیکن ان کے فن کا سر
چشمہ بنگال کا عوامی آرٹ ہے جو قوی بھی ہے، نمایاں بھی اور شاندار بھی۔

خود جامینی رائے ایک دلچسپ آدمی ہیں۔ انھوں نے کلکتہ کی بے روح
تجارتی فضا میں اپنے آپ کو پریشان پاکر زندگی کو اس طرح مختصر کردیا جس
میں کامیابی کی پوری امید ہے وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں چلے گئے یہاں
آکر انھوں نے اپنی زندگی اور اپنے آرٹ کو نئے سانچوں میں ڈھالنا
شروع کیا۔ اور اسی مقصد کے لئے وہ دیہات میں آئے تھے۔

انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی پلیٹ بدل دی، یورپی
رنگ جو وہ قدرتی رنگوں کے لئے اب تک استعمال کرتے رہے تھے
بالکل ترک کردیئے۔ اور وہ چیزیں استعمال کرنے لگے جو دیہاتی استعمال
کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے خاکی رنگ کے لئے مٹی، پیلے رنگ کے لئے
ہڑتال، لال کے لئے گیرو، نیلے کے لئے نیل، سفید کے لئے کھریا مٹی، کالے
کے لئے ناریل کے کھوپرے کی راکھ اور کجری کا استعمال کیا۔[1]

کسی دوسرے ملک میں مسٹر رائے کا آرٹ بہت سے شاگردوں
کو اپنی طرف کھینچ لیتا، وہ ایک خاص اسکول کے بانی ہوتے، لیکن یہ چیز
ہندوستان میں نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسٹر رائے
ہر قسم کے مذہبی و سیاسی اثرات سے آزاد ہیں، ان کی تصاویر میں کوئی
ایسی بات نہیں پائی جاتی جس سے آپ یہ معلوم کرسکیں کہ ان کا بنانے والا

---

[1] مقدمہ از شاہد سہروردی، پروفیسر فائن آرٹس کلکتہ یونیورسٹی۔

ہندو، مسلمان، یا عیسائی ہوگا۔ وہ صرف زندگی کو دیکھتے ہیں اور اس کی تصویر بناتے ہیں یہ وہ بات ہے جو ان کے دوسرے معاصرین کے بس سے باہر ہے ان لوگوں کے نزدیک آرٹ کو سیاست کے ہاتھ کا کھلونا ہونا چاہیئے۔ جو اپنے وقت پر مذہب کا کھلونا بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ آرٹ کا صرف ایک اور مرکز ہندوستان میں کسی قدر اہمیت کا حامل ہے جہاں میں گیا ہوتا۔ اس کا نام ہے "شانتی نیکتین" یہ باب شانتی نیکتین کے متعلق کچھ لکھے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

شانتی نیکتین کے لفظی معنی "منزل امن" کے ہیں۔ یہ دارجیلنگ کے قریب پہاڑ کی بلندیوں پر واقع ہے۔ کوئی چالیس سال پہلے رابندر ناتھ ٹیگور نے اسے قایم کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اسے ایک یونیورسٹی بناڈالیں یونیورسٹی تو کبھی شہرِ مندۂ وجود نہ ہوسکی، البتہ ان کے بھائی ابانندرا ناتھ ٹیگور نے اس کو ایک آرٹ اسکول بناڈالا۔ اور اب تک وہ اسی حیثیت سے قائم ہے۔

سارے ہندوستان میں اس کی بڑی عظمت و احترام ہے کیونکہ کوئی چیز رابندر ناتھ ٹیگور سے ذرا بھی نسبت رکھے تو اس کو بھی عظمت حاصل ہوگی۔ یقیناً۔ اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ ٹیگور دنیا کی سب سے بڑی شخصیت تھی اور ایک ہی سانس میں ان کا، ملٹن اور گوئٹے کا نام لیا جانا چاہیئے تو آپ کے دل میں شانتی نیکتین جانے کی تمنا پیدا ہوگی۔ اور اگر آپ میرے ہم خیال ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دلچسپ چھوٹا سا شاعر تھا جو اگرچہ اقرار نہ کرے لیکن ایٹس —— کا بڑی حد تک منت کش تھا تو شاید آپ دور ہی بیٹھے رہیں گے۔

اور آپ یقیناً دور ہی بیٹھے رہیں گے اگر آپ کا اصلی مقصد جدید العصر ہندوستانی آرٹ دیکھنا ہے، میں یہ رائے نہیں دے سکتا کہ ابانندرا ناتھ ٹیگور، اور ان کے متبعین کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنے میں مزید وقت ضایع کیا جائے۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یہ تصاویر ہندوستان کی وہی پرانی کہانی دہراتی ہیں جو ہندوستان بھر میں ذہنی جستجو کے دوران میں ہم سنتے رہے ہیں، یہ لوگ اسی پرانی لکیر کے فقیر ہیں، اجنتا کی ناکام نقلیں اتارا کرتے ہیں، ان کے سب سے زیادہ وسیع القلب عذرخواہ پرسی براؤن اے۔ آر۔ اے ناظم وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ نے اپنی کتاب "انڈین پینٹنگ" میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے۔

> "ابانندرا ناتھ اور ان کے تبعین نے ماضی کی تاریخی رنگ کاریوں کو نظر میں رکھا ہے، اجنتا سگری، مغل دور اور راجپوت اسکول کے نمونے ان کے سامنے ہیں، اور ان ہی بنیادوں پر ایک نئی تحریک کی بنا رکھی گئی ہے... ان آرٹسٹوں کا دھن یقیناً ایک بڑی چیز ہے لیکن کیا یہ اتنی مضبوط بنیادیں ہیں جن پر ایک قومی حیات نو تعمیر ہو سکے؟ یہ آئندہ دیکھا جا سکے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ تو آئندہ ہی دیکھا جا سکے گا۔

۸

یہ باب چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے اتنا پھیل گیا کہ اس کی تلخیص کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ یہ تلخیص میری اس تقریر کے اقتباس سے

مہیا ہو جائے گی جو میں نے بمقام بمبئی مجلس اشاعت تعلیم و تہذیب کے افتتاحی جلسہ میں کی تھی چونکہ اس جلسہ میں رائل سوسائٹی کے صدر پروفیسر ہل نے بھی تقریر کی تھی، اس لئے اس جلسہ کی شہرت اتنی زیادہ ہوئی کہ جتنی شاید دوسری صورت میں نہ ہوتی۔ اور سارے ہندوستان میں میرے خیالات کے غیر متوقع اثرات نے یہ بھی ظاہر کیا کہ شاید یہ کسی قابل تھے۔

میں نے پہلے تو لفظ "آرٹ" کی اس کے وسیع تر مفہوم میں تعریف کی اور بتایا کہ یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ انسان کائنات کے غیر مربوط و رہم برہم ہیولی میں ایک قسم کا نظم پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ ان ستاروں کا ایک مرقع بنانے کی سعی ہے جو آسمان کی سطح پر اس بے پرواہی کے ساتھ پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، پھر میں نے کہا کہ آرٹ اس نظم کے پیدا کرنیکا سائنس یا مذہب سے زیادہ سیدھا راستہ ہے۔ کیونکہ یہ خود اپنی جگہ پر کافی ہے یہ نہ کوئی تشریح پیش کرتا ہے اور نہ کسی تشریح کا محتاج ہے۔

اس کے بعد میں نے ریمبرانڈٹ کا بہ حیثیت ایک آرٹسٹ بطور واضح نمونہ کے انتخاب کیا۔ اس کا تخیل اتنا قوی تھا کہ اس نے پیش پا افتادہ مناظر کو اپنے تخیل کی قوت سے حسین تر بنا کر انھیں ایسے سانچے میں ڈھال دیا کہ ان میں دوامی اہمیت پیدا ہو گئی۔

مثال کے طور پر زندگی کے ایک بالکل سادہ مظاہرہ کو دیکھئے۔ ایک قصاب کی دوکان شہر کے غریب تر حصہ میں ہے گوشت کے چھیچھڑے پڑے ہوئے ہیں، خون کے دھبے لگے ہیں مکھیاں چاروں طرف بھنبھنا رہی ہیں ایک سائنس دان اس دکان کے سامنے سے گزرتا ہے خیال کرتا ہے کہ صحت کے لئے کس قدر مضر صورت حال ہے۔ وہ لوگ کتنے احمق ہیں جو

اس قدر غیر حیات بخش غذا پر اپنا روپیہ ضایع کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مذہبی پیشوا آتا ہے اس کے دماغ میں ذبح کی بے رحمیوں اور پیٹ بھرنے کی انسانی خواہش کا خیال آتا ہے۔ لیکن جب ریمبرانڈٹ اسی قسم کی ایک دکان پر آج سے تین سو سال پہلے گزرا تو وہ وہیں ٹھہر گیا۔ اس کی آنکھیں روشن ہوگئیں اسے مسرت ہوئی اس کو وہاں کچھ ایسی چیز نظر آئی جو دوسرے مظاہر سے مختلف تھی، اس کو حیات انسانی کا ایک مرقع وہاں نظر آیا جو نقش و نگار اور رنگ و روپ میں حسین تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے قصاب کی دکان کا ایک کاغذی مرقع تیار کیا۔ اور ایسا تیار کیا کہ آج بھی ہم اس کی آنکھوں کے واسطے سے دُکان کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ گویا ہم ان دریچوں میں سے کسی ایک میں جھانک رہے ہیں جن سے آسمان کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔

میں نے یہ کہا کہ ہندوستانی آرٹسٹ اس طرح کے روزمرہ کے مناظر پر نظر نہیں ڈالتے (یہ ایک دلچسپ بات ہوئی کہ بہت سے اخبارات نے مندرجہ بالا مثال کو سبزی خوروں پہ حملہ قرار دیا)

اس تقریر میں میری آخری درخواست یہ تھی، اور حقیقتہً اس جگہ دوبارہ اس تقریر کو نقل کرنے کی وجہ بھی وہی ہے کہ:-

نوجوان مصوروں کا فریضہ ہے کہ اپنے برش کو ہندوستانی رنگ کے وسیع ظرف میں ڈبوئیں اور اپنے کاغذ پر اس رنگ کو منتقل کریں۔ مثلاً میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کوئی نوجوان کسی مذہبی جلوس کا نقشہ کھینچے اور یہ نہ خیال کرے کہ وہ جلوس ہندوؤں کا ہے، مسلمانوں کا ہے، عیسائیوں کا، چاہے کسی کا ہو، وہ تو صرف یہ دیکھے کہ ایک اجتماع ہے، رنگوں کا مجموعہ ہے،

گلابی اور سنہری مورتی ہے اس کے آگے سوسنی رنگ کے پھول پڑے ہیں
پوجاریوں کے ماتھے پر سیندور کی لکیریں ہیں اور دم بدم بدلنے والا اس مجمع کا
رنگ ہے جس سے سڑکیں بھری ہوئی ہیں ـــــ میں چاہتا ہوں کہ کوئی
نوجوان برسات کی اس طرح تصویر کھینچیں کہ اس کا سارا انوکھا منظر اتر آئے
آسمان کسی تھیٹر کے عظیم الشان پردے کی طرح ہے۔ کھیل شروع ہونے والا
معلوم ہوتا ہے، روشنی گل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ـــــ اور ان سب
سے بڑھ کر میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی نوجوان آرٹسٹ، ہندوستان کے
المناک مناظر کے مرقع تیار کریں۔ کسی قوم کے المناک مناظر جب آرٹ کے
ذریعہ منقوش کئے جاتے ہیں صرف اسی وقت اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر آتے
ہیں۔ اس وقت وہ صرف رنج و تلخی پیدا کرنے کا ذریعہ ہی نہیں رہ جاتے بلکہ
ان میں ایک الہامی اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بنگال کے حالیہ قحط کو
لیجئے، نوجوان آرٹسٹ کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کے لئے اسے ایک
زبردست موضوع ہونا چاہئے۔ یہ موضوع ہوگرتھ اور گوا کے قابل تھا۔ یہ
ایسے مرقع کا سامان مہیا کرتا ہے جو ساری دنیا کے ترس کھانے اور ندامت
محسوس کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ یہ میں کچھ سنگدلی سے نہیں کہہ رہا ہوں میں
نے خود بھی بہت سے دن ان آفت زدہ انسانوں میں گزارے ہیں، کوئی
انسان بے دلی کے ساتھ بھی ان حالات کا بہ آسانی ذکر نہیں کر سکتا۔ نہ میں
اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دوسرے انسانوں کی بدنصیبی کا نقشہ کھینچنے کی تمنا
کام کر رہی ہے اور یقیناً اس کی وجہ یہ بھی نہیں ہے کہ آرٹ برائے آرٹ
کا میں معتقد ہوں نہیں! ہرگز نہیں، میں آرٹ برائے آرٹ کا معتقد
نہیں۔ میں آرٹ برائے زندگی کا معتقد ہوں، میں آرٹ برائے ہند کا

معتقد ہوں۔ برائے افادۂ ہندوستان چاہتا ہوں۔ میں نوجوان آرٹسٹ
سے پرزور درخواست کرتا ہوں کہ وہ اونچی اٹاری سے اتر آئے، اور کھلی
ہوئی دنیا میں، موجودہ حیات کی رزمگاہ میں قدم رکھے۔ وہ ایسا کر سکتے
ہیں۔ انھوں نے کیا بھی ہے، اور جب کبھی انھوں نے ایسا کیا تو ان کا کارنامہ
بڑا ہی قابل قدر ثابت ہوا۔

اب تک تو میں زیادہ تر مایوس کن ناکامیوں کی کہانی سناتا رہا ہوں
اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی بیان کروں۔ اور قابل تعریف کامیابی کا
ایک نمونہ پیش کروں۔ میں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں جو
بہترین عمارتیں دیکھی ہیں ان میں سے ایک حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی ہے
جدید فن تعمیر کا لاجواب نمونہ ہونے کی حیثیت سے یہ عمارت ایسی ہے کہ یورپ
یا امریکہ کی کسی عمارت کو اس سے بہتر قرار دینا مشکل ہے یہ عمارت اتنی پرشکوہ
کیوں ہے؟ اس لئے نہیں کہ اس کا معمار آرٹ برائے آرٹ کے تصور
سے متاثر تھا، (ہندوستان میں اس کا مطلب آرٹ برائے اجنتا ہے) بلکہ
اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا معمار زندگی سے متاثر تھا۔ اس نے ہندوستان
پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ فرقہ داری سوال نے اس ملک کے ٹکڑے کر رکھے ہیں
اس نے اس سوال سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو اسٹوڈیو میں دفن نہیں
کر دیا اور نہ اس سے بے خبری اختیار کی بلکہ اس نے اس کا مقابلہ کیا۔

اس نے اپنے دل میں کہا۔ بہت اچھا! یہاں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی
میں کاغذ پر بھی یہ ہرگز نہ کہوں گا کہ دونوں ایک ہیں کیونکہ یہ حقیقت میں ایک
نہیں ہیں، ہاں! البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ دونوں کے ہاں حسن پایا جاتا ہے
میں دونوں طرح کے حسن کو مصرف میں لاؤں گا۔ اچھا بلا سے، ہم دونوں کو اکٹھے

کرتے ہیں۔

اس نے دونوں کو اکٹھے کیا۔ اس نے پانچ اور دو کے تناسب پر اتحاد پیدا کر دیا۔ اس نے ہندو پیل پایوں پر سبک اور نفیس مسلم کمانیں قائم کر دیں۔ مسلم دریچوں کی تزئین ہندوانہ بیلوں سے کی گویا دو ایسے کلچروں کی روحیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف، یکدم الگ اور بالکلیہ ممتاز ہیں یکایک اس حقیقت سے باخبر ہو گئیں کہ ان تمام اختلاف کے باوجود دونوں ایک ہی عمومی چشمہ سے پیدا ہوئی ہیں جس کا نام " حسن " ہے۔

ہندوستانی طرز تعمیر کے اس کارنامہ کو خراج تحسین ادا کرنے کے چند ہفتہ بعد میں اس حقیقت کو معلوم کر سکا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ابتدائی اسکیم اور اس کے نقشہ کا بڑا حصہ ایک بلجین موسر جاسپر نامی شخص کا بنایا ہوا ہے۔
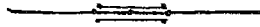
چھٹا باب

کچھ دیر راگنیوں میں

ایک اچھے سفر نامہ کو طرح طرح کی آوازوں سے پر ہونا چاہیئے۔ سواریوں کی چرخ چوں اور سمندروں کی گڑگڑاہٹ پر مکالمے قلمبند ہونے چاہئیں۔ محلات کے سایوں میں بہت سی آوازہائے بازگشت کا ذکر ہونا چاہیئے۔ غلام گردشوں میں پہروں کی آوازیں، چھتوں پر باندیوں کی آوازیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سفر ناموں کے مصنف اکثر بہرے ہوتے ہیں۔ وہ آسمان کی رنگ سازی میں کمال کر دکھاتے ہیں مگر اسے چڑیوں کی چہکار سے خالی کر دیتے ہیں۔ وہ کسی سمندر کے رُخ کا نقشہ تو حیرت انگیز خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر اس باجے کو بھول جاتے ہیں جو وہیں دروازہ ہی پہ بجتا ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ کوئی سفرنامہ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسی کتاب ضرور ہے جس میں ہم نے سفر سے متعلق بہت کچھ بیان کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ کتاب ایک حقیقی کتاب بنے ہمیں اس حقیقت کو ضرور قلمبند کرنا چاہیئے کہ ہمارے دوران سفر میں طرح طرح کی عجیب آوازوں کی ایک رو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی یہ آوازیں جب چپراسی لکڑی اور اپلوں کے کنارے بیٹھے گاتے تو کھڑکی سے

ہو کر ہم تک پہنچتیں ـــــــ جب کوئی مذہبی جلوس گلابی اور سنہری مورتیوں
کے ساتھ سالانہ رسوم کی انجام دہی کے لئے گاتا بجاتا گزرتا تو یہ آوازیں سڑکوں
پر گونجتیں۔ کبھی ریڈیو سے یکایک بلائے آسمانی کی طرح پھوٹ پڑتیں اور جب
کبھی ہم شام کے وقت دیہات کی طرف ٹہلنے نکل جاتے تو ہمیں وہاں کے کھیتوں
میں سے بانسری کی آوازیں سنائی دیتیں۔

دوسرے الفاظ میں ہم موسیقی ہی میں سفر کرتے رہے ـــــــ اور اسلئے
والٹر پیٹر کے مشہور مقولہ کے بموجب سارا وقت آرٹ میں گزرا۔ موسیقی کی طرف
میلانات نے مجھے کان میں انگلی دیئے ہوئے ہر ہر گوشہ میں گھمایا، سرراہ بھی
اور بلند و بالا ایوانوں میں بھی۔ تاکہ میں یہ سمجھ سکوں کہ یہ موسیقی کہتی کیا ہے۔ ہماری
یہ جستجو ہمیں بعض نامانوس مقامات اور بعض دقیق نتائج تک پہنچا دیتی ہے لیکن
جب یہ جستجو ختم ہوگی تو ممکن ہے کہ ہم ہندوستان کے متعلق بعض ایسی چیزیں معلوم
کرلیں جو شاید بغیر اس کے پردۂ خفا ہی میں رہ جاتیں۔

۲

پہلا قدم اعلیٰ حلقوں میں رکھنا چاہیئے۔ ہندوستانی موسیقی یورپی باشندے
کے لئے نہ صرف ناقابل فہم ہے بلکہ نہایت درجہ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ بھی۔ اسلئے
پوری طرح یہ یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ ہم جو سن رہے ہیں وہ موسیقی کی
بہترین قسم ہے (تاکہ کسی نتیجہ تک پہنچنے میں یہ شبہ حائل نہ ہو کہ جو کچھ ہم نے سنا
وہ گھٹیا قسم کی چیز تھی) اسی خیال کے ماتحت ہم ایک موٹر میں سوار ہوئے جس کا
ڈرائیور سفید لباس میں ملبوس تھا اور بینجنی رنگ کی پٹیاں اس کے لباس پر
تھیں۔ یہ موٹر ایک عظیم الشان سفید محل کے دروازوں سے گزری۔

یہ محل ہز ہائی نس مہاراجہ (ش) کا تھا۔ مہاراجہ بہادر نے عنایت فرما کر یہ انتظام فرمایا تھا کہ ان کے خاص ارباب نشاط ہمارے لئے ہندوستانی موسیقی کے کمال کا مظاہرہ کریں۔

مہاراجہ بہادر ایک ایسے نوجوان آدمی ہیں جنھیں موسیقی سے بیحد دلچسپی ہے۔ یہ اسی کی علامت تھی کہ اگرچہ مہاراجہ کا سارا ڈرائنگ روم شاہانہ تصاویر سے بھرا پڑا تھا۔ مگر کمرہ کے ایک کونہ میں ان کا شاندار اسٹین دے (پیانو) بالکل کھلا ہوا اور بے داغ باقی رہ گیا تھا۔ ورنہ اس کے علاوہ ہر جگہ میزوں پر کرسیوں پر، اور الماریوں پر خالص چاندی کے فریموں میں لگی ہوئی شاہانہ تصاویر موجود تھیں، یہ تصویریں ایک دوسرے کو اس قدر بے اعتمادی کی نظر سے گھور رہی تھیں کہ تم ساری فضا کو اس قسم کی گفتگوؤں سے معلوم تصور کر سکتے ہو، (میرا تاج تمہارے تاج سے بڑا ہے ..... تم نے یہ موتی ہماری پھوپھی کے چرا لئے ہیں .... تمہارا جھومر گرا پڑتا ہے) لیکن پیانو اس سے صاف اور بری تھا۔

جب مہاراجہ نے ہمیں پہلی بار حاضری کا موقع عطا کیا تو دس ہی منٹ گفتگو کے اندر یہ بات واضح ہو گئی کہ موسیقی کے متعلق جو مہاراجہ نہ جانتے ہوں، وہ جاننے کے قابل ہی نہیں۔ وہ نہ صرف قدیم موسیقی کی زندہ انسائیکلو پیڈیا تھے بلکہ انھوں نے موسیقی کے نوادر سے اپنی قابل تعریف واقفیت کا ثبوت دیا۔ انھیں تبتی کے غمناک سروں کی بھی خبر تھی اور کوپیرن کے نامکمل راگوں کی بھی۔ اور ساتھ ساتھ جدید موسیقی سے بھی انھیں حقیقی اور قلبی دلچسپی تھی۔ انھیں بنجامن، برٹین، میکائیل، ٹیپٹ، اور آکن راستھرون کے وجود کی بھی پوری خبر تھی۔ برطانوی عوام کی اکثریت کے لئے

اِتنا کہہ دینا بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔

اس مرعوب کن تبصرہ میں صرف ایک خلا رتھا اور وہ یہ کہ مہاراجہ نے ہندوستانی موسیقی پر بحث کرنے سے انکار کر دیا۔ جب انھوں نے یہ سنا کہ ہندستانی موسیقی کو میں سمجھ نہیں سکتا تو صرف مسکرا دیا۔

میں نے بہ اصرار کہا: "کیا اِسے ضرور سمجھنا چاہیئے؟ کیا ایک مغربی دماغ کے لئے یہ بالکل بے معنی چیز نہ ہوگی؟"

مہاراجہ نے پھر بھی مسکرا دیا۔

میں نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا: "کیا یور ہائینس نے خیال فرمایا؟ ......"

لیکن ہز ہائنس نے خیال فرمایا، یا نہیں فرمایا، کوئی اظہار خیال نہیں کیا۔ انھوں نے ہاتھ کو حرکت دی اور موضوعِ سخن بدل دیا۔

راز بہرحال راز ہی رہ گیا۔ کیسی ترسا دینے والی بات ہے کہ کوئی شخص مشرقی پہاڑیوں سے آنے والی آواز پر کان لگائے ہو، اور ٹھیک اس وقت جب کہ اس کا مفہوم ظاہر ہونے والا ہو، آواز خاموشی میں مبدل ہو کر گم ہو جائے۔

۳

مہاراجہ کے دربار میں میری پہلی حاضری کے چند یوم بعد میرے پاس دربار سے ایک دعوت نامہ آیا کہ اس رات کو منتخب ہندوستانی ماہرین موسیقی میرے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔

ہم بلا توقف اس اجتماع میں شریک ہوئے۔

یہ مظاہرہ مہاراجہ کے خاص محل سے ملحقہ چھوٹے کمرہ میں ہوا۔ حاضرین میں ہمارے علاوہ دربار کے حاجب پرائیوٹ سکریٹری افسر تقریبات

اور ایک ناشنا سا آدمی بھی شامل تھے۔ ان صاحب کی انگوٹھی میں اتنا بڑا ہیرا تھا کہ یقیناً یہ بھی کوئی بڑے آدمی ہی ہوں گے۔

ہمارے سامنے تیرہ ارباب نشاط ہیں جو دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنی برف جیسی وردیوں میں بہت ہی خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

ارباب موسیقی کی ترتیب سے متعلق دو چار لفظ کہنا ضروری ہے تمام فنون لطیفہ کی طرح موسیقی کی بنیاد بھی وزن اور موزونیت پر قایم ہے۔ یہ وزن مختلف قسم کی آوازوں کے ذریعہ ادا کئے جاتے ہیں۔ مغربی موسیقی میں یہ آوازیں خود اپنی جگہ پر خوشگوار آوازیں ہوتی ہیں۔ مثلاً بانسری کی آواز اگر اس آواز میں کوئی خاص چیز نہ ادا کی جارہی ہو پھر بھی اپنی جگہ پر شیریں اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بالکل اسی طرح مسرت ہوتی ہے جیسے چڑیوں کے نغمات سے، یہی حال دوسرے باجوں، پیانو، ہارمونیم اور طنبورہ وغیرہ کا ہے۔ ان کی آوازیں خود اپنی جگہ پر خوشگوار ہوتی ہیں۔ یہ آوازیں حقیقتہً موسیقی نہیں ہیں اور کم از کم اہل مغرب تو موسیقی کا اسے محض ایک لازمہ سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف ٹریم کار کی کرکر اور کوے کی کائیں کائیں کہ انھیں موسیقی کے بالکل برخلاف آوازیں سمجھا جائے گا۔

یہ ایک بہت ابتدائی بات ہے۔ لیکن ہے نہایت ضروری کیونکہ اس کے ذریعہ ہم یورپی موسیقی اور ہندستانی موسیقی کے مابین ایک نمایاں اختلاف کو محسوس کرتے ہیں ——— ہندوستانی موسیقی میں آواز کی خوبی و خرابی کو کسی طرح کی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ اور اسی وجہ سے ہندوستان میں گانے کا سبق دینے والے جہاں تک ہم جانتے ہیں، نہیں ہوا کرتے ہیں، اور نہ آواز بنانے کا اسکول ہوتا ہے۔ چند ہندوستانی گویوں نے جو وسیع

شہرت اور بڑی ناموری حاصل کرلی، اس کے اسباب ایسے تھے جنھیں بمشکل فن موسیقی سے بعید کا بھی کوئی تعلق ہو، ان کی شخصی وجاہت، ان کے ادارہ کی شہرت، اِشتہار بازی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا تقدس ان کی ناموری کا سبب تھا۔

یہ ایک معمولی سا مگر بڑا اصولی مسئلہ ہے، جب تک ہم اسے نہ سمجھ لیں ہندوستانی موسیقی ہمارے لئے ایک بے معنی سی چیز رہتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے اسے سمجھنے میں غلطی نہ کی، یہ مہاراجہ بہادر کی محفل نشاط کے بیان سے واضح ہو جائے گا۔ میں نے محفل سے واپس آتے ہی فوراً اُسے قلمبند کرلیا تھا آج ممکن تھا کہ ہم اس بیان میں کسی قدر تغیر و تبدل کرتے لیکن ہم نے اسے بعینہ باقی رہنے دیا تاکہ ایک ایسے دماغ کے اولین تاثرات کو ظاہر کرے جو مغربی روایات میں تربیت پا رہا ہے۔ مہاراجہ کے درباری گویئے اور ان کے آلات یہ تھے۔

۵۔ دنیا۔ یہ ایک قسم کا شوخ رنگ چھتارا ہے۔ بہ طور آرائش یہ بہت عمدہ چیز ہے۔ نہایت چمکدار سبز زمین پر روپہلے کام بڑے ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی قدر فاصلہ پر تیز ہوا میں اسے بجایا جائے تو ممکن ہے کہ جنگلی جانوروں کو اس کی آواز پسند آئے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اسے حس رکھنے والے آدمیوں سے قریب بھی رکھا جاسکتا ہے یا نہیں، تو یہ چیز اس کام کی ذرا شکل ہی سے ثابت ہوسکے گی۔

۶۔ طنبوریاں، یہ بھی ایک چھتارا ہی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہ کھڑی ہوتی ہیں اور چھتارا پڑا ہوتا ہے۔

۲۔ مردنگ۔ یہ ڈھول کی طرح کا ایک آلہ ہے۔
۱۔ طبلہ۔ یہ بھی تقریباً ڈھول ہی ہے، ایک نوکیلا، اور ایک چوڑا ہے۔
۱۔ بانسری۔ صقلی انداز کی۔ شیریں نوا۔ غم انگیز۔ لیکن جب مندرجۂ بالا آلات کے قریب سوگز کے اندر بجائی جائے تو بالکل ناقابل احساس؛
۲۔ وائلن، کم از کم وہ وائلن ہی سے معلوم ہوتے تھے، البتہ دونوں میں بگل سے لگے ہوئے تھے، اور ایک فرق یہ بھی تھا کہ تار تانت کے نہ تھے بلکہ دھات کے تھے۔

اِن صاحب نے جن کی انگلی میں بڑے ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ اِن وائلنوں کے متعلق حیرت انگیز بات بتائی ــــــــ انھوں نے بڑی نرمی اور آہستگی سے کہا۔

...... آپ کو اس کے تار دیکھ کر حیرت تو ہوگی؟

...... ہاں! ایسا کیوں ہے؟

انھوں نے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا؛
ہمارا مذہب تانت استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

گویا یہ بھی وہی قصہ تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں ہزاروں رنگ سے جلوہ نما ہوتا ہے، ۱۸۵۷ء میں کارتوسوں کی چکنائی سے لے کر قریب ترین بازاریں مقدس گایوں کی لوٹ تک یہ ہر وقت اور ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ آلات موسیقی جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ہندوستانی

موسیقار کی ساری کائنات ہیں۔ تم کو ان ہی آلات کی تصویریں سولہویں صدی عہد مغل کے مرقعوں میں بھی ملیں گی۔ غالباً یہ آلات بہترین قسم کے تھے لیکن یہ جذبات کی ادائیگی کے لئے کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتے تھے۔

پروگرام دیا گیا۔ پہلا جزو تھا۔

پھُورَگھی، بِلَمبا، اَسْوَاری تیری لاَ لاَ، تھیاگ رَاجاَ۔

تیری لاَ لاَ۔ معلوم ہوتا تھا کہ خوب ہوگا۔ اسے کون گائے گا؟ ارباب نشاط پر ایک نظر ہی سے پتہ چل گیا کہ استاد طنبورہ کے کمال کا سب کو اقرار ہے، یہ ایک پیر فرتوت تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اونگھ رہا ہو، شاید تیری لاَ لاَ یہی بجائے گا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی حصہ تو ضرور بجائے گا۔ کیونکہ وہ اپنا حلق صاف کر رہا ہے، ناخن تیز کر رہا ہے۔ اور بار بار خوفناک انداز میں انگڑائی لے لیکر چست بن رہا ہے۔

ایک شریفانہ آواز نے اس سکوت کو توڑا۔ یہ آواز حاجب کی تھی۔

......کیا اب شروع کیا جائے؟

......جیسی آپ کی مرضی؟

حاجب صاحب نے ایک اشارہ کیا۔

اچانک پاگل خانہ کا دروازہ کھل گیا۔ اور اس چھوٹے سے کمرہ پر غل غپاڑا، اور آہے واہے کا ایسا خوفناک حملہ ہوا کہ چند منٹوں تک تو اس کا اندازہ لگانا بھی ناممکن تھا کہ یہ آوازیں کہاں سے رہی ہیں۔ کرسی کے دستہ پر سر جھکائے اس کوشش میں مشغول تھا کہ اس طوفان کے مرکز کا پتہ چلاؤں۔ رفتہ رفتہ کان اس شور و غوغا کے عادی ہوئے تو پتہ چلا کہ اس

طوفان بدتمیزی کا مرکز اسی پیر فرتوت کا حلق تھا۔ وہ نہایت کامیابی اور پوری قوت کے ساتھ سلخ میں پیدا ہونے والی ہر آواز کی نقل اُتار رہا تھا۔

میرے لئے پریشانی اور بے تابی کا چھپانا بالکل ناممکن تھا، اور میں اس پیر فرتوت کو بڑے ہی غور کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ ایک ہی انسان بہ یک وقت اتنے جانوروں کی آوازیں کس طرح ادا کر رہا ہے۔ گردن کٹے سوروں کی آوازیں، ہنہناتے ہوئے گھوڑوں کی آوازیں اور کٹکٹاتے ہوئے ترکی مرغوں کی آوازیں، ساری آوازیں اس کے حلق سے پیاپے چلی آ رہی تھیں۔ اور وہ اپنے اس بے سرے پن کے ساتھ سر کو مسلسل جنبش دے رہا تھا، اور کاندھوں کو برابر پھڑکا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ طنبورہ کے تاروں کو غصہ کے ساتھ نوچتا جاتا تھا جیسے وہ انھیں اکھیڑ پھینکنا چاہتا ہو۔

یہ غوغائے بے ہنگام بالکل اسی طرح اچانک ختم ہو گیا۔ جیسے اچانک شروع ہو گیا تھا، پیر فرتوت ہانپ رہا تھا، اور ہم لوگوں کو تیز آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ حاجب نے منہ پھیرا اور کہا

...... کیا آپ نے پسند فرمایا؟

...... بیشک۔

...... انھوں نے ایجابی انداز میں سر کو جنبش دی۔ یہ ٹھیاگ راجا کا ایک ٹکڑا ہے۔ ہمارے مشہور موسیقار کا کارنامہ ہے۔

...... کیا وہ ...... کیا وہ مر گئے؟ میں نے ایسا فرزا سوال کیا ہی نہیں۔

...... کوئی سو سال ہوتے ہیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

...... یہ بات ہے؟

اس کے بعد لازماً یہ سوال تو ہوتا ہی کہ کیا اس گانے کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے۔

حاجب نے جواب دیا ـــــ بلاشبہ، یہ خداوند راما کی بارگاہ میں دعا ہے، تھیاگ راجا کی ساری نظمیں سری رام جی کی بارگاہ میں دعا ہی ہیں۔ اس نظم میں کہتا ہے۔ اے رام جی میری بات سنیئے! مجھ سے قریب ہو جائیے۔

یہ خیال کسی کو نہیں ہوتا کہ اگر سری رام جی اس ہیر فرتوت کے واقعی قریب آجائیں تو یہ انسان ان کے کان کے پردوں کو اپنی آواز سے ایسا دکھ دے گا کہ اس کے بعد کی دعاؤں میں انھیں مخاطب کرنا محض بے کار ثابت ہوگا۔

۴

محفل نشاط جاری رہی، اور ہم پروگرام کے دوسرے جزو کی وجدانی کیفیت سے دوچار ہو گئے، یہ جزو ایسا تھا جیسے توپ خانہ کی مسلسل بمباری "سری راگھا و ندرا، گوالی پونتھا، اُدی تھالا وینکٹاپرا دینیا" (اسٹروینکٹا گری) ایا!

سلیٰ کی ساری آوازیں پھر سنائی دینے لگیں، لیکن اس مرتبہ یہ آوازیں طبلہ نواز کی طرف سے آرہی تھیں۔ طبلہ نواز کی آواز پیر فرتوت کی آواز سے زیادہ کرخت تھی لیکن رحمت یہ تھی کہ اتنی بلند نہ تھی۔

اس دوران میں وائلن سے صرف "آ آ" کی آوازیں آتی رہیں

اور مسلسل آتی رہیں نہ کبھی " اے اے " نہ کبھی " او او " ایک ہی آواز " آ آ "
چلتی رہی، لیکن یہ قصہ تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو گیا کیونکہ ڈھول کی آواز
یکایک اس زور سے شروع ہوئی کہ ساری آوازیں مات ہو گئیں۔

ڈھول کی آواز، وائلن کی " آ آ " اور جانوروں کی سی آوازیں
چلتی رہیں۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ طبلہ نواز کے حلق میں شیطان
کے گھسنے پر ابھی صرف پندرہ منٹ ہوئے ہیں اور اس کے چہرہ کو دیکھتے
ہوئے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بہت دیر کے بعد وہ اپنی کرخت آواز ختم
کرے گا۔

جلد ہی کوئی نہ کوئی ترکیب کرنی چاہیئے ورنہ عجیب حالت ہو گی، میں
چیخنے اور سر پیٹنے لگوں گا اور بین الاقوامی کشمکش پیدا ہو جائے گی دربار
میں گستاخی ہو گی، اور بہت سی ناخوشگوار باتیں وجود میں آجائینگی۔

خوش قسمتی سے فوراً مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اور قبل اس کے
کہ میں اس ترکیب پر عمل کروں، قارئین کرام مجھے ایک دوسری بات بیان
کرنے کی اجازت دیں۔ اگر فنون لطیفہ کے نظریوں سے وہ تھک گئے ہیں
تو ان کے لئے بھی تبدیلی موضوع سے تھوڑی سی راحت مہیا ہو جائے گی۔

۵

پہلے خود اپنے متعلق دو چار الفاظ کہہ لوں۔

اس محفل کے شور و ہنگامہ سے میری بے تابی صرف عصبی اثرات
کا نتیجہ نہ تھی اور نہ اپنی برتری کے تصور اور بڑائی کے گھمنڈ سے پیدا ہوئی تھی
بلکہ بڑی حد تک حقیقت اس کے برخلاف تھی۔

یہ درحقیقت ایک ناقابل قبول سوء ظن سے پیدا ہوا تھا کہ اس پریشانی کی بنا موسیقی نہیں بلکہ خود میری ذات ہے۔

ایسا یقین کرنا تو بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی اور اتنی پریشان کن اور خوفناک ہو عقل اسے قبول نہیں کرتی۔ یقیناً چالیس کروڑ ہندوستانی سارے کے سارے غلطی پر نہیں ہو سکتے۔ بہرحال بہت سے مغربی ناقدین نے بھی ہندوستانی موسیقی کو سراہا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے اور نہ کچھ ماہر فن تھے، مگر تھے بہرحال اس قابل کہ ان کے بیان پر کان دھرے جائیں۔ ان کے ماسوا خود ہندوستان کے باشندے۔ دیہاتی، خونچہ والے، بازار والے بھی موسیقی کا کچھ نہ کچھ ذوق تو رکھتے ہی ہیں۔ یہ ہمیشہ اپنی مسرت اور سرور کا سامان اسی موسیقی سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر معاملہ یہ ہے تو غالباً اس موسیقی میں کچھ نہ کچھ خوبی تو ہوگی۔

۔۔۔۔۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔

اپنے عجز کے اس اقرار کے بعد میں اپنے آپ کو اس دعویٰ کا اہل محسوس کرتا ہوں کہ موسیقی سے متعلق کوئی معقول رائے دینے کے لئے ایک اوسط درجہ کے صحیفہ نویس میں جو صلاحیتیں ہونی چاہئیں، مجھ میں وہ سب موجود ہیں۔ موسیقی ہمیشہ سے میری اولین محبوب چیز رہی ہے۔ اور ابھی میں تصنیف تالیف سے بہت دور تھا، اس وقت بھی موسیقی کو سمجھنے لگا تھا۔ اسی طرح اخباروں کے کالم جب ہماری دسترس سے کافی فاصلہ پر تھے۔ اس وقت بھی میں موسیقی کی لے اور اس کے فن کا شناسا تھا۔

میں کوشش کرتا ہوں کہ صیغہ واحد متکلم یعنی "میں" کو نہ استعمال کروں مجھے قارئین کرام معاف فرمائیں، میں ایسا خود ستائی کے جذبے سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ بیان اس قدر شخصی وانفرادی ہے کہ میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرنے پر مجبور سا ہو جاتا ہوں۔

اچھا! تو ہم کیا بیان کر رہے تھے؟ ہم یہ بیان کر رہے تھے، کہ خرابی موسیقی میں نہیں بلکہ خود ہم میں تھی

میں اپنی جیب میں کچھ کاغذات ہمیشہ رکھا کرتا ہوں اور جو آواز بھی فضاء میں گونجتی ہوئی ملتی ہے فوراً اس کی صداکاری کر لیتا ہوں۔ کیوں نہ اس محفل کے شور و شغب کو بھی نوٹ کر لوں۔ یہ نہایت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں کامیابی ہو۔ اور جو کانوں کے لئے ناقابل فہم تھا۔ آنکھوں کے لئے قابل فہم ثابت ہو سکے۔

لیجئے اب ایک ایسا کام شروع ہوا کہ ہر ایک گیئے کی آواز کا نوٹ لیا جائے اور ہر سُر کو قلمبند کیا جائے، وہ سُر جو بار بار مچھلی کی طرح گرفت سے باہر ہو جاتا تھا حاجب صاحب بھی کچھ اسے پسند کرتے نظر نہ آتے تھے

آدھ گھنٹہ کے بعد وقفہ کی درخواست کی گئی تاکہ نوٹ پر غور کیا جائے اس وقت گویوں کے ہانپنے کی آواز کے سوا باقی بالکل خموشی تھی۔ اب پہلی مرتبہ اس کا موقع میسر آ سکا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اسے واضح طور پر سمجھا جائے۔ کاغذ پر غور کیا گیا تو پتہ چلا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ محض شور و غوغا تھا، اور جو کچھ ہم سن رہے تھے حرف بحرف اس کی نا مفہوم ہر سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ وزن اور سُر کے نشانات ایسے تھے کہ اگر کوئی اندھا پنسل لے کر کاغذ پر اندھا دھند نشانات لگاتا تو وہ بھی ایسے ہی ہوتے۔

اس میں صرف ایک استثنا تھی۔ اور وہ تھی پیر فرتوت کی آواز یہ شخص پورے دوران میں چنگھیا رہا تھا۔ اس کی آواز کے نشانات میں ایک قسم کی یکسانیت معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ بڑی ناخوشگوار آواز تھی لیکن بہرحال کسی نہ کسی قدر یکسانیت اس میں ضرور پائی جاتی تھی۔

اگر ہم اس پیر فرتوت کی آواز کو ڈھول اور طنبورے کی آوازوں سے الگ کرسکیں، اور صرف اسی کی آواز کو دیکھیں تو شاید کچھ معلوم ہوسکے۔

اس لئے درخواست کی گئی کہ مہربانی کرکے یہ صاحب پھر سے گائیں بڈھے کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے جانوروں کی طرح منہ کھول دیا۔

میں جلدی سے بول اٹھا، صرف دو تین سُر سنائیے وہی ٹکڑے جو ابھی ابھی ختم ہوئے ہیں حاجب نے سر سے اشارہ کیا۔ بڈھے نے لمبی سانس لی اور شروع کیا۔ اب یہ ممکن ہو سکا کہ کسی قدر صحت کے ساتھ اس لے کو ضبط تحریر میں لایا جاسکے۔

میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور بڈھے نے خاموشی اختیار کی۔

اگر بہت زیادہ تکلیف نہ ہو تو مہربانی کرکے پھر ایک با۔۔۔۔۔

کیا وہی گانا؟

جی ہاں وہی، عنایت ہوگی۔

بالکل نہی۔

کیا آپ کوئی دوسرا گانا نہ پسند فرمائیں گے۔؟

نہیں! میں بالکل وہی گانا چاہتا ہوں جو ابھی یہ گا چکے ہیں۔

میری درخواست پیر فرتوت تک پہنچائی گئی، اس نے سر ہلایا، اور تیسری بار پھر وہی گانا شروع کیا۔ اب کی بار جو دیکھا تو یہ بالکل ہی مختلف تھا۔

یہ صحیح ہے کہ وقت تقریباً اتنا ہی صرف ہوا، لیکن وزن لے اور سُر و تال میں صریح اختلاف تھا۔ بعض ایسے زیر و بم اب کی بار تھے جو پہلے نہ تھے۔

میں نے پھر ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور خاموش ہو گئی۔

میں نے پوچھا، کیا یہ بالکل وہی گانا تھا جو پہلے گایا گیا تھا؟

جی ہاں! بالکل وہی آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا؟

بہت خوب میں نے ملاحظہ فرمایا۔ اور اس گانے کے علاوہ بھی کچھ ملاحظہ فرمایا۔ مجھے ہندوستانی موسیقی کا پوشیدہ راز معلوم ہو گیا۔

۶

ناظرین جمالیاتی نظریوں کو سنتے سنتے پریشان ہو چکے ہوں گے ذرا مزہ بدل جائے تو اچھا ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ لوگ اس مصیبت کو اٹھائیں اور مطالعہ جاری رکھیں، کوئی وجہ نہیں کہ ایک جاسوسی ناول لکھنے والا تو دلچسپی پیدا کر دے اور ایک آرٹ کا مبصر دلچسپی پیدا نہ کر سکے۔ آرٹ کا سینہ بھی تو وہی کرتا ہے۔ وہی تجسس و تلاش، حسن کو ہیرو ئن کا مقام حاصل ہے اور بدنمائی کو ویلن کا۔

ہم بھی اپنی چھوٹی سی تحقیقات کو بیان کرتے ہیں، بڈھے کا دوسرا گانا پہلے گانے سے بالکل مختلف تھا۔ حالانکہ وہ دعویٰ یہ کر رہا تھا کہ دونوں بالکل ایک ہیں۔ یہ تضاد ہمیں کہاں پہنچاتا ہے:

جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں یہ تضاد ہمیں اس راز تک پہنچاتا ہے جو ہندوستانی موسیقی میں پنہاں ہے، یہ راز ایک لفظ "بدیہہ گوئی" میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ بڈھا کوئی ایسا راگ نہیں گا رہا تھا جو کبھی کسی شخص نے مرتب

کیا تھا، اور بروقت ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ وہ، اور اس کے سارے ساتھی بے تال و بے سُر کی الاپ رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ جو گا رہے تھے وہی ان گانوں کے مصنف بھی تھے۔

ہمیں بہت زیادہ اعزاز و احترام میں پڑنے کی ضرورت نہیں، مسئلہ بالکل صاف ہے، ہندوستانی موسیقی تمام تر بدیہہ گوئی ہے۔ اب اس کے بعد یہ اَمر مشکل ہو جاتا ہے کہ اسے ایک باقاعدہ فن سمجھ کر کس طرح غور کیا جا سکتا ہے۔

بعض دو چار امور پر غور کر لیجئے جو ہندوستانی موسیقی پر اور زیادہ غور و خوض کے بعد معلوم ہو سکے ہیں۔

مثلاً ہندوستانی موسیقی کا کوئی نوشتہ موجود نہیں ہے، یعنی کوئی ایسی چیز جسے کسی ماہر نے کبھی مرتب کیا ہو اور کسی وقت اُسے گا کر بتایا ہو، آپ کسی دوکان پر یہ سوال نہیں کر سکتے کہ فلاں ماہر موسیقی کا فلاں راگ تمہارے پاس ہے؟ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستانی موسیقی کبھی مطبع کی مرہون منت ہی نہیں ہوئی۔ چند مواقع پر جہاں اسے ضبط تحریر میں لایا گیا، وہاں یہ ہوا کہ مقامی طیوری اشکال میں اسے نشان زد کر دیا گیا جو صرف اسی وقت کے گانے والوں کے لئے کار آمد ہو سکتا تھا۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہو کہ خاص خاص گویوں کے پاس جا کر کچھ مشہور راگ، راگنیوں کی تعلیم حاصل کر لو اور وہ اتنی ابتدائی اور اس قدر غیر مربوط ہیں کہ مشکل ہی سے انھیں راگ راگنیوں کا نام دیا جا سکتا ہے اور جب تم سیکھ چکو تو جس طرح تمہارا جی چاہے برجستہ انھیں گاؤ، دوسروں کے لئے تم انھیں تحریر میں نہیں لا سکتے۔

کبھی کبھی خوش قسمتی سے تم بعض مرتبین کے نام سن لوگے، اور کچھ دیر کے لئے تمہیں امید ہو جائے گی کہ بہر حال ایسے آدمی کا پتہ چل گیا جس کی راگنیوں کی

تم اکٹھے جمع کر سکتے ہو، لیکن ایسے ہر دلنش ناموں میں سے تو نام ہی رہیں گے، وہ دیوتاؤں کی طرح کے لوگ ہیں جو تشخص اور تشکل میں وضاحت کے ساتھ نہیں آئیں گے وہ قدامت کے کہرے سے جھانکتے نظر آئیں گے مگر ان کے خط و خال تمہیں کبھی دکھائی نہ دیں گے ——— ہاں! ادھر اُدھر ان کے وجود کی مبہم نشانیاں تمہیں شاید مل جائیں گی۔

تم اپنی تلاش جاری رکھو، یہ ہے وہ صورت جو بلا اختلاف ہر جگہ نظر آئے گی۔ کیا فلاں (راگنیوں کا مرتب) زندہ ہے؟

افسوس! وہ تو بہت دن ہوگئے مرچکا۔ بہت دن ہوگئے کہ بہت دن ہوئے!

وہ کہاں رہتا تھا۔

اوہ! جنوب میں، پہاڑیوں میں، بڑی خوبصورت پہاڑیوں میں۔

اس نے کیا کیا؟

اس نے گانے بنائے۔ بہت سے گانے۔

کیا میں اس کے گانوں کی کوئی کتاب خرید سکتا ہوں؟

افسوس! اس کے گانے کبھی لکھے نہیں گئے۔

اس کے گانوں کا نام کیا ہے؟

اس کے گانوں کا کوئی نام نہیں۔

آخر وہ گانے کیسے ہیں؟

بہت ہی عمدہ، بڑے ہی اچھے، وہ گانے محبت کے، معرفت اور تجلیات کے گانے ہیں۔

بہت خوب! یہ گانے کون گاتا ہے۔

بہت سے لوگ گاتے پھرتے ہیں، دیہاتوں میں بھی، اور پہاڑوں پر بھی۔

بس اسی قدر آپ ہندوستانی موسیقی کے کسی مرتب سے شناسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی قومی سوانح کی کتاب یا حوالہ کے لئے مواد چاہیئے تو یہاں کچھ نہیں ملتا[1]۔

---

[1] ہندوستانی موسیقی کے بہی خواہ یقیناً مندرجہ بالا بیان کی مخالفت کریں گے۔ خوش قسمتی سے بہت سے مبصرین کے بیانات مذکورہ بیان کی تائید میں نقل کئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر پرشاد استاذ لکھنؤ یونیورسٹی کو لیجئے انھوں نے اپنی عالیہ تصنیف (ماڈرن انڈین کلچر) میں جرأت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ:۔

ہندوستانی موسیقی میں گویوں اور گانا بنانے والوں کے مابین یورپ کی طرح کوئی امتیاز نہیں، یورپ میں گانا بنانے والے گایا نہیں کرتے، اور ہمارے ہاں ایسا کوئی بھی نہیں ہوتا جو گانا بنائے۔ اور گویا نہ ہو۔"

اُنھوں نے اپنی کتاب میں عام تہذیب یافتہ ہندوستانیوں کا موسیقی کے متعلق کیا خیال ہے۔ اسے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ماتحت ایک موسیقی کالج قائم کرنے کی تجویز جب پیش ہوئی تو اس تجویز کے خلاف ایک شور اٹھا اور اس کی تین اسباب کی بنا پر مخالفت کی گئی، دعویٰ کیا گیا کہ:۔

(۱) اس سے تعلیم کا معیار پست ہو جائے گا۔

(۲) یہ کوئی پڑھنے پڑھانے کی چیز نہیں، کیونکہ یہ کوئی علم و فن نہیں ہے۔

اب ذرا اس سوال پر وسعت کے ساتھ غور کرو۔ ہندوستانی موسیقی کی مجہولیت، اس کا عدم تشخص اور اس کے ابہام کو سوچو، تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی یہ صرف جمالیاتی اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ یہ ہندوستانی ذہنیت اور ہندوستانی سیاست کے طالب علم کے لئے بڑی اہم چیز ہے یہ صورت حال اسی ذہنیت کی پیدا وار ہے مثلاً چونکہ ہندوستانی موسیقی کے لئے کوئی عام لشان نہیں اس لئے موسیقی بھی ہندوستانی زبانوں کی طرح مقامی ہو کر رہ گئی۔ بنگالی گانے مدراس کے لئے بالکل مضحکہ خیز ہیں اور مدراسی گانے توچین کے لئے ناقابل برداشت ہیں، پھر یہ دونوں صوبۂ شمال مغربی سرحد کے لئے بالکل بے معنی ہیں۔ اگر ہندوستانی سپاہی چلے تو بس چپ چاپ ہی چلے۔ اگر گانے کی کوشش کرے گا تو اس کے پیرواگوں کے پھندے میں الجھ کر رہ جائیں گے۔

لیکن یہ حقیقت قومی نفسیات کے طالب علم کے لئے بڑی اہم چیز ہے یہ خالص غنائی دلیل ہے جو مجھے بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہے اس لئے ناظرین کرام دنیا کے دوسرے امور کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اس نظریہ پر مزید چند فقرات پیش کرنے کی اجازت دیں۔ القصہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستانی موسیقی کو ایک باقاعدہ فن نہیں شمار کیا جاسکتا۔ کیونکہ

(الف) ہندوستانی موسیقی تقریباً تمام تر ایک بدیہہ گوئی کے قسم کی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۱۴) اس سے اساتذہ اور طلبا دونوں کی حیثیت معاشرہ میں گر جائے گی۔ کیونکہ لکھنؤ میں گانا بجانا طوائفوں سے متعلق کام ہے، شرفاء کو اس سے کیا تعلق؟

چیز ہے۔

(ب) فن نہ آج بدیہہ گوئی کے قسم کی چیز ہے، نہ کل تھا، اور نہ کبھی ہوسکتا ہے۔

عملاً اس ابتدائی اصول میں استثنا کی گنجائش نہیں، لیکن چونکہ ہمارا مقدمہ بہت قوی ہے آئیے بعض جزئیات پر بحث کرلیں۔ مثال کے طور پر فن خطابت کو لیجئے خطابت ایک آرٹ ہے، اور ہم اسے مانے لیتے ہیں کہ بعض عظیم الشان مواقع پر طلاقت لسانی پیدا ہو جاتی ہے جیسے لنکن کی گیٹس برگ والی تقریر اس کا بہترین نمونہ ہے لیکن بہر حال اس موقع پر بھی لنکن نے تقریر سے پہلے ایک لفافہ پر کچھ مبہم سے نوٹ تیار کرلئے تھے۔ اسی طرح کوپن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے موسیقی کا اعلیٰ ترین نمونہ اپنی پہلی نشست میں فی البدیہہ تیار کر دیا تھا، جس کے بعد وہ آئندہ نسلوں کے لئے معین و مرتب شکل میں لایا گیا۔ لیکن بہرطال معین و مرتب شکل میں لایا گیا۔ اگر کوپن صاحب پیانو پر بیٹھ کر اپنی انگلیاں اس کے کانٹوں پر پوری مہارت کے ساتھ چلاتے، جارج سینڈ کو راگ سناتے اور جب ختم کر چکتے تو بیگم صاحبہ فرماتیں کہ بہت خوب! اب آپ پھر کسی وقت پیانو بجائیے گا اس داد کے بعد کوپن صاحب نے پیانو چھوڑ دیا ہوتا۔ اور ایسی خموشی چھا جاتی جس میں نظر کی ہلکی اور نرم آواز کے سوا کچھ نہ ہوتا، تو کیا ہوتا؟ موسیقی گم ہو چکی ہوتی، اور راگنیاں اس طرح پگھل گئی ہوتیں جیسے پیرس کی چھتوں پر برف پگھل کر گم ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوپن نے فی البدیہہ راگ بنائے ہوں۔ اور اکثر بنانے والے بناتے ہیں۔ لیکن جب کوپن کی انگلیوں نے ساز کے سحر آفریں پردوں کو چھیڑا تو شکر ہے کہ

جارج سینڈ کا خاتمہ ہوگیا۔ بحث کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ہر چیز کا خاتمہ ہوگیا ـــــ رہ گیا گیا؟ ـــــ لکھے ہوئے اوراق، ـــــ نوکیلی پنسلیں، اور ان سب سے زیادہ اہم چیز یعنی مٹانے والا ربر۔

یہ بنیادی اصول آرٹ کی تمام قسم پر حاوی ہے، آپ ایک مجسمہ کو فی البدیہہ نہیں بنا سکتے، آپ رنگ کاری فی البدیہہ نہیں کر سکتے، آپ کسی غزل کے معمولی سے معمولی جزو کی بھی برجستہ تکمیل نہیں کر سکتے ملٹن کی نظم ل، الگرو ـــــ کا قلمی نسخہ دیکھئے۔
اس کا نام کس قدر مشہور ہے ساری کی ساری نظم کتنی مرصع اور کس قدر اعلیٰ نمونہ ہے، قلمی نسخہ کیا بتاتا ہے؟ کیا یہ کہ ملٹن آدھی رات کو اٹھا کرسی پر بیٹھا، سفید پر کا قلم جلدی سے ہاتھ میں لیا اور اپنی ساحرانہ نظم کو لکھ کر تیار کر دیا؟ جی نہیں! اس کے برخلاف اور بالکل برخلاف قلمی نسخہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صبح سے شام تک اپنی نظم کی اصلاح میں لگا رہا۔ ایک ایک لفظ کو غور کر کر کے دماغ سے نکالا، اور نگینے کی طرح اشعار میں جڑا بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا ورنہ اسے کاٹا، دوسرا لکھا۔ سارا نسخہ کاٹا، مٹایا، درست کیا ہوا اور اصلاح کیا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ملٹن کو جو کامیابی ہوئی ہے وہ کانٹ، چھانٹ جانکاہی اور جانسوزی کے بعد ہی ہوئی ہے ـــــ کامیابی ہوئی۔ اور پوری کامیابی ہوئی، نظم بہترین تیار ہوئی ـــــ صرف خدا اور برطانوی میوزیم کا طالب علم ہی جانتا ہے کہ ملٹن نے اس کامیابی کے لئے کتنی دماغی کاوشیں کی ہیں ـــــ

ہندوستانی موسیقی کو ابھی وجود میں آنے کی مشقت سے گزرنا ہے یہ وہ مشقت ہے جو آرٹ کی ہر چیز کے لئے لازمی ہے۔ ہندوستانی

موسیقی ذرا آسمان کی بلندیوں سے زمین پر اترے۔ اور جرأت کے ساتھ
کاغذ پر سیاہ و سفید میں اپنے آپ کو ظاہر کرے۔ اور جب تک یہ نہیں
ہوتا موسیقی محض بیر فر توت کی چیخ پکار رہے گی۔ اور کسی احمق کی بکواس
سے زیادہ اس کا کوئی مرتبہ نہیں ہوگا۔

ساتواں باب

اندھی عقیدت

روحانی دنیا کی سیر کے بعد اب میں مذہبی دنیا میں داخل ہوتا ہوں، میری سیاحت کا دوسرا حصہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ بڑی حد تک یہ بنجر زمین کا سفر تھا۔ اگر توجہ کی جاتی تو عجیب وغریب خودرو پودے ہماری نظر سے گزر سکتے جو اس غیر آباد علاقہ میں پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ دراصل ہندو قوم پرستی کی پیداوار ہیں۔ اور اس لئے ہندوستانی سرزمین کی خاص چیز ہے۔ اب چونکہ آزادی کی صبح اُفق پر نمودار ہو چکی ہے اس لئے قوم پرستی کے یہ آثار بے نقاب ہونے لگے ہیں اور ان میں نہ صرف ترقی ہو رہی ہے بلکہ اب وہ اپنے اصلی روپ میں بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔

ان پودوں کا مشاہدہ تاریخ عالم کے طالب علم کے لئے باعث دلچسپی ہوگا کیونکہ کسی ملک کے مانوس ومعلوم نباتات سے یہ مشابہ نہیں ہیں۔ آیئے تھوڑی دیر کے لئے ان کی چھان بین کریں۔ اس کی ابتدا سب سے زیادہ

عجیب و غریب پیداوار سے کی جائے گی جو "آیو رویدک" کے نام سے موسوم ہے۔

ایک متوسط انگریز یا امریکی شہری سے اگر یہ کہا جائے کہ آتشک کے مرض کا ازالہ جوشاندہ کی ایک پیالی سے ہو سکتا ہے تو وہ سخت شبہ میں پڑ جائیگا جدید تمدنی تعلیم کی بدولت لوگ واقف ہو چکے ہیں کہ امراض خبیثہ زکام یا درد سر کی طرح سادہ اور معمولی عوارض نہیں ہیں وہ جانتے ہیں کہ صرف ابتدائی دو درجوں میں، وہ بھی کئی ماہ کی ماہرانہ کوشش اور پچکاریوں کے ذریعہ ہی آتشک کا علاج ممکن ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسی پیالی کے ذریعہ دق کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے تو ان کا شبہ اشتعال میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ علم طب میں حیرتناک ترقی ہو رہی ہے مگر یہ صورت ترقی کی مثال تو نہیں البتہ سحر کا نمونہ ضرور ہے۔ اس کے علاوہ سوء ہضمی، سرسام، تپ و لرزہ، سوزاک، امراض قلب، کھانسی وغیرہ کے علاج میں بھی یہی پیالی تجویز کی جائے تو پھر وہ غصہ کے عالم میں موجد کے منہ پر اس پیالی کو دے مارنے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کا دعویٰ کرنیوالے چاہے خود ان کو اپنے دعوے پر کتنا ہی یقین ہو سماج کے دشمن ہیں۔

اس باب کو سپرد قلم کرتے وقت جوشاندہ کی یہ پیالی یا کٹورا میرے سامنے موجود ہے۔ اس کے کیمیاوی تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل بے اثر سی چیز ہے اور فی الحقیقت ان امراض میں سے کسی ایک کے واسطے بھی جن کے علاج کے طور پر اس کی سفارش کی جاتی ہے یہ قطعاً غیر مفید ہے۔ یہ جوشاندہ ایک ایسی بوٹی سے تیار کیا گیا ہے جس کی خاصیت

بوٹی جنوبی امریکہ میں بھی دستیاب ہوتی ہے۔ اس میں صعتر، الائچی، لونگ اور
بعض عام پھولوں کی خشک پنکھڑیاں بھی شامل ہیں۔ لے دے کے خوبی
صرف اسی قدر رہے کہ یہ کسی قدر ہاضم ہے اگر یہ نسخہ کسی غیر معتبر دواساز کے
ہاں سے اس غرض سے خریدا جاتا کہ دکان کے مالک کو دھوکا دفریب سے
دوائیں فروخت کرنے کی علت میں چالان کیا جائے تو پھر اس واقعہ میں
کوئی لطف باقی نہ رہتا لیکن میں نے نسخہ خرید کر جوشاندہ تیار نہیں کیا ہے
بلکہ آیورویدک کے ایک ماہر وید صاحب نے اس کو بڑے اعزاز کے ساتھ
مجھے پیش کیا تھا جنھیں اس کی ساحرانہ تاثیری خواص پر بڑا یقین تھا۔

امور ذیل کو پیش نظر رکھکر اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ بحث بہت
ہی تلخ بلکہ نہایت ناپسندیدہ ہوجائے گی۔

اول یہ کہ جوشاندہ کا یہ پیالہ آیورویدک کے ساتھ اندھی عقیدتمندی
کی بہت ہی اچھی مثال ہے۔ جس کے ساتھ نجوم، جادو اور مذہب کے اثرات
کو بھی وابستہ کردیا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر یہ تعلی آمیز دعویٰ بھی کیا جاتا ہے
کہ اس طریقۂ طب کے ذریعہ قدیم رازہائے سربستہ کا دوبارہ انکشاف ہوا ہے
جو مغربی آدویہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

جدید ہندوستان میں آیورویدک کا طریقۂ علاج آگ کی طرح پھیل رہا ہے
جدید شفاخانے نہایت سرعت کے ساتھ تعمیر کئے جارہے ہیں۔ طلبہ ہزاروں کی
تعداد میں اس حکمت کو سیکھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے کئی علاقوں میں آیورویدک
معالجین کی تعداد ڈاکٹروں کی تعداد سے بیس یا تیس فی صدی زیادہ ہے

اس پیشہ ورانہ طریقۂ علاج کے فروغ و ترقی کا تیسرا محرک قومی جوش
اور جذبہ ہے کیونکہ یہ ہندوستانی حکمت ہے۔ آیورویدک علاج گویا انگریزی طریقۂ

علاج تو نہیں ہے یہ خاص ہندوستانی ہے اس لئے اس کی حمایت لازمی ہے۔
سائنس کے علوم وفنون میں بھی ہندوستانی عقیدتمندی کا پہلو بہت ہی نمایاں ہے آیورویدک معالجین گو اپنے دعوؤں کو حق بجانب نہیں خیال کرتے تاہم ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ اس طریقۂ علاج کو عام کر رہے ہیں۔ لیکن اگر وہ یا ان کے عزیز قریب درد سر کے علاوہ کسی اور شدید مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو مغربی اطباء سے رجوع کرنے میں تامل نہیں کرتے[1] وہ نیک نیتی کے ساتھ ان فرد گذاشتوں کا اعتراف نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کی تجارتی کساد بازاری کا موجب بنتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے جاہل افراد کو مختلف قسم کے عرق استعمال کراتے ہیں جو افسوس ہے کہ بالکل غیر موثر ثابت ہوتے ہیں۔

۲

آیورویدک اصول حکمت کی تشریح وتفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ اس کے لئے متعدد جلدیں درکار ہوں گی اس فن کا (اگر اس نام سے اس کی

---

[1] اس بارہ میں ممتاز مثال خود گاندھی جی کی ہے۔ گاندھی جی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ مغربی اطباء کے خلاف لعن طعن میں گزارا ہے جن کے دواخانوں کو وہ ایسے اداروں سے تعبیر کرتے ہیں جہاں سے گناہوں کی اشاعت ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنڈی سائٹس کے مرض میں مبتلا ہوئے تو آیورویدک اطباء کو انھوں نے فراموش کر دیا اور انگریز ڈاکٹروں سے اپنا آپریشن کرایا۔

عظمت قائم ہوسکتی ہے) اصل متن سنسکرت زبان میں قدیم ویدک کی کتابوں
میں پایا جاتا ہے۔ سنسکرت دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک معاشی نقطۂ
سے بلاشرکت غیرے برہمنوں کی اجارہ داری رہی ہے۔ یہ نہایت ہی رجعت
پسند گروہ ہے جو ابتدائے تاریخ سے اب تک کسی قوم میں پیدا ہوا ہے اسلئے
نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ آیورویدک حکمت نے خالص تحقیقاتی نقطۂ نظر سے کچھ
زیادہ ترقی نہیں کی۔ صدیوں تک اس فن پر ایسے ان گنت اوہام کی تہیں
چڑھی رہیں جن کا ویدک بھجنوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثال کے طور پر اس
میں نجوم و رمل کی بہت سی اصطلاحیں داخل ہوگئی ہیں۔ "چراکا" اور "سسروتا"
دو ہندو حکیموں کو اس فن کا امام تسلیم کیا گیا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ انکی
تصانیف کا الرازی نے عربی میں ترجمہ کیا ہے جو فن طب کی عجیب و غریب
کتابیں ہیں۔ ہر وہ چیز جس کے متعلق خیال پیدا ہو جائے کہ وہ دیہات کے
گنواروں کو متاثر کرسکتی ہے آیورویدا میں درج کر دیگئی۔ اس طرح یہ فن
عمر عیار کی زنبیل بن گیا ہے اور اس کے طریقۂ علاج سے جہاں گہری مذہبی
عقیدت مندی کی بو آتی ہے وہاں اس کو جادو اور پریوں کی کہانیوں
کے اثرات سے منسوب اور کبھی کبھی طب مغرب کے اوزار سے بھی لیس
کر لیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی دوائیں بڑی حد تک مضر اور مغربی
نقطۂ نظر سے تو بالکل جعلی اور فرضی ہیں۔

یہ وہ فن طب ہے جو قوم پرستی کے نام سے بڑی تیزی کے ساتھ
رواج پا رہا ہے اور نسل انسانی کے ⅙ حصہ کی صحت و تندرستی
کا ذمہ دار ہے۔

۳

آیورویدک کی حقیقت کا بہتر علم ایجابی تحقیق سے زیادہ اس کی سلبی چھان بین سے ہو سکتا ہے۔ اس کی خصوصیات کے مقابلہ میں وہ امور جن کا اس طب میں فقدان ہے زیادہ اہم ہیں۔ ذیل میں ہم ایسے امور کا ذکر کرتے ہیں:۔

۱۔ خردبین سے انکار اور جراثیم کو بالکل ہی نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اور تشخیص محض ظن و تخمین پر مبنی ہے۔

۲۔ جراحی سے انکار کیا جاتا ہے اور سرطان کے مریض کو بھی گولیاں دی جاتی ہیں۔

۳۔ پچکاریوں کے ذریعہ علاج کا طریقہ تو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا۔ آتشک کے مریض کو خام سنکھیا کھانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

۴۔ ان بیماریوں کے لئے کوئی طریقہ علاج نہیں ہے جن میں تعدیہ پایا جاتا ہے۔ ہیضہ کی اشاعت کو روکنے کے لئے دروازہ پر پھولوں کا ایک گچھا باندھ دیا جاتا ہے۔

۵۔ یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ اس طب میں اعضاء کو سُن کرنے والی دوائیں نہیں ہوتیں اگر کبھی مخدر دوا کے استعمال کی ضرورت پیش آتی ہے تو افیون سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ ایسے تمام طریقہ ہائے علاج سے جن کی افادیت طب مغرب میں ثابت ہو چکی ہے محض ایسے طریقوں کے مقابلہ میں صاف انکار کر دیا جاتا ہے جن کو صرف خوش خیالیوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ نمونیا کے مرض میں انگریزی دوائی (سلفونا مائڈ) یا ذیابیطس کی حالت میں کینڈا کی تیار شدہ دوا (انسولین) کے استعمال کی بجائے آیورویدک طریقۂ علاج مریض کو اپنے ہاتھوں مرنے ہی پر مجبور کر دیتا ہے۔

آیورویدک کے نقائص پر کئی صفحے سیاہ کئے جا سکتے ہیں لیکن ایک متوسط آدمی کے لئے صرف اسی قدر معلومات کفایت کر سکتی ہیں۔

اس طب کی حمایت میں البتہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مغربی افریقہ کے جادوگر اطباء نے مقامی امراض و بخار کے لئے جس طرح بوٹیاں دریافت کی ہیں اسی طرح آیورویدک حکماء نے کئی صدیوں کے عرصہ میں بعض عام امراض کے لئے سادہ اور سہل علاج کے طریقے معلوم کئے ہیں۔ اور ان کا یہ علاج شکل ہی سے ناکام ہوتا ہے۔ وہ قبض کا ازالہ کر سکتے ہیں۔ ملیریا کے بخار کو عارضی طور پر روک سکتے ہیں ان کے پاس کئی اچھی مقوی دوائیں ہیں۔ نزلہ و زکام کا بہت ہی بہتر علاج ہے اور پیچش کا بہت ہی پیارا طریقۂ علاج ہے جو اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔ دو قسم کے علاجوں میں ان کو جدید طب پر سبقت حاصل ہے۔ مرض دق کے علاج میں انھوں نے سب سے پہلے سونا استعمال کیا اور مرض جذام کے علاج کے سلسلہ میں ایک خاص قسم کے تیل کے استعمال میں پہل کی جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ انکشافات صدیوں قبل ہوئے ہیں اگر مغربی طریقۂ تحقیق کے اصول پر ان کا سلسلہ جاری رہے تو دنیا کو بہت سی مصیبتوں سے نجات مل سکتی ہے لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے آیوروید اور اصل ایک خفیہ برہمن ادارہ ہے۔ اس کے علماء شدت سے اس وہم میں مبتلا تھے کہ اگر کسی راز کو دنیا پر ظاہر کر دیا جاتا تو اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے یا شاید اس کی افادیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

اس لئے شیشوں کو سربمہر کر دیا گیا، بوتلوں کو مقفل رکھا گیا اور مقدس کتابوں کی بڑے اہتمام کے ساتھ حفاظت کی جانے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی طب میں امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ بھی ترقی نہ ہوئی۔

ہم نے اختصار کے ساتھ آیورویدک کی متعلق سب کچھ کہا لیکن اس فن کی ایک شاخ کا ذکر کرنا بھول گیا جس میں اس نے بڑی ترقی دکھائی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی بڑی قابل عزت شاخ نہیں ہے لیکن آیورویدک نے اس میں بڑا کام کیا ہے اس لئے اس کا ذکر ضروری ہے۔

۴

بھی دواؤں کی تیاری میں تو آیورویدک حکمت کا کوئی جواب نہیں میری میز پر آیورویدک دواسازی کی دوکان کی فہرست رکھی ہوئی ہے۔ ایسی دوکانوں کی ملک میں بڑی کثرت ہے اور تجارت بھی پورے فروغ پر ہے ان کے صداقت ناموں کی لمبی چوڑی فہرست سے ثابت ہوتا ہے کہ طب میں عقیدت مندی کے عنصر کو ہندوستانی نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ اس کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کے لئے روپیہ پیسہ بھی صرف کرتے ہیں لیکن جہاں تک قوت باہ میں اضافہ کا تعلق ہے اس طریقہ علاج میں عقیدت مندی اور مبالغہ کو دخل نہیں ہے۔

ایک مرہم کے متعلق ہم سے بیان کیا گیا کہ نوجوانوں میں جانوروں کی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ اہل مغرب شاید حیوانی خواہشات میں اس حد تک اضافہ کرنے میں خوف محسوس کریں لیکن ہندو اس سے نہیں ڈرتا۔

ایک شربت کے بارہ میں لکھا ہے "اس سے شہوانی قوت کا

چشمہ اُبلنے لگتا ہے جس طرح روشن سورج صاف آسمان سے نور کا دریا بہاتا ہے۔ بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی یہی شربت مقوی دماغ بھی ہوتا ہے (اگر ان دو متضاد خصوصیات کو جمع کرنا مشکل ہی ہے)

ایک سفوف کے متعلق معلوم ہوا وہ اس قدر سریع التاثیر ہے کہ بلا مبالغہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ ایک اور سفوف ضعیف العمر کی کمزوری کو اسی طرح دفع کرتا ہے جس طرح مشرق سے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ استعمال کے بعد ان ضعیفوں کی حالت کا بیان کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہے۔

خاص نام سے ایک عرق تیار ہوتا ہے جو ہیجان خیز ہے۔ اس کو استعمال کرنے والوں کی حالت کے تصور سے لرزہ شروع ہو جاتا ہے ایک اور عرق ہوتا ہے جو پیر فرتوت اور گئے گزرے آدمی کو بھی ایسا توانا و تنومند بنا دیتا ہے گویا اس کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس کے استعمال سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے نتیجہ کے طور پر جلد یا بدیر عدالتی چارہ جوئی کی نوبت آجاتی ہے لیکن چونکہ اس سے زندگی کا ایک بلند تصور بھی پیدا ہوتا ہے اس لئے حاکم عدالت کا فیصلہ زیادہ سخت نہیں ہو سکتا۔

ان امور کو محض تفریحی اہمیت حاصل نہیں بلکہ ان میں گہرے معنی و مطالب پنہاں ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ملک کے ایک وسیع حصہ پر موت نے اپنا سایہ ڈال رکھا ہے، جہاں بہت سی صنعتیں کمزور بلکہ دم توڑ رہی ہیں قوت باہ کی دواؤں کا بازار سال بہ سال گرم ہوتا جا رہا ہے اور قومی آمدنی کا ایک غیر متناسب حصہ اس کی نذر ہو رہا ہے۔

۵

بیسویں صدی کے وسط میں بظاہر اس جیسی طب کے ہزار ہا معتبر اطباء نے مطب قائم کرلئے ہیں اس لئے میں نے پہلی فرصت میں آیورویدک شفاخانوں، تعلیم گاہوں اور دوا فروشوں کی دوکانوں کے معائنہ کا موقع نکال لیا۔ دوسرے اور انسانی اداروں کی طرح ان میں وسیع اور نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ان میں سے خصوصاً وہ جو حیدرآباد میں قائم ہیں۔ بعض خصوصیات کی بنیاد پر قابل تعریف ہیں کیونکہ آیوروید کی غلامانہ اتباع کے بجائے وہ نہایت دیانت داری کے ساتھ طب مغرب کے اصول اختیار کرتے ہیں۔ متوسط درجہ کے اداروں کی حالت بڑی خطرناک ہے، چنانچہ ان میں سے ایک کے معائنہ کے بعد اس نوع کے شفاخانوں کی نسبت عام تاثرات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

ہم نے دہلیز میں مشکل ہی سے قدم رکھا تھا کہ ایک واقعہ پیش آیا جس سے اس مقام کی پوری حالت الم نشرح ہوتی ہے۔ ایک ملازم بڑی تیزی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ گرومیں لوٹ پوٹ کر گہرے جذبہ عقیدت کے ساتھ ان طبیب کے پاؤں چھوتا ہے جو ہمیں دواخانہ کا معائنہ کرا رہے تھے (عجز و احترام کے اظہار کا یہ طریقہ ہندستانیوں کو مرغوب ہے بہت سے نیچ ذات کے ہندوستانی دیسی کانسٹبل کے سامنے جب اس سے کسی مقام کا پتہ دریافت کرتے ہیں تو اسی طرح سر کے بل گر جاتے ہیں) چند منٹ کے بعد وہی ملازم دواخانہ میں ادویہ تیار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے کیا اس اثناء میں وہ صاف ستھرا ہو چکا؟ اس کی طرف

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہاتھ نہیں دھوئے اس سے نفاست
کی توقع رکھنا بھی شاید بے وقوفی ہے۔ کیا آیورویدا کی کتابوں میں نہیں لکھا ہے
کہ" جب ہم آریائی حکماء کی طبی ثقافت کا تصور کرتے ہیں تو فرط مسرت کی وجہ
سے ہمارے حواس بجا نہیں رہتے اور ہندوستان میں اپنی پیدائش کو باعث
فخر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ملک ان کی گرد پا سے پاک اور مقدس بن گیا ہے "
یقیناً اس ادارہ میں قدموں کی بہت سی خاک پائی جاتی ہے اس کے
ساتھ ساتھ اور قسم کا گرد و غبار بھی شامل ہوگا لیکن یہ امر کہ اس میں پاک کرنے
کی صلاحیت ہے یا نہیں ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ قدموں کی خاک کے ساتھ
یہی عقیدت مندی آیورویدک کی مقبولیت کا اعتراف ہے۔
باب الداخلہ پر پروفیسر نے تھوڑا سا توقف کیا اور بیماروں کے ہجوم
کی طرف ہمیں متوجہ کیا جو ڈاکٹر کی میز کے قریب دھکم دھکا کر رہے تھے۔
پروفیسر صاحب نے کہا کہ یہ سب سودیشی تحریک کے نتائج کا ایک
ادنیٰ مظاہرہ ہے۔ جب ان کی زبان سے یہ لفظ ادا ہوا تو اس سے ایک
قسم کی محبت ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر انھوں نے کہا کہ یہ علامت اس کی ہے
کہ ہم آزادی کی جانب طوفانی سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔
ہم نے بدنصیب بیماروں کے داغدار اور مرجھائے ہوئے چہروں
کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا کہ یقیناً بہت سی اور چیزوں کی طرف
بھی تیزی کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ متعدی امراض کے بیماروں کو عام
بیماروں سے الگ رکھنے کا بظاہر کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ ہمارے سامنے
پانچ چھ نوجوان تھے جن کے عریاں سینوں اور کندھوں کے چٹھوں سے صاف
ظاہر تھا کہ آتشک کا دوسرا درجہ ہے۔ اور قریب تھا کہ ان بدقسمت بیماروں

کو جو شاندہ کا ایک پیالہ یا کچی سنکھیا کی چند چٹکیاں دیکر واپس کیا جائے کہ ان کا علاج ہو چکا۔

میں چاہتا تھا کہ جا کر ان مریضوں سے کہوں خدا کے واسطے ان فریبی طبیبوں کے ہاں سے بھاگ جاؤ، انھیں چھوڑ کر کسی مغربی ڈاکٹر کے پاس جاؤ جو تم کو سارے خطرات سے آگاہ کریگا اور تم اپنے آپ اور اپنی اولاد کو غیر مختتم سلسلہ مصائب سے بچا لو گے۔"

لیکن کیا کیا جا سکتا تھا؟ صورت حال انتہا درجہ نازک تھی۔ آیورویدک اطبا، تمام مغربی محققین کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے طریقۂ علاج کے بارہ میں صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے جھوٹ موٹ کی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کرنا پڑتا تھا۔ مخالفانہ تنقید کا شائبہ بھی ظاہر ہو جائے تو پھر وہ گم سم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر شخص نعرۂ تحسین بلند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے حالانکہ اس وقت تنقیص زیادہ سہل معلوم ہوتی تھی۔

صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے لئے بات کرنے کا کوئی محل ہی نہ تھا صرف پروفیسر دل ہی کو یہ موقعہ حاصل تھا۔ عمارت کا معائنہ کرتے وقت ان کی زبان سے غیر مختتم سلسلۂ کلام شروع ہو جاتا تھا اور وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ مردہ میں جان ڈالنے کے سوا آیوروید ہر قسم کا معجزہ دکھانے پر قادر ہے۔ اور بعض وقت تو وہ "احیاء موتیٰ" کے دعویٰ کے قریب آ جاتے تھے۔

۶

اس اثنا میں پھول کے ہاروں سے ہم لد گئے۔ جس جماعت کا ہم معائنہ کرنے کو جاتے اس جماعت کے طلباء ایستادہ ہو کر خیر مقدم کا ترانہ گاتے اور

اس کے خاتمہ پر باری باری سے پھولوں کے ہار ہمارے گلے میں ڈال دیتے
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہودا نام حواری کی طرح ہم اس راز
کا انکشاف کر رہے ہیں کہ ہم ان ہاروں کو بہ طیب خاطر قبول نہ کرتے تھے اس
لئے کہ اس پر کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ اندھی عقیدت مندی پر
دھواں دھار تقریر کا سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہو پاتا تھا ان کا بیان ہے کہ
آیورویدا میں امراض قلب، خون اور دماغ وغیرہ کے غیر معمولی علاج ہیں۔ اگر
کوئی نرم سے نرم بھی تنقید کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارا بیان مہمل سا
تھا۔ اگر ہم اس گفتگو میں کوئی معنی بھی پیدا کرنا چاہیئے تو سوال و جواب کا
انداز یہ ہوتا:۔

کیا آپ کے پاس ذیابیطس کی کوئی دوا ہے؟

ہاں!

کیا انسولین سے اس کو کوئی مماثلت ہے؟

نہیں!

کیا وہ انسولین کی طرح موثر و مفید ہے؟

سکوت!

کیا وہ موثر ہے؟

شاید نہیں!

کیا اس کا کوئی اثر بھی ہوتا ہے؟

ہاں۔

میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ انسولین کی ایجاد تک ذیابیطس کا مرض
خصوصاً بیس برس سے کم عمر والے اشخاص کے لئے ناقابل علاج اور عموماً

مہلک ہوا کرتا تھا۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟

ہاں؛ شاید۔

کیا ایسا نہیں ہے؟

گفتگو کی اِس منزل پر شفا خانہ کے مہتمم صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ذیابیطس جیسے امراض میں آیورویدا کچھ زیادہ موثر نہیں ہے۔ اگر مریض کو علاج سے فائدہ نہیں ہوتا ہے تو شاید وہ اس کو دوسرے علاج کا مشورہ دیتے ہیں۔

یہ بیان کرنے کے لئے طب کی وسیع معلومات کی حاجت نہیں کہ آیورویدا علاج کے بعد مرض اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ مریض کو اس سے نجات کا موقعہ نہیں۔ پھر ایسے علاج سے کیا حاصل؟

آتشک کے موضوع پر میں نے دو آیورویدک ماہروں سے جو گفتگو کی تھی اس کی تفصیلات درج ذیل ہیں (جو شائندہ پیش ہونے سے پہلے یہ گفتگو ہوئی تھی):-

ہاں! آتشک کا تو ہمارے پاس بہت ہی عجیب وغریب علاج ہے۔ بہت سے علاج ہیں اور ہم سنکھیا بھی استعمال کرتے ہیں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ آپ پچکاری کے ذریعہ علاج تو نہیں کرتے؟

نہیں خارجی علاج ہوتا ہے۔

سنکھیا اور اس کا خارجی استعمال؟

ہاں "نیوسلواسن" کی بہت چھوٹی خوراک دیجاتی ہے۔

مکمل علاج کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا ہے؟

دو یا تین ماہ۔

اس غیر متوقع جواب سے میں نے کچھ اغماض کیا۔ مگر اس کی تصحیح کرتے ہوئے بڑے طبیب صاحب نے کہا "دو یا تین سال"!

بیان کے اس اختلاف سے چھوٹے طبیب صاحب ذرا بھی پریشان نہ ہوئے۔

انھوں نے کہا "بہرصورت ہم اس کا علاج کر لیتے ہیں" اور انھوں نے کسی صاحب کے ملازم کا قصہ مجھ سے بیان کرنا شروع کیا جو آتشک کے دوسرے درجہ میں ان کے شفاخانہ میں رجوع ہوا تھا لیکن تین ماہ کے بعد واسٹرمن طریقۂ امتحان کے مطابق اس کے خون میں مرض کے کوئی جراثیم نہیں پائے گئے۔ گویا یہ علامت اگرچہ صحیح بھی ہو جس کا بہت کم امکان ہے قطعی ازالہ کا ثبوت ہے۔

میں نے اس مرض کے وحشتناک نتائج اور اس کے لئے انسدادی تدابیر کا جو مغربی طب نے اختیار کی ہیں نہایت ہی گہرا مطالعہ کیا ہے بہت عرصہ قبل میں اسی نتیجہ پر پہنچا جو سی میکلاسن نے یورپ کے مطالعہ کے بعد اپنے تاثرات کو مجملاً اس تباہ کن کلیہ کی صورت میں بیان کیا تھا۔

"جنگ اور آتشک بنی نوع انسان کے لئے عبرت کے دو خاص تازیانے ہیں"[2]

---

[1] یہ بھی ایک معمہ ہے کہ آیورویدک اطبا تشخیص مرض کے لئے ٹھیٹھ مغربی طریقۂ امتحان کیوں اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ یہی کرتے ہیں۔

[2] پوسٹ مارٹم از سی میکلاسن (جانتھن کیپ)

میکلارن ہی نے سب سے پہلے مجھے اِس عبرتناک عقوبت کی تحقیق کا شوق پیدا کر دیا تھا جس کے نتائج بد کا علم حاصل کرنا نہ صرف ہمعصر مورخین بلکہ ناول نویس، صحافت نگار، مذہبی پیشوا اور فی الحقیقت ان سب افراد کے لئے ضروری ہے جو اِنسانی واردات قلب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جنگ نے اِس قسم کے اَمراض کے متعلق عوام کی واقف کاری کی ضرورت کو شدید تر بنا دیا ہے۔ برطانیہ میں ایسے مریض کی تعداد میں سو فیصدی اضافہ ہوگیا ہے، ذخائر حرب کے کارخانوں میں مریضوں کی تعداد حیرتناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد میں آئرلینڈ کے باشندوں کی کثرت نے اس کی آگ کو ہوا دیدی ہے کیونکہ وہاں جنسی تعلیم کے خلاف کلیسائی نظام کی گرفت بہت سخت ہے۔

ہم نے فلیٹ اسٹریٹ کے باشندوں سے اغماض وچشم پوشی کے مسلک کے خلاف کئی سال تک جنگ کی ہے اور وہ بڑی خوشی کا موقعہ تھا جبکہ آغاز جنگ کے زمانہ میں میں نے ایک ممتاز با اثر جریدہ کے اِڈیٹر کو ایک ایسے مقالہ کی اشاعت کی ترغیب دی جو اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ تھا اور جس میں "آتشک" کو "مذموم مرض" وغیرہ جیسے الفاظ کے پردہ میں پوشیدہ رکھنے کی بجائے اُسکو صاف طور پر مقالہ میں درج کیا گیا تھا۔

آیورویدک اطبار کی غیر ذمہ دارانہ عقیدت مندی میری جماعت کے طور طریق کے پیش نظر حد سے کچھ متجاوز تھی اِس لئے تھوڑی دیر تک "فی الحقیقت" اور "بہت عجیب وغریب" کے الفاظ سے اس کی داد دینے کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ گرمی بہت زیادہ ہے میں ان سے رخصت ہوگیا۔

قوم پرستی کی تحریک آیورویدا کی ترقی کے لئے ایک زبردست سبب

بننے کے علاوہ اس نے عوام کے جنسی میلانات کو برانگیختہ کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے جس کے ذرائع اس طریقۂ طب میں بکثرت موجود ہیں۔

انھوں نے کہا ہم "سفوف مروارید استعمال کراتے ہیں۔ اور رانا گھوڑے کی ناف بھی۔" ہم کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ان اطبا نے کہا "ہمارے فن طب میں جواہرات مثلاً یاقوت، زمرد اور دوسری قیمتی پتھروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔"

میں نے خود مشہور و معروف سفوف مروارید کا مزہ چکھا ہے جس کو شکر اور عرق گلاب سے مخلوط کر کے چمکدار ریتی سا بنا لیا جاتا ہے۔ اس کو کھانے کے بعد ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ میں شہوانی جذبہ باقی نہیں رہا اس کے خلاف کوئی دوسرے آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ اطبا نے کہا کہ یہ سفوف مقوی قلب ہے۔ ایک خوشبودار معجون بھی ہوتا ہے جو انجیر، انار اور گلاب کے پتیوں سے تیار کیا جاتا ہے میں نے یہ بھی کھا لیا۔ ابریشم سے تیار کی ہوئی دوا کا مزہ چکھنے سے میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کو دن میں ریشم کے کیڑے زندہ ہیں۔

بہرحال دوا کے موثر ہونے کی میں اس لئے تصدیق کر سکتا ہوں کہ ایک دفعہ جبکہ میں بنگال میں تھا ایک معمر آیورویدک طبیب نے یہ سنکر کہ مجھے اس طب سے بڑی دلچسپی ہے لکھا کہ عنقریب وہ دوا کا ایک شیشہ روانہ کریں گے جس کے ذریعہ میرے تمام اہم مسائل حل ہو جائیں گے۔

دوا کا شیشہ اپنے وقت پر وصول ہوا۔ میں نے پارسل کھولا اور لیبل پہ طریقۂ استعمال دیکھنے لگا لیکن نادر و بے قاعدگی کی یہ انتہا تھی۔ یہ ایک مقوی باہ دوا تھی۔ مزید یہ کہ دوا کی یہ وہ قسم تھی جس کے استعمال کرنے والے میں حیوانی

طاقت پیدا ہوتی ہے قریب تھا کہ دوا کا شیشہ دریچہ سے باہر پھینکدوں مگر میں نے ارادہ بدل دیا اور حسین کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کمزوری کے پیش نظر جو میرا پائجامہ نچوڑتے وقت اس سے ظاہر ہوتی ہے اگر اس میں تھوڑی بہت طاقت پیدا ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔

دوسرے روز جب حسین نے مجھے آواز دی تو مجھ سے کہا کہ گزشتہ رات اس نے دوا پی لی۔

میں نے پوچھا "حسین کیا تو نے سب دوا پی لی" اس نے کہا "ہاں صاحب بڑی اچھی دوا تھی۔"

فی الحقیقت اب کی دفعہ جب اس نے پائجامہ پھیلایا تو اس کو اچھی طرح نچوڑا لیکن اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے حلقے کچھ ایسے سیاہ تھے کہ دیکھنے والوں کو اس کی نسبت شبہ ہو سکتا تھا۔

اس لئے آیورویدا دواؤں کے تاثر کا پھر بھی ہمیں تھوڑا بہت قائل ہونا پڑتا ہے۔

آٹھواں باب

بلبلِ قفس

ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر کوئی خاتون بات کر رہی تھیں آواز نہایت دلکش اور مترنم تھی۔

انھوں نے کہا "گزشتہ مرتبہ جب آپ یہاں آئے تھے تو اس وقت میں جیل میں تھی۔ اسی وجہ سے میں آپ سے نہ مل سکی۔

خیر، کم از کم فی الحال تو میں آزاد ہوں۔ تو آج پانچ بجے تکلیف فرما کر ہمارے ساتھ چائے نوش فرمائیے۔"

"جیل" کا لفظ سن کر میں کچھ حیرت زدہ ہو گیا۔

کچھ دیر کے لئے ساکت وصامت کھڑا سوچتا رہا۔ ایک دم خیال آیا "نائڈو" یہ خیال آتے ہی میرے دل کو ایک دھکا سا پہنچا۔ "میں جیل میں تھی" کے الفاظ یاد کر کے اب بھی میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ الفاظ کس کے منہ سے نکلے ہیں ——— مسز نائڈو جیسی شائستہ اور

مہذب عورت کے منہ سے!

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ہندوستان میں ایک نووارد کے دل کو ٹھیس لگانے والے اس قسم کے الفاظ مسلسل سنتے سنتے وہ ہکّا بکّا ہو جاتا ہے لیکن چند ہی ہفتہ بعد وہ کچھ عادی سا ہو جاتا ہے اور یہ الفاظ اس کے لئے تکلیف دہ ثابت نہیں ہوتے۔ اب یہ الفاظ اس کے لئے معمولی زندگی کا جزو ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہرحال "میں جیل میں تھی" کے الفاظ اب تک میرے جذبات حیرت و استعجاب کو برانگیختہ کرتے ہیں ——— خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ آواز بڑی ہی دلکش اور شیریں تھی۔

مسز نائڈو سے ملاقات کرنے سے پہلے ذرا ہم اپنی نقل و حرکت کا جائزہ لے لیں۔ اب ہم پھر حیدر آباد پہنچ گئے ہیں جہاں، غالباً قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ ہم نے ہندوستانی آرٹ کے متعلق تحقیقات شروع کی تھی۔ اس دوران میں خود ہمارے بارے میں، ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں بہت کچھ نئے واقعات ظہور پذیر ہوئے لیکن ان سب کے ذکر کرنے کی یہ جگہ نہیں ہے۔ اس وقت یہ جاننا کافی ہے کہ یہ اکتوبر کا مہینہ ہے اور یہ کہ بحیثیت وائسرائے لارڈ لنلتھ گو کا طویل اور پریشان کن دور حکومت قریب الختم ہے یہ کہ سیاسی فضا پرسکون ہے، سوائے اس نامبارک افراتفری کے جو بنگال کے قحط نے بپا کر رکھی ہے۔ درحقیقت یہ ایک بڑی تباہی ہے ہم اس کی تحقیقات برسرموقع متعاقب کریں گے۔

اس موقع پر یہ جاننا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ مسز نائڈو ہندوستانی سیاسیات میں کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو چھوڑ کر وہی بڑی سیاسی شخصیت ہیں جن کا اس کتاب میں ذکر ہوا ہے۔ ہم نے قصداً دوسری

شخصیتوں کا ذکر ترک کیا ہے۔ یہ بات مجھ کو بالکل فضول معلوم ہوئی کہ عام ہندوستانیوں کو سمجھنے سے قبل سیاسیات کے بحرِ زخاریں پھاند پڑیں۔ ہندوستانی سیاسیات کے حقیقی پس منظر سے ناواقفیت ہی اس امر کی بنیاد ہے کہ ہندوستان سے متعلقہ مباحث نہایت پوچ اور لچر ہوتے ہیں ــــ چاہے وہ دارالعوام میں ہوں یا امریکی اخباروں کے صفحات پر۔ اس سے زیادہ کوئی بات مضحکہ خیز نہیں ہو سکتی کہ چند عمر رسیدہ آزاد خیال انگریز بڑی سنجیدگی سے مغربی جمہوریت کو ایسے ملک پر چسپاں کرتے ہیں جہاں جمہوریت کے پنپنے کی اتنی ہی توقع ہو سکتی ہے جتنی کہ سرد ممالک میں پیدا ہونے والے مختلف النوع پودوں کی صحرائے افریقہ میں پرورش پانے کی امید ہو سکتی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کوئی فاش غلطی نہیں ہو سکتی کہ بعض امریکی خبریں شائع کرنے والے بڑے وثوق کے ساتھ، ہندوستانیوں کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں گویا کہ ایک قدیم باشندہ گونڈ، ایک بمبئی کا بکس والا، ایک پنجابی چپراسی، ایک مدراسی قانون پیشہ، ایک ٹراونکور کا اچھوت، ایک جنگجو سکھ، روپیہ کا کاروبار کرنے والا ایک پٹھان، مسٹر گاندھی جی اور ہزہائینس آغا خاں میں کچھ اختلافات ہیں ہی نہیں۔

اگر ہندوستانی سیاسیات کے پیچیدہ مسائل پر ایسے لوگ بحث کریں جنھوں نے نہر سویز پار نہیں کیا ہے تو یہ بحث ایسی ہی مہمل ہوگی جیسی لندن کی کاؤنٹی کونسل کے معاملات کے متعلق ان حضرات کی رائے بے معنی ہوگی جنھوں نے کراچی کے مغرب میں کبھی قدم نہیں رکھا ہے۔

بہر حال اب ہم اِس نوبت پر پہنچ گئے ہیں کہ اس صورت حال کا کم از کم ایک خاکہ تیار کریں جو ہندوستان کی بڑی بڑی شخصیتوں کی جد وجہد کا پس منظر ہے۔ اِن شخصیتوں میں مسز نائڈو بہت اہم ہیں ـــــ اور ہمیشہ اہم رہی ہیں۔ وہ اپنی عمر کے ۴۶ سال پورے کر چکی ہیں، وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جو کانگریس کی صدر منتخب کی گئیں زرق برق کور والی ساڑی میں ملبوس وہ ہر معرکہ میں نسوانی جراءت کے ساتھ انگریزی راج کا مقابلہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بارہا وہ لاٹھی چارج میں روندی گئی ہیں۔ بعض نازک موقعوں پر انھوں نے مسٹر گاندھی جی کو سنبھالا ہے۔ ایک بڑے خاندان کی ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہوئے انھوں نے انگریزی ادب میں چند سحر آفریں نظموں کا اضافہ کیا ہے۔

بقول شخصے مسز نائڈو ان سب چیزوں میں آوازے کی سی دلکشی محسوس کرتی ہیں۔ لیکن شاید اس میں حد سے تجاوز ہونے کا خطرہ ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ اب بھی ایک نوجوان خاتون معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں دلکشی ہے اور وہ اس حقیقت سے آگاہ بھی ہیں۔

۳

ٹھیک پانچ بجے یہ "سابقہ بلبل قفس" پالتی مارے تخت پر بیٹھی تھیں۔

انھوں نے کہا "یہ گھر سنگیر کے سرکس کے مانند ہے" یہ تنبیہ کے الفاظ سنکر میں نے کان کھڑے کئے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک

نہایت لاغر لڑکی نے میری کرسی کے پیچھے سے سر نکالا۔ اس نے کمزور آواز میں اس طرح مجھے مخاطب کیا ـــــــ

"ارے! تمہیں کیا ہوگیا؟ جب میں نے آکسفورڈ میں تم کو تقریر کرتے دیکھا تھا تو تم موٹے تازے اور تیز وطرار تھے۔ اب تو تم مجھ سے بھی زیادہ دبلے ہو اور اب تک تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا" ایک دوسری نسبتہً کم لاغر لڑکی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اور سخت لہجہ میں اس نے اعلان کیا۔ "اگر شہنشاہیت کے خلاف کچھ سبق سیکھنے کے لئے تم یہاں آئے ہو تو یقیناً تم نے صحیح مقام کا انتخاب کیا" ـــــــ

مسز نائڈو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "لڑکی! ذرا زبان روک مسٹر نکلس نے ابھی چا نہیں پی ہے"

میری میزبان کا ایک بیٹا بھی میرے سامنے آیا جو اچھا خاصا جوگی معلوم ہوتا تھا۔ ان کا ایک اور بیٹا تھا جس کی کالی داڑھی تھی اور جو آریو ویدک ڈاکٹر کا پیشہ کرتا تھا ـــــ کرسی پر دراز ہو کر اس نے آریو ویدک اصول بیان کرنے شروع کئے۔ مثلاً یہ کہ انسانی جسم میں نظام شمسی کے پانچ مرکز ہیں۔ پہلا مرکز عقل۔ دوسرا دونوں آنکھیں۔ تیسرا جگر۔ چوتھا قوت تخلیق۔ پانچواں ضفیرۂ شمسی۔ ممکن ہے میں نے ڈاکٹر کے الفاظ نقل کرنے میں کچھ غلطی کی ہو، کیونکہ اس وقت میں ایک چکنی سی سینڈ ویچ کو بھنبوڑ رہا تھا۔ لیکن خیال یہی تھا جو میں نے ظاہر کیا ـــــ گھر میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ان میں میری میزبان کے شوہر مسٹر نائڈو بھی شامل تھے۔ وہ بے چارے اس شور و غوغا میں کچھ سراسیمہ ہو رہے تھے۔ اس بات سے شور اور بھی زیادہ ہو رہا تھا کہ ہر دوسرے منٹ ایک نہ ایک نوکر آکر آواز لگاتا اور ایک لفافہ دیتا کیونکہ اس وقت

قحط زدوں کی امداد کے لئے مسز نائڈو کے پاس رقم جمع کی جا رہی تھی.....
ایک خوشی کے نعرہ کے ساتھ مسز نائڈو لفافہ چاک کرتیں اور اس میں سے
نوٹ نکال کر ان کو ہلاتیں ...... "یہ فلاں صاحب کے پاس سے آئے
ہیں۔ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ رقم
بہت زیادہ ہے .... اور یہ دیکھو! یہ فلاں خاتون نے بھیجے ہیں۔
وہ غلطی پر ہیں اگر وہ یہ سمجھتی ہیں کہ دس روپیہ دے کر وہ پیچھا چھڑا لیں گی۔
لڑکی! ذرا ان کو ٹیلیفون تو دے اور کہہ کہ ہمارے ساتھ چاہیں"
مسز نائڈو کے گھر میں ایک بڑی ہوشیار سیانی بلی بھی تھی اس کی صورت
ایسی پیاری اور دلکش تھی کہ جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر اسی سے کھیلتا رہوں

۴

آخرکار سرکس کا تماشا ختم ہوا۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ کس طرح سب
اداکار غائب ہو گئے کیونکہ کسی نے 'خدا حافظ' کہنے کی تکلیف نہیں گوارا فرمائی
—— میں اور مسز نائڈو کمرہ میں باقی رہ گئے انھوں نے مجھ سے مشورہ
کیا "ہم کس مسئلہ پر گفتگو کریں؟"
میں نے خواہش کی "جیل کے متعلق کچھ کہئے، اگر آپ کو کچھ عذر نہ ہو؟"
مجھے کچھ عذر نہیں جیل کا نام میرے لئے باعث ندامت نہیں ہے اور اس
سلسلہ کی بعض باتیں تو بڑی دلچسپ ہیں"
ہم کانگریسیوں کی عام گرفتاری کے اسباب و علل کو نظر انداز کرتے
ہیں۔ (یہ گرفتاریاں ۸ / اگست ۱۹۴۲ء کو واقع ہوئی تھیں) یہ موضوع ایسا
ہے کہ اس پر بحث بہت طویل پکڑے گی۔ اور جب تاریخ اپنا آخری فیصلہ

لکھے گی تو وہ برطانوی حکومت کے حق میں ایک طاقتور رائے ہوگی۔ اگر یہ گرفتاریاں واقع نہ ہوتیں تو ایک ہفتہ کے اندر اندر تمام ہندوستان میں خون کی ہولی کھیلی جاتی۔ جاپان ہندوستان میں گھس پڑا ہوتا، آتش زدگی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا اور یقیناً جنگ طول پکڑ گئی ہوتی۔ ظاہر ہے کہ مسز نائڈو اس رائے سے اتفاق نہیں کریں گی۔ وہ تو یہ یقین رکھتی ہیں کہ کانگریسیوں کی اکثریت معصوم بھیڑوں کے مانند ہے جو کسی قسم کے انقلابی خیالات نہیں رکھتی ہیں بیشک جہاں تک خود ان کی ذات کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسز نائڈو کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ یہ چیز زیادہ باعث دلچسپی ہے کہ ہم یہ خیال کریں کہ مسز نائڈو ایک شائستہ اور شریف خاتون ہیں، محض خاص قسم کے خیالات رکھنے کی وجہ سے ان کو جیل جانا پڑا۔

کانگریسی لیڈر سب بمبئی میں تھے اور ۸ اگست ۱۹۴۲ء کی رات تھی۔ چند گھنٹے قبل کانگریس کا ایک بڑا اجلاس ہوا جس میں بشمول گاندھی جی سب لیڈروں نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بڑی جذباتی اور دھواں دھار تقریریں کی گئیں۔ فضا ابر آلود تھی۔ ابر میں بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ مسز نائڈو پہلی کانگریسی رکن تھیں جو اپنے نسوانی وجدان کی بدولت آنے والے طوفان برق و باراں کو تاڑ گئیں۔

مسز نائڈو نے بیان کرنا شروع کیا:۔

"کچھ رات گئے میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے سردار پٹیل سے کہا میں سمجھتی ہوں کہ ہم گرفتار ہو جائیں گے؟"

وہ جھنجلا کر بولے "بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ آخر کیوں گرفتار ہو جائیں گے؟"

میں" نہیں جانتی۔ لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے ـــــــ اور بہت جلد آج رات یا کل ـــــــ ان کے اصرار پر غالباً میں نے یہ وجہ بیان کی کہ اگر ہم ذرا سی حرکت بھی کریں اور صرف ناک صاف کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائیں تب بھی انگریزی حکومت خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

مسز نائڈو نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "میں حسب معمول جا کر سو گئی کچھ دیر کے بعد آنکھ کھل گئی اور میرے دل میں سخت خلجان ہوا میں اٹھی جا کر نہائی اور پھر سامان باندھنے لگی۔ اور یقین جانئے ٹھیک ۴ بجے صبح گھنٹی بجی اور پولس والے آموجود ہوئے ـــــــ مجھے اس طرح روانگی کے لئے تیار دیکھ کر وہ سخت حیرت زدہ ہوئے۔ اس عجیب وغریب معاملہ پر مجھے بھی بیساختہ ہنسی آگئی۔ وہ حیرت سے بولے " بیگم صاحبہ! آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ حالانکہ خود ہم لوگ ایک گھنٹہ پہلے اس راز سے واقف نہ تھے۔" میں نے ان سے کہا کہ بس میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ ایسا ہونے والا ہے ان لوگوں نے میرے بیان کو تسلیم کیا۔ کیونکہ صحیح اطلاع کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ رات میں گھر پر پولیس متعین کر دی گئی تھی۔ اور ٹیلیفون کے تار کاٹ ڈالے گئے تھے۔

جب ہم اسٹیشن پہنچے تو صبح صادق طلوع ہو چکی تھی میں بہت ہشاش بشاش تھی، کیونکہ مجھ کو نہانے دھونے اور مناسب لباس پہننے کا کافی وقت مل گیا تھا۔ لیکن ہم میں سے بعض حضرات بڑی بدمزگی محسوس کر رہے تھے۔ کیونکہ یہ معاملہ ان کے ساتھ اچانک طور پر پیش آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس وقت گاندھی جی پوجا پاٹھ میں مشغول تھے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ پولس والوں نے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ گاندھی جی کے فارغ ہونے تک

وہ لوگ کمرے میں داخل نہیں ہوئے۔ میں خیال کرتی ہوں کہ مسٹر پٹیل پوجا نہیں کر رہے تھے۔ بعض دوسرے حضرات کے چہروں سے بھی اسی بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی عبادت نہیں کر چکے تھے۔

ہم سب مل کر چالیس نفوس تھے اور ہمارے لئے ایک اسپیشل ٹرین تیار کی گئی تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کا افسر گھبرایا ہوا آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔

"امید ہے کہ آپ حضرات کو کوئی تکلیف نہیں ہے؟"

میں نے جواب دیا "بالکل نہیں، کچھ تکلیف نہیں ہے"

پھر اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں گاندھی جی کے پاس جاکر بیٹھوں اور ان کو سنبھالے رکھوں۔ اس بات پر مجھ کو بیساختہ ہنسی آگئی اور میں نے جواب میں کہا "گاندھی جی کے پاس بیٹھنے سے میری عزت افزائی ہوگی لیکن ان کو سنبھالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یقیناً وہ کھڑکی سے باہر کود نے کی کوشش نہیں کریں گے اور نہ زنجیر کھینچ کر وہ گاڑی روکیں گے" درحقیقت گاندھی جی نہایت پرسکون اور مطمئن تھے۔ وہ ذرا بھی غصہ نہ تھے۔ صرف یہ الفاظ کئی دفعہ ان کے منہ سے نکلے "بڑا غیر دانشمندانہ اقدام ہے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ میں وائسرائے سے گفتگو چھیڑنے والا تھا"

اس اثنا میں میرا دماغ اس خیال میں مصروف تھا کہ وہ ہمیں کہاں لیجاتے ہیں۔ اس وقت یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ ریل ہمیں اڑائے لیے چلی جا رہی ہے لیکن منزل متعین نہیں ہے مجھے خیال آیا کہ شاید ہمیں اس جیل خانہ میں پہنچایا جائے گا جہاں دس سال پہلے مجھے رکھا گیا تھا اور جہاں میں نے ۱۰۸ یا ۱۰۹ پودے لگائے تھے ——— خیر کچھ پروا نہیں۔! میں اپنے درختوں کو دیکھ کر خوش ہوں گی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمیں نام نہاد

آغا خاں پیلیس میں پہنچایا گیا"

میں بیچ میں بول اٹھا " نام نہاد' کیوں"؟

" آپ جانتے ہیں کہ وہ کوئی پیلیس تو ہے نہیں۔ خصوصاً جبکہ آغا خاں کی طرف منسوب کیا جائے ـــــ لیجئے نا' ایک آدھ قاش اور کھائیے :

" شکریہ! میں اب کچھ نہیں کھاؤں گا"

مسیز نائڈو نے بیان جاری رکھا:۔

درحقیقت وہاں ہم بہت آرام سے تھے۔ کمرے آرام دہ تھے' کھانا اچھا اور صحت بخش تھا غرض یہ کہ انگریزی حکومت ہم پر بہت مہربان تھی لیکن" ـــــ اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک خطرناک قسم کی چمک پیدا ہوئی ـــــ جس چیز کو انگریزی حکومت نہیں سمجھ سکی وہ یہ تھی کہ آزاد رہ کر ہم بھوکے مرنا پسند کرتے تھے بمقابلہ اس آرام دہ زندگی کے جو ہمیں جیل کے اندر نصیب تھی۔ ہم دنیا سے بالکل بے تعلق تھے۔ ایک مکھی بھی باہر سے اندر نہیں آسکتی تھی۔ صرف ڈاکٹر بار بار ہمارے سامنے آتا تھا۔ وہ اس خیال سے خوف زدہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید ہم خودکشی کرلیں گے یا کوئی اور ایسی حرکت کریں گے جو اس غریب کے لئے پریشان کن ثابت ہوگی۔ تین ہفتہ تک ہمیں ملک کی کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی۔ اخبارات ممنوع تھے اور ریڈیو بھی ہم کو نہیں دیا گیا تھا۔ ہمارے متعلقین کو بھی خبر نہ تھی کہ ہم کو کہاں رکھا گیا ہے۔ ہمیں اس طرح رکھا گیا تھا جیسے قیمتی جواہرات کو صندوق میں محفوظ کیا جاتا ہے ـــــ

کیا آپ چائے کی ایک اور پیالی نہیں پئیں گے"؟

" شکریہ! میں اب نہیں پیونگا"

" یہ ٹھنڈی ہے اور سیاہ بھی' لیکن چائے ضرور ہے۔ اگر آپ اس کو گوارا کریں"

ہاں، تو میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"قیمتی جواہرات کی مانند آپ کی حفاظت کی جاتی تھی۔"

"ہاں ہم اس طرح رکھے گئے تھے۔ اچھا تو ــــــــ"

ہم اس کہانی کے دوسرے حصہ کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جیل کی زندگی بڑی غیر دلچسپ ہوتی ہے۔ مسز نائڈو جیسی خوش طبع شخصیت بھی یہاں ناکام ثابت ہوتی ہے۔ با ایں ہمہ کبھی کبھی پرلطف لمحات بھی آتے تھے۔ ایک نہایت پرلطف موقع وہ تھا جب کہ راجاگوپالاچاری، کانگریس کے سابق صدر، گاندھی جی سے ملنے کے لئے آئے۔

غالباً ایک نہایت ڈرامائی واقعہ جو مسز نائڈو نے بیان کیا وہ گاندھی جی کے فروری ۱۹۴۳ء والے برت کے متعلق تھا۔ اس برت کے متعلق بہت سی بیہودہ باتیں کہی گئی ہیں۔ کہا گیا کہ گاندھی جی کی صحت کا چارٹ سیاسی صورت حال کے مطابق بدلتا رہا۔ یعنی اگر وائسرائے کچھ دیتے ہوئے نظر آئے تو گاندھی جی کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ اور جب وائسرائے نے ذرا سختی دکھائی تو فوراً گاندھی جی بھلے چنگے بن بیٹھے ہیں۔ شخصی طور پر میں اس قسم کے خیالات کو کچھ پسند نہیں کرتا ہوں۔ یہ غیر فیاضانہ ہیں اور بے ضرورت بھی۔ اس میں شک نہیں ہے کہ کوئی اس برت کو حق بجانب ثابت نہیں کر سکتا۔ صریحاً وہ ایک دھمکی تھی۔ قطع نظر اس کے نتیجہ سے عام سیاسی صورت حال پر اس کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اس کی وجہ سے مسائل کی پیچیدگی میں اضافہ ہو گیا۔ چونکہ ہم اس قسم کی سیاسی چالوں سے نفرت کرتے ہیں اس لئے اس بات کے یقین کرنے میں بھی ہم حق بجانب نہیں ہیں کہ یہ برت ایک فریب تھا۔

مسز نائڈو نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا "نا ؤمیں

روز تمام ظاہری حالات کے لحاظ سے گاندھی جی مر چکے تھے۔ صبح سے ان کو انحطاط محسوس ہوا اور اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔ ہم سب لوگ ان کے پلنگ کے اطراف جمع ہو گئے۔ ہم اس فکر میں پڑ گئے کہ بڑی گھڑی کہہ کر نہیں آتی ہے۔ جھٹ پٹے کے وقت ایسا معلوم ہوا کہ گاندھی جی ختم ہو گئے۔ ان کی سانس رک گئی اور نبض ساقط ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ دنیا سے ایک روشنی غائب ہو گئی۔" وہ نہیں بیان کر سکتیں کہ کس طرح انھوں نے دوبارہ زندگی پائی اور کیا کرامت تھی کہ مردہ جسم پھر حرکت کرنے لگا۔ وہ صرف یہ کہہ سکیں کہ قوت ارادی کی عظیم طاقت سے یہ کرشمہ سرزد ہوا۔ غالباً ان کا خیال ٹھیک ہے ہندوستان میں بکثرت ایسے آدمی ہیں جو موت کی وادی میں دور تک جانے کے بعد پھر اُلٹے قدموں واپس آگئے ہیں۔

۴

گزشتہ بیان کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ مسز نائڈو نے جن امور کو نظر انداز کر دیا ہے وہ ان امور کی بہ نسبت زیادہ اہم ہیں جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا۔ برطانوی شہنشاہیت کے خلاف اپنے جذبہ کو انھوں نے چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ اگر جیل خانے کے انتظامات کے متعلق ان کو کچھ شکایات ہوتیں چاہے ان کا تعلق خود انکی ذات سے ہوتا یا دوسرے بدنصیب لوگوں کی ذات سے، تو وہ ضرور ان چیزوں کو ایک ایک کر کے گناتیں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے کہ سخت وحشیانہ اور ظالمانہ حرکات کے ارتکاب کا ہم پر الزام نہیں لگایا۔ انگریزی راج کے سخت سے

سخت مخالفین نے بھی سنجیدگی کے ساتھ یہ الزام نہیں لگایا کہ ہم نازی کنسنٹریٹنگ کیمپ' کی نقل کرتے ہیں[1]

آدمی خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے الزامات لگائے جائیں گے :۔
بدخلقی سے پیش آنا، دفتری کاروبار میں اہل دفتر کا جھنجلا جانا، ڈرا دھمکا کر بزدلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا وغیرہ۔ لیکن یہ واقعہ کہ مسٹر نائڈو نے اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا اس امر کے یقین کرنے میں ہم کو حق بجانب ثابت کرتا ہے کہ درحقیقت اس قسم کی کوئی چیز وجود میں آئی ہی نہیں۔

جب انگریز ناقدین ہندوستان میں بھرے ہوئے جیل خانوں کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں، جب وہ ہمارے مسلمہ اصول اور ہمارے اعمال میں شرانگیز مقابلہ کرتے ہیں، تو وہ چند اہم بنیادی واقعات کو بھول جاتے ——— اس واقعہ کو تو وہ بالکل ہی نظرانداز کر دیتے ہیں کہ جیل خانوں میں رہنے والوں کی بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے ضرر رسانی اور نقصان رسانی کے جرائم کا ارتکاب کیا اور جن کو اس کا اعتراف بھی ہے ——— اگر یہ لوگ کسی دوسرے ملک میں ایسی حرکتیں کرتے ———

---

[1] صرف چند مواقع ہیں، اور وہ بھی فسادات کی نوعیت کے جن کے سلسلہ میں برطانیہ پر تشدد کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ایک یا دو ناخوشگوار واقعات کے علاوہ جن میں سے امرتسر کا واقعہ سب سے زیادہ بدنام ہے، الزامات یہ ہیں کہ چند لوگوں کے ہاتھ پانو ٹوٹ گئے اور چند کے سروں میں معمولی زخم آئے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ جرائم بھی ہندوستانی پولس سے سرزد ہوئے۔ جن کو بڑی تعداد کے مقابلہ میں مدافعت کرتے ہوئے ایسا کرنا پڑا۔

خصوصاً جنگ کے زمانے میں ———— تو یقیناً وہ گولی سے اُڑا دیئے جاتے۔

از آنجملہ ایک واقعہ یہ ہے کہ جیل جانے والوں میں اکثر وہ لوگ ہیں جنھوں نے قصداً جیل جانا پسند کیا۔ یہ سوال نہیں تھا کہ کس طرح ان کو جیل میں بند کیا جائے بلکہ اصل سوال یہ تھا کہ کس طرح ان کو جیل میں گھسنے سے باز رکھا جائے۔ جیل جانا ایک طغرا امتیاز تھا۔ لوگ فخریہ جیل جاتے تھے۔ چند روز جیل خانہ میں گزارنا نہایت منفعت بخش تجارت میں روپیہ لگانے کے مساوی سمجھا جاتا تھا۔ بے شک سیاسی لیڈروں کے لیئے تو جیل جانا نہایت ضروری تھا؛ اور پیشہ صحافت سے تعلق رکھنے والوں کے لیئے بھی تقریباً اتنا ہی لابدی تھا۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ عوام کالانعام بھی اس خیال سے جیل جانا پسند کرتے تھے کہ وہاں خوب آرام سے گزرے گی۔ نوجوان جانتے تھے جیل خانے میں بہت سے خادم ان کی خدمت کے لیئے دست بستہ حاضر ہیں۔

اِن نوجوانوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ انگریزوں کو مادر وطن سے خارج کر دینے ہی میں ان کا مفاد مضمر ہے۔

سنجیدہ کانگریسی اس امر واقعہ سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ اور وہ کیوں انکار کرنے لگے جب کہ انگریزی حکومت کو پریشان کرنے کے لیئے بڑی ذہانت صرف کر کے یہ اعلیٰ درجہ کی تدبیر تیار کی گئی تھی بھلی دشواری تو یہی تھی کہ "زبردستی کے قیدیوں" کی اتنی کثیر تعداد کے لیئے جگہ مہیا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا خصوصاً ایسے وقت جبکہ ہر دستیاب ہونیوالی عمارت فوجیوں سے پٹی پڑی تھی۔ ظاہر ہے کہ سیاسی نظربندوں کے

یہ بڑھتے ہوئے اعداد و شمار بیرونی دنیا میں برطانوی حکومت کے اقتدار کو کافی ٹھیس لگا سکتے تھے۔

اگر حقیقی واقعات روشنی میں آجاتے تو معلوم ہوتا کہ تنہا برطانوی اقتدار ہی اس سے متاثر نہیں ہوا ہے۔ عوام کے اس فساد عظیم میں مغربی مبصرین کے لئے چند نہایت پریشان کن حقائق مضمر ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اگر اس خیال کو تسلیم بھی کر لیا جائے (شخصی طور پر میں نہیں تسلیم کرتا ہوں) تو ہم یہ کہیں گے کہ کسی دوسرے ملک کے نوجوان اس قسم کے طرز عمل کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اس میں شجاعت اور مردانگی بھی نہیں ہے اور نہ اس کو جدت سے منسوب کر سکتے ہیں۔ یہ تو سرتا سر ہندوانہ ہے۔ یہ اس خاص قسم کی روح کا ایک پہلو ہے جو ہندوؤں کی زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔

دوسرا اہم عامل جس کو ہمارے ناقدین نظرانداز کر دیتے ہیں یہ ہے کہ جیل خانوں میں آنے والوں کی بڑی تعداد کا تعلق ایسے طبقوں سے ہے جو فاقہ زدہ اور مفلوک الحال ہیں اور ان کے لئے جیل خانہ کی زندگی نسبتہً بڑے آرام کی زندگی ہے۔ سیاسی روابط ان پر کچھ اثر انداز نہیں ہوتے ہیں۔ گاندھی، جناح، اور نہرو ——— ان کے لئے بے معنیٰ الفاظ ہیں۔ ان کو صرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ فاقہ زدہ اور بے خان و ماں ہیں۔ عام حالات میں وہ جیل خانہ سے ایسے بچتے جیسے کوئی طاعون سے بھاگتا ہے۔ اور جیل خانہ سے چھوٹنے کے بعد تو وہ اور بھی اس کے نام سے خوف زدہ ہو جاتے۔ لیکن اب ان وجوہ کی بنا پر جن کو وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں جیل خانہ ان کے لئے ایک باعزت جگہ بن گیا ہے۔ ان کے بزرگ اور انکے

لیڈران کو جیل خانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور وہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جیل خانہ میں صحت بخش کھانا اور صاف ستھرے بستر ہیں اور وہاں کل کی کوئی فکر نہیں ہے۔

پیٹ کا مطالبہ تو پہلے ہی سے تھا۔ مادر وطن کی خاطر جام شہادت نوش کرنے کے شوق نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ دیوانہ را ہوئے بس است نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ لاٹھیاں تان اور چھرے چمکا کر دیوانوں کی ایک فوج جیل خانے کی طرف جھپٹ پڑی۔

ہندو زندہ باد

ہندوستان کا شاید یہ پہلا تمثیلی پیش کش ہے جس کے تیسرے ایکٹ میں گاندھی جی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تو عموماً پہلی دفعہ پردہ اُٹھتے ہی نظر آ جاتے ہیں اور آخر تک پورے ڈرامہ پر چھائے رہتے ہیں مگر یہاں اپنے ظہور کی مختصر سی مدت میں بھی آپ سنینگے کہ وہ شور مچا رہے ہیں۔
لیکن آپ کہیں گے کہ ہندوستان تو محض گاندھی جی سے عبارت ہے

بار بار ہم سے یہی کہا گیا ہے اس لئے ہمارا خیال تھا کہ اس میں کوئی صداقت ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ دس کروڑ مسلمانوں کی کثیر اکثریت نے گاندھی جی کی قیادت سے صاف انکار کر دیا ہے، اور وہ ان کو بجا طور پر اپنا خطرناک دشمن تصور کرتی ہے۔ گاندھی جی ہندوستان کے ایسے ہی قائد ہیں جیسے لاوال آزاد فرانیسیوں کے۔ ہندی مسلمانوں سے درحقیقت عام طور پر لوگ بہت کم واقف ہیں کیونکہ پروپیگنڈہ کے لئے ان کے پاس روپیہ نہیں ہے اور نہ تشہیر کے فن میں انھیں گاندھی جی کا سا کمال حاصل ہے۔ پھر بھی ان کے مطالبات پر کان دھرنا ضروری ہے اگلے باب میں ہم ان کا ذکر کریں گے۔

فی الحال یہاں ہندوستانی اسٹیج کے اس گرگ باران دیدہ کی نسبت کچھ وضاحت کے ساتھ لکھا جائے گا۔ ان سے میری شخصی ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ میرے قیام کے دوران میں جیل میں تھے۔ ”جیل“ کے لفظ سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے اس امر کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ گاندھی جی کو قصر آغا خاں میں رکھا گیا ہے۔ تحریری اطلاع دینے کے بعد حسب مرضی کسی وقت بھی ان کو قصر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ یہاں ان کو ضمیر کے خلاف کسی معاہدہ پر مجبور نہیں کیا گیا۔ یہاں انھوں نے اپنے نفس یا کسی دوسرے سے غداری پر مجبور نہیں ہوئے اور نہ آزادیٔ ہند کے نصب العین کی مخالفت یا حمایت میں ان کو کسی طرح متاثر کیا گیا۔ ان سے صرف اس امر کا اقرار لیا جاتا رہا کہ وہ ساحی جنگ کو متاثر نہ کریں۔ وہ اپنے ملک کے دروازے جاپانیوں کے لئے کھلے نہ رکھیں۔ برطانوی اور امریکی

افواج کی پیٹھ میں خنجر نہ گھونپیں۔ صرف ان ہی امور کی ضمانت کا مطالبہ کیا
جاتا رہا۔ انھوں نے تزکیۂ روح کے لئے جیل میں رہنا گوارا کیا مگر یہ شرطیں
قبول نہ کیں اور ادھر ان کے بے شمار مداحوں نے ان کے طرز عمل کو
مقدس اور حق بجانب ثابت کرنے کے لئے دھواں دھار تقریروں سے
ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا حتیٰ کہ برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی
مجالس قانون ساز میں یہ آوازیں پہنچیں اور نتیجۃً پارلیمنٹ کے ارکان
بھی متاثر ہوکر ایسے بے معنیٰ استفسار کرنے لگے جن کی نظیر جمہوری اداروں
کی پچھلی تاریخ میں دستیاب نہیں ہوسکتی۔

جو مصنفین گاندھی جی پر تنقید کرتے ہیں بلا استثنا ان میں سے ہر
ایک کا دستور ہے کہ وہ اپنی رائے کے اظہار میں غیر معمولی تکلف برتتے ہیں
مثلاً وہ لکھتے ہیں "ہمارا خیال ہے کہ ان کا مسلک قابل عمل نہیں ہے —
مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک باخدا اور ولی صفت انسان ہیں"۔ یا بعض
مصنفین تحریر کرتے ہیں "حقائق کے بارہ میں ان کے نظریوں سے گو ہم
اختلاف رائے رکھتے ہیں لیکن صداقت کے ساتھ ان کی شیفتگی ایک
لمحہ کے لئے بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتی"۔ ان اقتباسات سے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ وہ خوفزدہ ہیں کہ مبادا یہ دبلا، پتلا اور چھوٹے قد کا انسان فضاء
سے اچانک ان پر جھپٹ پڑے اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دے
میں ایسے لوگوں کی اتباع پسند نہیں کرتا۔ اس شکوہ آمیز مدح سرائی
کے سوا جو آمریت کی ظاہری خوبیوں سے متاثر ہوکر ایک شخص بادل
ناخواستہ کسی آمر کے لئے استعمال کرے، گاندھی جی کی ستائش اور تعریف
کے لئے میرے پاس کوئی اور الفاظ نہیں ہیں۔ اس سے قطع نظر کر

دولت برطانیہ کی انتہائی مصیبت و پریشانی کی ساعت میں انھوں نے اسی جذبہ کے ساتھ ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔ جس جذبہ کے ساتھ مسولینی زوال فرانس کے لئے بیتاب تھا، باقی اور پہلوؤں سے بھی وہ مجھے ہندو سیاست کے خصوصی ماہر معلوم ہوتے ہیں جو غیر معتدل خود نمائی، تنگ نظری جہل اور نہایت ہی ناقابل برداشت عناصر کی حامل ہے، اب رہا صداقت کے ساتھ ان کی شیفتگی کا مسئلہ جس کے متعلق بڑی ڈینگیں ماری جاتی ہیں گاندھی جی کو چاہیئے کہ اس لفظ کے معنی لغت میں تلاش کریں اور اس کے بعد اگر وہ دانشمند ہیں تو جس قدر جلد ممکن ہوگا وہ اپنا موضوع بدل دیں گے۔

لیکن میں موضوع بدلنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ گاندھی جی کے مویدین میری اس کتاب کو ضرور اعتراضات کا ہدف بنائیں گے لیکن ایک لمحہ کے لئے گاندھی جی کے اس طرز عمل پر بھی نظر رکھنی چاہیئے جو "مدر انڈیا" پر اعتراض کرتے وقت انھوں نے اختیار کیا تھا کیونکہ یہ کتاب ان کی پسند کی نہ تھی جب مدر انڈیا شائع ہوئی تو ایک صاعقہ تھا جس کے اثر سے ساری دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ بجلی کا کڑاکا بڑھتا ہی رہا۔ طوفان میں کمی کے کوئی آثار نمایاں نہ تھے اور گاندھی جی کو اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا اس لئے انھوں نے اس کتاب پر "انسپکٹر صفائی کی رپورٹ" کے عنوان سے ساڑھے چھ کالم کا طویل اعتراض سپرد قلم کیا۔ یہ ایک ایسے شخص کے طرز عمل کی مثال ہے جو صداقت پسندی کا بلند بانگ دعویٰ کرتا ہے جس پر صرف حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جا سکتا ہے[1]۔

---

[1] اس مسئلہ کی مزید تفصیلات کے لئے، ہیری۔ ایچ۔ فیلڈ کی کتاب موسومہ "آفٹر مدر انڈیا" دیکھیئے

بالکل غیر جذباتی انداز میں انھوں نے اس کتاب کو دروغ بافیوں کے معجون مرکب سے تعبیر کیا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ "کتاب غیر صحیح بیانات سے بھری پڑی ہے اور میرے خلاف یہ ایک قسم کا ارتکاب جرم ہے۔ امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب پر یقین نہ کریں"

مس میؤ سے ملاقات کے دوران میں گاندھی جی نے ساری دنیا کے نام پیام دیا تھا۔ جب اس ملاقات کی تفصیلات اس کتاب میں شائع ہوئیں تو انھوں نے اس پر سخت تنقید کی کہ یہ صحیح نہیں ہیں۔ لکھا تھا "مجھے یاد نہیں کہ میں نے وہ پیام دیا تھا جسے مس میؤ مجھ سے منسوب کرتی ہیں اور خود اس شخص کو جو اس موقعہ پر موجود تھا اور جس نے اس پیام کو قلمبند کیا تھا یاد نہیں کہ یہی وہ پیام ہے جو مجھ سے منسوب کیا گیا ہے"

گاندھی جی کے قلم سے جن کی حیثیت ہندوستان کے لئے جارج واشنگٹن کی سی ہے ایسی تنقید کا نکلنا سخت افسوسناک حقیقت ہے اس امر کے ثبوت کے لئے ناقابل تردید دستاویزی شہادت موجود ہے کہ گاندھی جی اور ان کے احباب نے جس پیام کو بآسانی فراموش کر دیا۔ خود گاندھی جی نے اس کی نظر ثانی کی، توثیق کی، ان کے معتمد نے اس کو ٹائپ کیا، گاندھی جی نے اس پر دستخط کئے۔ اور "مدر انڈیا" کے مصنف کے نام اپنے ایک خط کے ساتھ جاری کیا جس کی ابتداء طنزاً "محترمہ و مشفقہ" سے کی گئی تھی۔[1]

---

[1] گاندھی جی کے اس دستخطی مکتوب کا عکس "فادر انڈیا" کے صفحہ ۹۲ پر دیا گیا ہے۔ مصنف کتاب کے الفاظ یہ ہیں "مسٹر گاندھی کا ٹائپ شدہ پیام جسے ان کے ایک ملازم نے ملاقات کے اختتام پر لاکر دیا تھا پھر ان ہی کی استدعا کے بموجب نظر ثانی اور اضافہ کی غرض سے دوبارہ ان کے پاس واپس بھیجدیا گیا

بہرحال باور کرایا گیا کہ گاندھی جی نے اس سارے قصہ کو فراموش کر دیا۔
خیر، ممکن ہے صورت حال یہی ہو مگر حافظہ کی یہ کمزوری جس سے کوئی واقعہ بڑی آسانی کے ساتھ بھلا دیا جائے، گاندھی جی کے اس دعویٰ کو باطل کرتا ہے کہ وہ ہندوستان میں اسی حیثیت کے مالک ہیں جو امریکہ میں جارج واشنگٹن کی تھی
"انسپکٹر صفائی کی رپورٹ" والے مقالہ میں جو فی الحقیقت گاندھی جی کے تصور صداقت کے حامیوں کے لئے بھی ایک اعجوبہ ہے انھوں نے بہت سی باتوں کا اعتراف کیا ہے۔ کیا اس کو غلط بیانی کہا جائے؟ انھوں نے مس میؤ کو نہ صرف چیلنج کیا بلکہ تاریخی حقائق سے بھی انکار کیا ہے مس میؤ کی کتاب میں اُن کے موثر بیانات کے منجملہ وہ بیان بھی ہے جس میں بمقام بمبئی پرنس آف ویلز کے استقبال کا حال درج ہے نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان اور امریکہ کے جرائد اس استقبال سے متعلق نظر فریب تصاویر اور تفصیلات سے بھرے تھے جو اس وقت کی سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ خبریں تھیں ٹائمز آف انڈیا نے جو مشکل ہی سے غیر ذمہ دار جریدہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور ان تین اخباروں میں اس کا شمار ہے جن کا گاندھی جی روزانہ مطالعہ کرتے ہیں، اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔
"کوتوالی تقریباً مجبور تھی۔ اس مجمع کو جو شہزادہ کو قریب سے دیکھنے کی تمنا میں آگے کی طرف اُمنڈ رہا تھا۔ کوتوالی پیچھے نہ ہٹا سکی۔ راہروی کے قانون۔ قاعدے پادر ہوا ثابت ہوئے۔ لوگوں نے شہزادہ کی موٹر کے اردگرد ہجوم کر کے تالیوں کی گونج میں ان کا استقبال کیا۔ تالیوں کی یہ گونج اس ہی پہلے

حاشیہ صفحہ (۲۵۰) پھر گاندھی جی نے اپنے خط کے ساتھ توثیق شدہ بیان مس میؤ کے پاس روانہ کیا۔

بمبئی میں کبھی سنائی نہ دی تھی حتیٰ کہ گاندھی ٹوپی پہننے والوں نے اپنی ٹوپیاں ہوا میں اڑائیں۔ امراء اپنی موٹروں میں اور غریب چیتھڑے لگائے موجود تھے۔ ہندو مسلمان، پارسی اور یورپین سب کے سب محبت و وفاداری سے اس مظاہرہ میں شریک تھے۔ لوگوں کے اژدھام کا یہ حال تھا کہ شہزادہ کو اپنی سڑھ میں نشستوں گز کا فاصلہ طے کرنے کے لئے دس منٹ درکار ہوئے۔"

ایسے میں جبکہ یہ غیر معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوا ایک ممتاز ہستی ہندوستان کے سفر میں مصروف تھی ساری دنیا کے مصوروں نے اپنے کیمروں کا رخ اسکی جانب پھیر دیا تھا ـــــ گاندھی جی۔ کے تیز کان تو زمین کی طرف اور ان کی تیز آنکھیں افق پر لگی ہوئی تھیں تاکہ معمولی آواز بھی سن سکیں اور شہزادہ کی ہر موہوم سی نقل و حرکت کو دیکھ سکیں کیوں؟ اس لئے کہ شاہی وردے کے اس موقع پر وہ مقاطعہ کا اہتمام کر رہے تھے۔ اس لئے اس پر یقین کرنا بہت ہی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صدر مظاہروں سے وہ قطعاً لاعلم تھے۔ پھر بھی گاندھی جی ہم کو یہی باور کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نہایت بھونڈے طریقہ پر بیان کرتے ہیں کہ یہ واقعات سرے سے پیش نہیں آئے۔ وہ تحریر کرتے ہیں۔

"پرنس آف ویلز کے استقبالی مظاہرہ کا حال لکھتی ہیں جس کے متعلق ہندوستان کچھ نہیں جانتا لیکن اگر استقبال کیا گیا ہے تو ناممکن ہے کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف نہ ہوئی ہو۔"

مسٹر گاندھی کے بیان کو اس مفروضہ کی بناء پر صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس موقع پر طویل بے ہوشی یا سکتہ کے عالم میں تھے۔

بہ دوران تبصرہ مسٹر گاندھی مخالفین کے بیانات میں اپنی جانب سے چھوٹے چھوٹے الفاظ داخل کرنے کا وہی بہانہ استعمال کرتے ہیں جو ہندوؤں کا معمول ہے۔ اور پھر اپنے حریفوں کو دعوت مبارزت بھی دیتے ہیں ("ارباب صحافت" والے باب میں، اس عادت کا تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے) اس موقع پر "ہمیشہ" کا لفظ اپنی طرف سے شامل کیا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی لکھتے ہیں۔

"انھوں نے میری ملاقات کا حال قلمبند کرتے ہوئے اپنے ناظرین کو آگاہ کیا ہے کہ "ہمیشہ" دو معتمد میرے ساتھ رہتے ہیں اور ہر" وہ لفظ" لکھ لیتے ہیں جو میری زبان سے ادا ہوتا ہے یہ بیان صحیح نہیں ہے"

ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن مس میو نے تو یہ نہیں لکھا۔ یہ تو مسٹر گاندھی جی کا بیان ہے۔ لفظ "ہمیشہ" ان کی اپنی ایجاد ہے۔ مس میو نے بڑی شائستگی سے کتاب کے متن کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی اور مصنفہ کے الفاظ میں جس نزاکت کے ساتھ انھوں نے تصحیح کی تھی اس کی جانب اشارہ کیا۔ یہ لکھنے کی حاجت نہیں کہ گاندھی جی نے مس میو کے خط کی رسید تک نہیں بھیجی۔

میں اپنے الفاظ کا اعادہ کرتا ہوں کہ "انسپکٹر صفائی کی رپورٹ" گاندھیانہ ذہنیت کے حامیوں کے لئے بھی ایک اعجوبہ ہے۔ وہ عذر تراشی دورنگی اور غلط مضمرات کی شاہکار ہے اور اس کی خصوصیت بن گئی ہے جو طوطے کی طرح لفظ "صداقت" کی ایسی رٹ لگاتا ہے کہ آدھی دنیا اس گیدڑ بھبکی کا شکار ہو کر اس کے ظاہری طمطراق پر یقین کرنے لگتی ہے۔

سردست ہمیں گاندھی جی سے بحیثیت انسان نہیں بلکہ بحیثیت ڈکٹیٹر سروکار ہے نیز ان کے پیدا کئے ہوئے اس فاشسٹی نظام سے جو کانگریس

کہلاتا ہے اور ان کے کوڑے کی ذراسی آواز پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔
تاریخ جدید کا ایک حیرتناک تضاد یہ بھی ہے کہ کانگریس مغرب کے چند مخلص آزاد خیالوں کی چہیتی بن گئی ہے حالانکہ اگر ان سے کہا جائے کہ اس کے دامن فاشسٹیت کی آلودگیوں سے پاک نہیں تو ان کے ہوش اڑ جائیں۔ موجودہ دنیا میں کٹر قسم کی فاشسٹیت کی صدفی صد ٹھیک اترنے والی اگر کوئی مثال ہے تو وہ کانگریس ہی ہے۔
پہلے تو یہ اپنے اصول کے لحاظ سے فاشسٹی تنظیم ہے ایک خاص نسل کے تفوق اور اس کے خون کو خالص رکھنے کی ضرورت، پر نازی جو زور دیا کرتے ہیں اس کے جواب میں یہاں برہمنوں کو اپنے تفوق کا دعویٰ ہے اور وہ بھی ذات پات کے قوانین کو برقرار رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ جس طرح ہر نازی ایک فوق البشر ہستی ہے اسی طرح ہر برہمن ایک "ارضی دیوتا" ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریسی نظام پر برہمن بالکل چھائے ہوئے ہیں۔
دوسرے یہ کہ اپنے عمل کے اعتبار سے کانگریس فاشسٹی تنظیم ہے۔ یہ گاندھی جی کی آمریت ہے۔ اس بیان کے ثبوت میں اتنی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ ان میں سے کسی عمدہ مثال کا انتخاب دشوار ہو جاتا ہے شاید سب سے واضح مثال یہ ہے کہ گاندھی جی نے صوبہ داری حکومت خود اختیاری قائم کرنے کی برطانوی کوشش کو بذات خود پامال کر دیا۔ ۱۹۳۵ء کے قانون نے صوبہ داری حکومتوں کو وسیع اختیارات دیئے تھے لیکن کانگریس کی انتخابی جماعت نے جس پر گاندھی جی مسلط ہیں اس قانون کو مفلوج کر دیا ہے۔ صوبہ داری حکومتوں پر ان کی مرضی اسی طرح غالب رہی جس طرح مسولینی کی مرضی اطالوی جماعتوں پر جس شخص نے بھی خود مختاری کا ذرا سا رجحان

ظاہر کیا فوراً ہی اس کے سر پر کلہاڑا آن پہنچا۔
تیسرے یہ کہ خود اپنے کھلے اعترافات کی بنا پر یہ فاشسٹی جماعت ہے
ان اعترافات سے متذکرۂ بالا آزاد خیالوں کا موقف اور بھی عجیب و غریب
بن جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔
جس طرح کچھ لوگوں نے "میری جد و جہد" کو اس کے ظاہری مفہوم کی بنا پر
کوئی اہمیت دینے سے انکار کیا تھا اور اس طرح اندھوں کی طرح اس حقیقت
کو پہچاننے سے قاصر رہے کہ وہ کتاب دنیا کو ایک آخری نوٹس ہے اسیطرح
یہ آزاد خیال بھی کانگریسی اعلانات کو محض ان کے ظاہری مفہوم کی بنا پر
اہمیت نہیں دیتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس کی دو آوازیں ہیں
ایک تو مشرق کے لئے اور دوسری جو نسبتاً بہت ہی ملائم ہے، مغرب
کے لئے۔

اب ہم اس بیان کی وضاحت کریں گے کہ خود اپنے کھلے اعترافات
کی بنا پر کانگریس ایک فاشسٹی جماعت ہے۔
کتاب "آئرن ڈکٹیٹر" میرے پیش نظر ہے اس کے گرد پوش پر
ایک غضبناک جذباتی چہرہ بنا ہوا ہے۔ اس چہرہ سے وہی مصنوعی کیفیت
ظاہر ہے جو کسی زمانہ میں مسولینی کے چہرے پر نمایاں تھی۔ جب کہ وہ
تارے توڑ لانے کی سوچتا تھا۔ یہ چہرہ کتاب کے موضوع یعنی سردار پٹیل
کی تصویر ہے اور بہت ہی اچھی تصویر ہے۔
پٹیل کانگریس کے اہم جماعتی آقا ہیں۔ جان گنتھر نے ان کی نسبت
کہا تھا کہ وہ کانگریس کے "جم فارلی ——————
ہیں جو جماعت کی تشکیل اور تنظیم میں مروت اور رعایت سے کام نہیں لیتے"

کتاب کا مصنف فخر کے ساتھ اس لقب یعنی "رجم فارلی" کا حوالہ دیتا ہے اور اس کی مزید توضیح کے لئے اپنی طرف سے بھی ایک ذیلی لقب کا اضافہ کرتا ہے یعنی "گاندھی جی کے سب سے بڑے جنرل"۔ یہ لفظ "جنرل" غور طلب ہے۔ امن و آشتی کے نرم زبان پیامبر کے ساتھ اس لفظ کا استعمال عجیب عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی، رجم فارلی، جماعتی آقا جنرل یہ سارے ایک ہی کشتی کے سوار کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن حقیقت حال تو یہی ہے۔

ہندوستان میں "آئرن ڈکیٹر" خوب فروخت ہوئی۔ ہر کتب فروش کے ہاں یہ کتاب نظر آئے گی۔ جوشیلے کانگریسیوں نے اکثر مجھ سے بھی خواہش کی ہے کہ میں یہ کتاب پڑھوں۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اوسط کانگریسی ذہنیت کی اسی طرح آئینہ دار ہے جس طرح ردزن برگ ——— ——— کے نظریات نازی فلسفہ کے آئینہ دار ہیں۔

اب ہم یہ کتاب کھولتے ہیں اور صفحہ ۳۹ پر نظر ڈالتے ہیں اس میں تحریر کیا گیا ہے کہ "گاندھی جی کا یہ سب سے بڑا جنرل" اپنے سیاسی حریفوں سے کیا سلوک کرتا ہے۔ کانگریس کے وہ تمام اراکین جو اس سے متفق نہیں ہوتے ان سب کا یہی حشر ہوتا ہے۔ اس خاص صورت میں پٹیل کا حریف بمبئی کا ممتاز وزیر نریمان تھا جو پٹیل کے مذاق کے لحاظ سے ضرورت سے زیادہ "تصور پرست" تھا اس لئے پٹیل نے تصفیہ کیا کہ اسے راستہ سے ہٹا دینا چاہیئے۔ کتاب کا مصنف نمایاں طور پر اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"پٹیل کا طریقہ کار عمومیت پر مبنی نہ تھا بلکہ یہ تو عمومیت کا ردعمل تھا جو

شخص بھی اس سے متفق نہ ہو اس کا ہٹا دیا جانا ضروری تھا ....
ہر شخص یا تو پٹیل کا ہمنوا ہو کر اس کی مشین کا کل پرزہ بن جاتا تھا یا اس سے اختلاف کرنے کی صورت میں بیک بینی و دو گوش نکال باہر کیا جاتا تھا۔ اس نے بے دردی کے ساتھ لیکن چالبازی سے اپنے حریفوں کو راستے سے ہٹا دیا۔

بے دردی اور چالبازی .... ان دو چیزوں کا ناپاک اتحاد اس سے پہلے کب سننے میں آیا تھا؟ کیا ان سے ہٹلر کی زندگی کا ایک خاص واقعہ یاد نہیں آجاتا؟ ہاں، اس اندیشہ سے کہ کہیں ہم یہ واقعہ بھول نہ گئے ہوں خود مصنف ہی عجلت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیتا ہے۔

"نریمان نہ صرف پٹیل کا ہم خیال نہیں تھا بلکہ جرمن خصوصی دستوں کے کمانڈر ون ارنسٹ .... اور روہم .... کی طرح اپنے ڈکٹیٹر (آمر) سے شخصی اختلاف بھی رکھتا تھا ان کمانڈروں کو ہٹلر نے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ نریمان کو مارا نہیں گیا بلکہ اسے نکال دیا گیا" "نکال دینے" کی اصطلاح مفید مطلب ہے۔ کانگریسی طریقہ عمل کی تحقیقات کے دوران میں ہم بار بار اس اصطلاح سے دوچار ہوں گے۔

پھر اس بات کا یقین حاصل کر لینے کے لئے کہ ہم دونوں آمریتوں یعنی کانگریسی و نازی آمریت، کی باہمی مشابہت کو نظر انداز کر دیں مصنف مذکور صاف صاف کہتا ہے:-

"یہ فرق تصورات کا فرق نہیں بلکہ صرف طریقہ کار اور شدت کا فرق ہے" آگے چل کر مزید وضاحت کے لئے وہ پٹیل کا اس کے ایک مشہور رقیب چندر بوس سے موازنہ کرتا ہے "پٹیل اور بوس میں وہی فرق ہے جو ہٹلر

اور روڈلف ہس میں ہے ؟
ہم میں سے اکثر غالباً آخری دو اشخاص میں سے تھوڑی بہت پس وپیش کے بعد ہس کی تائید میں اپنی رائے دیں گے لیکن ہوا کیا؟ آخر ہم کانگریسی تو نہیں۔
گاندھی جی کے اس قریب ترین رفیق کار اور بلند قامت بے درد سیاس کی صحیح تصویر کھینچنے کے لئے ساری کتاب نقل کر دینے کی ضرورت ہو گی۔ اپنی گرفتاری سے قبل اس نے ایک ہی جملہ میں نہ صرف اپنی شخصیت کا بہترین طریقہ سے اظہار کیا ہے بلکہ ایک نو مہ دار مدبر قرار دیئے جانے کی اہلیت بھی واضح کر دی۔ یہ کرپس مشن کا زمانہ تھا۔ جاپانی تیزی سے ہندوستانی سرحدوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ادھران سرحدوں کے اندر لاکھوں متضاد صدائیں بلند ہو رہی تھیں —— یعنی ہار مان لو اور ہمیں پامال ہونے دو —— اٹھو اور مقابلہ کرو —— مدافعت کرو —— مدافعت مت کرو، بے چارہ کرپس!
لیکن ان تمام صداؤں پر پٹیل کی آواز غالب رہی۔ کانگریس کے آخری زبردست جلسہ میں اس نے ایک دھواں دھار تقریر کی۔
"اس نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ اپنا اقتدار کسی پر بھی منتقل کر دے مسلم لیگ کو، ہندو مہاسبھا کو یا مجرموں اور ڈاکوؤں کو۔
برطانیہ کے مقابلہ میں ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ ڈاکو ہم پر حکومت کریں"
اس تقریر میں گورنگ کا حقیقی رنگ تھا اور سامعین کے حقیقی نازی جوش وخروش سے صدائے تحسین بلند کی۔ وہ نیک نیت برطانوی جذبات پرست جو دنیا کی نگاہوں میں ہمیشہ اپنے ملک کی شہرت کو داغدار کرتے ہیں

کرتے ہیں شاید وہ بھی اس طرح ڈاکوؤں سے کم تر قرار دیئے جانے پر کچھ ندامت
محسوس کریں گے۔ ڈاکو تو اٹھائی گیرا اور خونی ہوتا ہے چھوٹے بچوں کے گلے
گھونٹتا ہے اور اندھیرے میں عورتوں کو اڑا لیجاتا ہے۔ ہمیں توقع تھی کہ اسٹافورڈ
کرپس اس سے بہتر قماش کا آدمی ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان
کے حمایتی سورما مسٹر سورنسن ـــــــ رکن پارلیمنٹ۔ اور مس ایتھل مینن
ـــــــ کی رائے اس کے برخلاف ہے۔

کتنے افسوس کی بات ہے۔

شاید انھوں نے پٹیل کی زبان درازی سنی ہی نہیں۔ شاید انھیں اطلاع
نہیں ملی کہ وہ ہم پر ڈاکوؤں کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ کچھ بعید بھی نہیں پٹیل کی نسبت
اکثر خبریں خصوصاً مغرب کے حریت پسند (لبرل) اخباروں میں شایع نہیں
ہوتیں۔ کانگریس کے ماہران تشہیر جو گوئبلز کو بھی کئی چالیں سکھا سکتے ہیں، اس کا
خاص لحاظ رکھتے ہیں کیونکہ اگر گاندھی جی کو اس کے "سب سے بڑے جنرل"
جیسے مہیب صورت شخص کا مونس و دم ساز دکھایا جائے تو اس سے ناگوار
تاثر پیدا ہوگا۔ اسی لیئے تصویروں میں گاندھی جی کو بکروں، چھوٹے بچوں اور
کنول کے پھولوں کے قریب دکھایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں نسبتاً بے زبان
ہیں اور ان سے راز کھلنے نہیں پاتا۔

۴

ہندوستان میں فاشسطیت کی جملہ علامتیں اور نشانیاں دیکھنی
ہوں تو صرف آنکھوں کو کھلا رکھنا کافی ہے۔ کانگریس کی چالوں اور راس
کے سابقہ کارناموں کا مطالعہ نہ کرنے کے باوجود ہندوستان اور فاشسطی

ممالک میں مشابہت صاف نظر آجائے گی۔

مثلاً ایک وردی ہی کا مسئلہ لیجئے۔ نازی قمیص اور سواستکا کی جگہ یہاں کھدر کی دھوتی اور گاندھی ٹوپی نے لے لی ہے۔ سرکاری تقریبوں میں بھی ایک ٹھیٹ کانگریسی اس کے سوا کوئی اور لباس نہ پہنے گا۔ خواہ اس نے مغرب میں تعلیم پائی ہو، خواہ اس کی اپنی رائے یہ ہو کہ دھوتی ایک بد وضع اور تکلیف دہ لباس ہے جس کے باندھنے کے بعد انسان ایک تماشہ بن جاتا ہے پھر بھی وہ دھوتی ترک نہ کرے گا بلکہ زیادہ صحیح تو یہ ہے کہ دھوتی اسے نہیں چھوڑتی اور انتقامی جذبہ کے ساتھ برسات کے موسم میں اس کے جسم سے چمٹ جاتی ہے۔

شمال مغربی سرحد میں گاندھی جی کا قائم مقام ایک تنومند دیو قامت شخص ہے جس کا نام خان عبدالغفار خاں ہے۔ وہ سارے ہندوستان میں سرحدی گاندھی جی مشہور ہے۔ جب اس نے اپنی قسمت کانگریس سے وابستہ کرنے کی ٹھان لی تو سب سے پہلا کام جو اس نے کیا یہ تھا کہ اپنے پیرووں کو سرخ قمیصیں پہنا دیں۔ سرحدی گاندھی جی کے سرخ قمیص والے نیک مزاجی اور عدم مزاحمت کے داعی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جب چند برطانوی پولیس والوں کے روبرو جن کے ہاتھوں میں صرف لاٹھیاں ہوتی ہیں۔ یہ چھ چھ فٹ اونچے جوشیلے لوگ زمین پر جم کر بیٹھ جاتے ہیں تو اس وقت "نیک مزاجی" صرف ایک علمی اصطلاح بن کر رہ جاتی ہے۔

کانگریسی جھنڈے کو جس میں سبز، زرد، اور سفید رنگ ہوتا ہے ہندو اسی طرح سلامی دیتے ہیں جس طرح جرمنی میں سواستکا کو سلامی دی جاتی تھی سیدھی بات تو یہ ہے کہ یہ صرف ایک جماعت ہی کا جھنڈا ہے۔ کئی مرتبہ مسلمانوں نے اس کو اسی غیض و غضب کے ساتھ چاک کیا ہے۔ جس طرح جرمنی میں اشتراکیوں نے

سواستکا کو توڑ پھینکا تھا۔ لیکن پھر بھی کئی گمراہ اہل مغرب اسے سارے ہندوستان کا علم سمجھتے ہیں۔

جرمنوں کے "ہیل ہٹلر" کا مترادف لفظ ہندوستان میں "گاندھی جی" ہے۔ کسی نام کے آخر میں لفظ "جی" اصولاً محض محبت کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن امر واقعہ ہے کہ یہ لفظ اب عقیدت و ارادت کی کسوٹی بن گیا ہے۔ اگر جرمنی میں کوئی "ہیل ہٹلر" نہ کہے تو گویا وہ آفت مول لیتا ہے اور اگر کوئی ہندوستان میں "گاندھی جی" نہ کہے تو وہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا ہندوستانی طالب علموں کے ایک مجمع کو مخاطب کر رہا تھا میں نے تقریر میں گاندھی جی کو گاندھی کہا۔ اس پر مجمع میں سے بعض لوگوں نے غصہ سے پکار کر کہا "گاندھی جی، گاندھی جی" اس طرح اتفاقی طور پر میں جو بات معلوم کرنا چاہتا تھا وہ معلوم ہو گئی۔

میں نے کہا "میرے لیڈر مسٹر ونسٹن چرچل ہیں اور میں انھیں اتنا بڑا آدمی سمجھتا ہوں کہ انھیں صرف "چرچل" پکارا جا سکتا ہے۔ میں گاندھی جی کی بھی اسی انداز میں ستائش کر رہا ہوں!"

لیکن اس طرز ستائش کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی اور ہٹلر میں بہت ساری باتیں ملتی جلتی ہیں۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں زی زین کے جرمن ریڈیو نے ہندوستان کے نام ایک خصوصی نشر میں دعویٰ کیا تھا کہ "جرمن قوم مہاتما گاندھی جی کی اتنی ہی عزت کرتی ہے جتنی اسے ڈولف ہٹلر کی۔ ہر ہٹلر کے بھی وہی اصول ہیں جو مہاتما گاندھی جی کے ہیں۔ (۱)"

[(۱) حوالہ از "فریڈم آر فیشزم" (آزادی یا فاشسطیت) ریڈیکل ڈیموکرائیک پارٹی آف انڈیا۔ نئی دہلی۔ ۱۹۴۲ء]

لیکن ہمیں اس بیان کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔ ہٹلر سے کچھ بعید نہیں اگر وہ اپنے مطلب کی خاطر یہ کہے کہ اس کے وہی اصول ہیں جو کہ مارکس یا ٹالسٹائی کے اصول ہیں۔ کسی حال میں بھی ہمیں ہٹلر کی گواہی نہیں چاہیئے۔ دونوں ڈکٹیٹروں (ہٹلر اور گاندھی) میں مشابہ امور اس قدر عیاں ہیں کہ ان پر زور دینا فضول ہے۔

ساری دنیا ہٹلر کو اس حیثیت سے اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ بڑے بڑے مجمعوں کی پرستارانہ عقیدت مندی سے بچنے کے لیۓ برس تش گاڈن میں پناہ لیتا ہے۔ اس نے کھلے الفاظ میں مجمعوں سے سخت نفرت کا اظہار کیا ہے، وہ تنہائی کا لطف اٹھاتا ہے جہاں وہ اپنی مشہور و معروف ——— جبلت کی کم زور آواز سنتا ہے اور ان سے ان احکام کی شکل میں نافذ کر دیتا ہے، جن کی بلاچون وچرا تعمیل کی جانی چاہیئے۔

ہٹلر کی تصویر تو آپ نے دیکھ لی۔ اب یہ تصویر بھی دیکھیئے۔ گاندھی جی کا ایک پُرجوش حمایتی رومین رولان لکھتا ہے:۔

"مہاتما ان کثیر تعداد افراد سے بیزار ہیں جو ان سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اپنے دل میں وہ کثرت تعداد پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ صرف تنہائی میں خوش رہتے ہیں جہاں وہ اس "نحیف خاموش آواز" کو سنا کرتے ہیں جو احکام نافذ کرتی ہے۔"

تعداد پر بھروسہ نہ رکھنا، گوشۂ تنہائی میں پناہ لینا، مقدس آواز اور اس کی تعمیل کی ضرورت ——— آخر یہ رجحانات کس منزل کی طرف لیجاتے ہیں

عمومیت یا آمریت؟ یقیناً اس سوال کا جواب اتنا واضح ہے کہ اُسے بیان کرنیکی مطلق ضرورت نہیں۔

"خدانے مجھے اپنا آلۂ کار منتخب کیا ہے"۔ گاندھی جی نے متعدد موقعوں پر یہ بات کہی۔ (۱) ہٹلر اور مسولینی کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن کہیں نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے کہ روزولٹ یا چرچل نے اسی طرح کا دعویٰ کیا ہو۔ اور ہم میں سے بعض تو ان کی اس خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم لوگ پسند نہیں کرتے کہ ہوشیار سیاست داں خدا کی بارگاہ میں بھی ایک گوشہ سنبھال بیٹھیں اگرچہ خود گاندھی جی اس سے انکار نہیں کریں گے کہ وہ بہت ہی ہوشیار سیاست داں ہیں تاہم یقیناً وہ اس کی اپنے مخصوص انداز میں توجیہ کریں گے۔

لیکن سب سے بڑا ثبوت تو گاندھی جی کا یہ اصرار ہے کہ ان سے کبھی غلطی نہیں ہوسکتی۔ تمام آمرین اسی طرح اپنے آپ کو اول و آخر حق بجانب قرار دیتے ہیں۔

لوئی چہاردہم نے کہا تھا۔

ہٹلر نے کہا تھا۔

"میں ہی جرمن قوم ہوں"۔

مسولینی نے کہا تھا۔

"دوچے ہمیشہ حق پر رہتا ہے"۔

اور گاندھی نے کہا تھا۔

"میں ہند و دل و دماغ ہوں۔

بتلائیے کہ ان بیانات میں حقیقی فرق کیا ہے؟ تنہا میں ہی اس سوال کا جواب معلوم کرنا نہیں چاہتا۔ خود مسلمان بھی یہی جاننا چاہتے ہیں۔

اگر کسی کو باور نہ ہو کہ اس ہندو سیاسی دیوتا کی فوق الفطرت بزرگی میں مسلمان اپنے لئے دائمی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو اسے چاہیئے کہ مسلم لیگ کی مطبوعات کا مطالعہ کرے مثال کے طور پر کتاب نیشنلزم ان کنفلکٹ ان انڈیا پیش کی جاسکتی ہے جو تخلیقی تجزیہ کا شاندار نمونہ ہے۔ موجودہ صورت حال پر مصنف کا تبصرہ یہ ہے:۔

"کانگریسی اور نازی انجمنوں میں گہری مشابہت ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کو وہی عزت اور عوام کی عقیدت حاصل ہے جو ہندوستان میں مسٹر گاندھی کو۔ ہٹلر ہیرو سے بھی کچھ زیادہ ہے وہ قوم کا نجات دہندہ بلکہ جرمنوں کے حق میں خدا ہے۔ مسٹر گاندھی جی کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ہندوؤں کے روحانی پیشوا بھی ہیں اور سیاسی رہنما بھی اور حکم الٰہی کے بموجب کام کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کسی کی کیا مجال کہ ان پر تنقید کرے اور اس کے بعد کانگریس میں رہ سکے۔ متعدد ممتاز کانگریسی لیڈروں کو کانگریس سے علیحدہ ہونا پڑا محض اس لئے کہ انھوں نے مہاتما جی کو ناخوش کیا تھا، مسٹر نریمان، ڈاکٹر کھرے، مسٹر سوباش چندر بوس، مسٹر رائے اور مسٹر راجگوپال چاری، یہ سب کبھی کانگریس میں با اثر حیثیت کے حامل تھے لیکن کانگریس میں صرف ایک شخص یعنی مسٹر گاندھی جی سے اختلاف رائے پیدا ہو جانے کے بعد انھیں ہمیشہ کے لئے خارج کر دیا گیا۔"

۴

دن ڈھلنے کے بعد اور شاید بہت دیر سے گئے، ہندوستان کے بعض

بہترین دماغ جاگ چکے ہیں اور انھوں نے کانگریسی حکومت کی حقیقی نوعیت اور اس کے پس پردہ فاشیسٹی خطرہ کو بھانپ لیا ہے۔

جس طرح نازی تحریک کے ابتدائی زمانہ میں بہت سے شریف الخیال جرمن ایمانداری کے ساتھ اس یقین کے تحت کہ نازی تحریک قوم کے احیاء میں ممدومعاون ثابت ہوگی اس میں شامل ہو گئے تھے اسی طرح کانگریسی تحریک کو بھی بہت سے شریف الخیال ہندوستانیوں کی تائید حاصل ہو گئی جنھیں اس تحریک میں نہ صرف آزادی کی حقیقی جھلک نظر آئی بلکہ آزادی سے زیادہ اتحاد اور سماجی ترقی کی صورت دکھائی دے رہی تھی۔

جب جرمن آزاد خیالوں کی آنکھوں سے حجابات دور ہو گئے تو انھیں ٹھکرا کر نازی جماعت سے نکال دیا گیا اور اگر وہ ملک سے فرار نہ ہوئے تو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا جب ہندوستانی حریت پسندوں کی آنکھیں کھل گئیں تو انھیں بھی جماعت سے لات مار کر نکال دیا گیا لیکن اس حقیقت کی بناء پر کہ ہندوستان میں ہنوز برطانوی قانون کا راج ہے۔ انھیں گولی کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ چنانچہ اب بھی ان کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔

اب ہم ان ہندوستانی آوازوں پر کان دھریں گے جو پکار پکار کر اپنے ہم وطنوں کو اس فاشیسٹی شاہراہ سے ڈراتی ہیں جن پر وہ تیزی سے دوڑنا چاہتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ پرزور ایم۔ این رائے کی ہے ان کی تمام فرسودہ سیاسی پھبتیاں اڑائی جا چکی ہیں مثلاً "طفل سرکش" "بحری پطرل" وغیرہ۔ ابتدائی ایام میں انھیں روس سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے اشتراکی تحریک میں بڑا جوش وخروش دکھایا اور معلوم ہوتا ہے کہ انھیں

یقین تھا کہ یہی تجربہ چند ترمیموں کے ساتھ ہندوستان میں بھی دہرایا جا سکتا ہے
یہ تو بالکل واضح نہیں کہ انھوں نے روس کو چھوڑا کیوں۔ ہاں یہ بات بالکل
عیاں ہے کہ بعض امور کی حد تک وہ جس فریب میں مبتلا تھے ان سے دور
ہو گئے۔

بہرحال سنہ ۱۹۳۱ء میں وہ کچھ کچھ راز بنے ہوئے آب و تاب کے ساتھ
دوبارہ ہندوستان میں جلوہ گر ہوئے اور فوراً ہی اپنے خیالات کی بدولت
ہر شخص پر چھانے لگے۔ خواہ وہ حکومتی عہدہ دار ہو یا چوٹی کا برہمن۔
لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر جانے کا کمال رائے میں کس طرح
پیدا ہوا؟ اس کی دو توجیہیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ پکے حق گو ہیں۔
اور حق گو ہندوستانی سیاست داں ہیروں سے بھی زیادہ نایاب ہیں۔ دوسرے
یہ کہ وہ اشتراکی ہیں اور اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مذہبی
جنون اور وہم پرستی اور سیاسی جھگڑوں کے پیچھے ایک بھیانک معاشی
تنظیم ہے جسے گھن لگ چکا ہے اور جو گر کر ڈھیر ہونے ہی کو ہے۔ وہ چاہتے
ہیں کہ اس معاشی تنظیم کو مسمار کر دیں حالانکہ کانگریس اسی کو روسے لگا لگا
کر قائم رکھنا چاہتی ہے۔

رائے کو ہندوستان کا کارل مارکس کہا گیا ہے اگرچہ کہ ان کے
نام کے ساتھ اس طرح کے دم چھلے لگانا یا نہ لگانا برابر ہے کیونکہ وہ بجلی کی
سی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ کوئی دم چھلا لگانا اتنا ہی
مشکل ہے جتنا کہ بجلی کے ساتھ۔ ایک چھوٹی لیکن با اثر سیاسی گروہ کے
ذریعہ جسے ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کہا جاتا ہے، رائے کی شخصیت کا
اظہار ہوتا ہے اس جماعت کا باضابطہ ترجمان "انڈپنڈنٹ انڈیا" ہے۔

جونئی دہلی سے شائع ہوتا ہے اس پرچہ میں مضامین شائع کرنے کے علاوہ رائے نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں وہ پرجوش اور شدید اصرار کے ساتھ گاندھی مت کانگریس، اور فاشسٹیت کی باہمی پوشیدہ یگانگت پر مسلسل ضربیں لگاتے ہیں۔ اگرچہ کہ اس یگانگت کی شدت سے تردید کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اس کے وجود میں کوئی کلام نہیں کیونکہ دونوں تحریکوں یعنی فاشسٹیت اور کانگریس کی ہیئت ترکیبی ایک ہی نہج کی ہے۔

رائے نے شخصیتوں کو بھی نہ چھوڑا۔ جواہر لعل نہرو کی نسبت جو ہندوستان میں دوسرے درجہ کے سیاست دان ہیں اور یقیناً گاندھی جی کے جانشین ہوں گے، رائے نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"اگرچہ نظری اعتبار سے نہرو فاشسٹیت، کے مخالف ہیں تاہم وہ ہندوستانی فاشسٹیت کے قائد کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں اور طبیعت کے اعتبار سے اس کام کے لئے ان سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ دو درجہ اول کے قوم پرست اشتراکی ہیں کیونکہ وہ نہ تو قوم پرست ہیں اور نہ اشتراکی ——— وہ بلند آہنگی کے ساتھ جس بین الاقوامیت کا ادعا کرتے ہیں وہ ان کی قومیت کی نفی کر دیتی ہے اور ان کے قومی جوش و خروش کی وجہ سے ان کی اشتراکیت کی تکذیب ہوتی ہے۔ اگر گاندھی جی کانگریس کے روحانی رہنما ہیں تو نہرو اس کے عملی رہنما ہیں اور اس حیثیت سے وہ ہندوستانی فاشسٹیت کے بھی قائد ہیں"

اس طرح کی رائے شاید ان ہزارہا لوگوں کے لئے صدمہ کا باعث ہوگی جنھوں نے نہرو کی مقبول عام خود نوشت سوانح عمری پڑھی ہو جس میں ایک ایسے شخص کی تصویر دکھائی گئی ہے جو بہت حساس اور شائستہ ہے اور

جیسے برطانوی سامراجیت کی بہیمیت سے قدم قدم پر الجھنا پڑا ہو۔

ان ممتاز کانگریسیوں میں سے جنھیں ۱۹۴۲ء میں جیل نہیں بھیجا گیا ایک سی۔ آر راج گوپال چاری ہیں۔ انھوں نے سال مذکور کا زیادہ تر حصہ جناح اور گاندھی جی کے درمیان ایک طرح کی مصالحت کرانے کی ناکام کوشش، میں گزار دیا۔ میں نے مدراس میں سی آر سے طویل گفتگو کی ہے۔ مجھ پر انھوں نے یہ تاثر پیدا کیا کہ وہ نہایت دقیقہ رس ذہانت کے مالک ہیں۔ انھیں میں ضرور ایک ایسے مقدمہ میں وکیل مقرر کروں گا جس میں ـــــ کیا کہنا چاہیئے ـــــ واقعات کی پیچھے دار تعبیر کی ضرورت ہو۔ بلاشبہ وہ چوٹی کے برہمن، ترک مسکرات کے پرجوش حامی اور گاندھی جی کی پراسرار گفتگو کی بہترین تعبیر کرنے والے ہیں انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان کی گفتگو کا کوئی حوالہ نہ دوں اور میں انکی اس خواہش کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن ان کی مجمع عام کی تقریروں کا حوالہ دینے میں کوئی امر مانع نہیں۔ حال ہی میں جامعہ لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کھلے کھلے تعظیمی الفاظ میں فریڈرک، فان مولٹ کے اور ہنڈن برگ کے جرمنی کو سراہا ہے اور ستائشی الفاظ میں ہندوستانی نوجوانوں کے آگے جرمن فوج کو " سائنٹفک تنظیم کا حیرت انگیز نتیجہ" قرار دیا۔ انھوں نے بیان کیا کہ اگر گزشتہ جنگ کے بعد جرمنی کے لئے دوبارہ جی اٹھنا ممکن ہوا (جرمنی کے نازی دور کی طرف اشارہ کرنے کا عجیب انداز) تو ہندوستانی قومیت کو بھی اس کے نقوش قدم پر چلنے سے مایوس نہ رہنا چاہیئے۔

جیسا کہ رائے نے کہا ہے:۔ نہ تو گوئٹے ـــــ لسنگ ـــــ بی تھوفن ـــــ یا ۱۸۴۸ء کے باغیوں کا جرمنی اور نہ ہیگل ـــــ ھلم ہولٹز ـــــ کوش ـــــ فرشو ـــــ یا پلانک ـــــ

کا جرمنی، بلکہ قیصر و ہٹلر کا جرمنی ہمیشہ سے ہندوستانی قوم پرستوں کا محبوب رہا ہے۔ اس عجیب و غریب ہمدردی کے برخلاف ہندوستانی قومیت نے کبھی بھی فرانس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا جو عظیم انقلابی روایات کی سرزمین ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔ ایک ہمہ گیر کامل اختیارات والی مملکت کے تخیل کو جو پروشیا (جرمنی خاص) والوں میں فروغ پایا۔ ہیگل کی تعلیمات نے پوری وضاحت کے ساتھ حق بجانب قرار دیا ہے۔ اس میں ظلم کی منطق پر قربانی کی اخلاقی خوبیوں کا ملمع چڑھا یا گیا۔ یہاں سلطنت ہی خدا بن گئی اور لازم ہو گیا کہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ سلطنت کی خاطر کام کریں۔ تکلیف اٹھائیں اور جان تک دے دیں۔ ہمارے ملکی نوجوان کے آگے مسٹر راجگوپال چاری نے بعینہٖ یہی نصب العین پیش کیا ہے۔ ان کی رائے میں موجودہ جرمن قوم کا عروج دراصل اسی نصب العین کی تکمیل کا آئینہ دار ہے۔ پھر ہمیں مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

ضرورت ہے تو صرف اسی بات کی کہ ہم مملکت کے بارے میں ہیگل کے مابعد الطبیعیاتی، تصورات کا علم حاصل کریں تاکہ ہم وہ "روحانی طاقت" معلوم کر لیں جس نے ہندوستانی قوم پرستوں کے ایک مستند قائد کے بیان کے بموجب جرمنی کو نجات دلائی اور اسی طرح ہندوستان کو بھی نجات دلا سکے گی وہ پراسرار طاقت کوئی اخلاقی قوت نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ اور منظم شکل میں محض بہیمانہ قوت ہے۔ گاندھی جی کے عقیدۂ عدم تشدد کے سیاسی مضمرات بھی یہی ہیں۔ بہرحال، ہمیں مسٹر راج گوپال چاری کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے ا[illegible] عقیدہ کے دوسرے جز یعنی صداقت پر عمل کیا۔"

۵

ایک ایسے شخص کے لئے بھی جو اعلیٰ مہارت کے ساتھ واقعات کا مشاہدہ کر رہا ہو یہ پہچان لینا مشکل ہے کہ گاندھی جی کس وقت خلوص سے کام لیتے ہیں اور کس وقت نہیں۔ ان کا ذہن تضاد اور الجھنوں کی بھول بھلیاں ہے جس میں راہرو بہت جلد بے بسی کے ساتھ گم ہو جاتا ہے ممکن ہے وہ عمداً ایسا کرتے ہوں۔ اگر اپنی قیادت کی طویل مدت میں کوئی شخص خاصی تعداد میں شدت کے ساتھ متضاد بیانات جاری کرے تو وہ ہمیشہ مثلوں کی ورق گردانی کے بعد کہہ سکے گا کہ "میں نے فلاں نوبت پر یوں کہا تھا" اور گاندھی جی یہی کرتے ہیں جب کبھی انھیں بری طرح پھانس لیا جاتا ہے۔ وہ اپنے کسی سابقہ بیان کا حوالہ[1] دیدیتے ہیں۔

بہر حال انھیں شبہ کا فائدہ ملنا چاہیئے اور ہمیں فرض کر لینا چاہیئے کہ بعض ایسے بھی مواقع آتے ہیں جب ان کے دل میں بھی وہی ہوتا ہے جو ان کی زبان پر ہوتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے وہ براہ راست، یا بالواسطہ فاشسطیت کا رخ کرتا ہے۔

ان کی معاشی پالیسی ہی کو لیجئے بشرطیکہ اس شاندار اصطلاح کا اس پر

---

[1] ان کی اور زیادہ حیرتناک سیاسی قلابازیوں کا مطالعہ کرنا ہو تو مسلم لیگ کی شائع کردہ کتاب (نیشنل ازم ان کنفلکٹ) کا باب سوسوسہ "گاندھی جی کا قول وفعل" پڑھیئے۔

اطلاق ہو سکے۔ اس کی ابتدا، انتہا بلکہ سارا وجود چرخہ پر قائم ہے جسے انھوں نے اپنے ذہن میں "عدم تشدد" کے تصور کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ مسلک ہے کہ اگر کسان آپ ہی اپنا کپڑا اپنے ہی گھر میں تیار کر لیں اور اسی طرح سوت کاتتے رہیں اور ساہوکار ہندو زمینداروں کے ناقابل برداشت مطالبوں کو عدم تشدد کے ساتھ برداشت کرتے جائیں تو سارے حالات سدھر جائیں گے اِس طرح ہندوستان کی تمام معاشی برائیاں دور ہوں گی اور سوراج خود بخود حاصل ہو جائے گا۔

اگر ہندوستان کے سوا کسی اور ملک میں کوئی شخص اِس طرح کے دل خوش کن خیالات کی تلقین کرے تو وہاں اسے نہ تو سیاسی مدبر اور نہ ماہر معاشیات بلکہ ادنیٰ درجہ کا مزاحیہ اداکار سمجھا جائے گا۔ چرخہ کا مسئلہ اتنا ہی عملی مسئلہ ہے جتنا کہ یہ خیال کہ اگر امریکن عورتیں اپنے خاوندوں کے پاتابے آپ بن لیں تو امریکہ سے بے روزگاری دفع ہو جائے گی۔ بے شک چرخہ کو ایک ذیلی اہمیت حاصل ہے یعنی وہ لنکا شائر کی پارچہ بافی کی صنعت کے خلاف ایک حربہ ہے لیکن کسی بھاری کاروبار کے لئے چرخہ زبردست خطرہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ گاندھی جی کے حامیوں میں ایسے ہندو بھی شامل ہیں جو بڑی بڑی ملوں کے مالک ہیں، فولاد کی صنعت میں لاکھوں کروڑوں کے وارے نیارے کرتے ہیں اور جن کی نفع اندوزی اپنا خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں کے دم سے ہے۔ فطری طور پر یہ لوگ گاندھی جی کے پروپاگنڈہ سے خوش ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ کسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ نفرت انگیز برطانوی راج کے سوا اس کے گرد و پیش جو حالات ہیں وہ بہترین حالات ہیں اور اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ زائد معاوضہ کے لئے ہڑتال کرے

یا اپنے استحصال کے سچے واقعات معلوم کرے۔ ہند و سرمایہ داری کے بھونڈے اور ڈھیٹھ نمائندے سوائے اس کے اور کس چیز کی آرزو کر سکتے ہیں کہ انھیں کثیر تعداد میں ایسے غلام قسم کے مزدور مل جائیں جو جہالت اور توہم کا شکار ہوں جنھوں نے عدم تشدد کی قسم کھائی ہو اور جن کی ساری شکایتوں کی ذمہ داری آسانی سے برطانوی ہوسے کے سر تھوپی جا سکے۔ فاجستی آقا کے حق میں تو یہ صورتِ حال جنت سے اس قدر قریب ہے کہ اس سے زیادہ قربت شاید ہی اسے نصیب ہو سکے۔ لیکن ہندوستانی قوم کے حق میں گاندھیت ایک عام خودکشی ہے۔ رائے نے لکھا ہے :۔

"گاندھیت کو پست حال ہندوستانی عوام کی جہالت، اندھی عقیدت، اور مشاہیر پرستی نے جنم دیا ہے۔ گاندھیت ہمارے عوام کی بدترین حالت کی یعنی ان کی جہالت، ان کی بزدلی، ان کی شکست خوردہ ذہنیت اور ان کی پستی کی آئینہ دار ہے[۱]۔"

گاندھی جی کے نظام العمل کے دوسرے بڑے جز یعنی نام نہاد "عدم تشدد" کا بھی یہی حال ہے یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو عملی صورت میں ہر وقت بالالتزام تشدد پر ختم ہوتا ہے اور تشدد بھی ایسا جس کی نظیر نہ مل سکے۔ لوگ تو یوں بیان کرتے ہیں گویا گاندھی جی ہی نے امن عالم کا یہ نسخہ ایجاد کیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں ہم انھیں بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں۔ عدم تشدد ہندو بتوں کی طرح قدیم ہے۔ یہ اس عقیدۂ قضا و قدر کا قنوطیت اور رہنفی پسندی کا

---

[۱] گاندھزم، نیشنلزم، سوشلزم۔ از ام، این، رائے۔ مطبوعہ بنگال ریڈیکل کلب۔

جزو لاینفک ہے جو ہندو مت پر مسلط ہے۔ موجودہ ہندوستان میں اس کی بہترین مثال دیکھنی ہو تو ہندو قرض دہندہ کو قرض وصول کرتے ہوئے دیکھ لینا چاہیئے۔ یہ شخص قانون کی مدد کی بجائے یا مقابلہ کرکے مقروض کو چپت لگانے کے بجائے وہ اس کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور اس آس پہ رونا شروع کر دیتا ہے کہ مقروض کو شرم آئے گی اور وہ قرضہ کا تصفیہ کر دے گا۔

ممکن ہے گاندھی جی عدم تشدد پر مخلصانہ ایقان رکھتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھیں مخلصانہ ایقان نہو۔ دونوں صورتیں بھی کچھ اہم نہیں۔ کیونکہ ایسے شخص میں جس کا دماغ منتشر خیالات سے بھرا پڑا ہو، خلوص کا وجود و عدم دونوں برابر ہیں۔ عدم تشدد کی انھوں نے جو جدید ترین تعریف کی ہے۔ (بشرطیکہ ایسے مبہم اور پراگندہ خیال کی کوئی تعریف بھی ہو سکے) وہ یہ ہے:۔

"اگر کوئی شخص تن تنہا تلوار لیکر ڈاکوؤں کے ایک بالکل مسلح گروہ سے لڑ رہا ہو، تو میں کہوں گا کہ وہ بلا تشدد لڑ رہا ہے۔ فرض کرو کہ ایک بلی سے لڑتے ہوئے کوئی چوہا اپنے تیز دانتوں کو مزاحمت کے لئے استعمال کرے تو کیا آپ اسے تشدد قرار دیں گے؟ اس طرح پولستانیوں نے تقریباً عدم تشدد سے کام لیا جب کہ وہ جرمنوں کے مقابلہ میں جو تعداد اور طاقت کے اعتبار سے بڑھے چڑھے تھے بہادری کے ساتھ ڈٹ گئے۔"

اگر کوئی شخص ٹھیک ٹھیک بتلا سکے کہ مذکورہ بالا تعریف کا مطلب کیا ہے یا بہتر یہ کہ اگر وہ ٹھیک ٹھیک بتلا دے کہ اس تعریف میں کیا کچھ داخل نہیں تو اسے ایک حد تک ذہین ترین آدمی سمجھا جا سکتا ہے۔ بظاہر تو گاندھی جی اس تعریف سے یہی مطلب نکالنا چاہتے ہیں کہ ۰۵ ناتسیوں کو ڈھیر کرنے کے باوجود پولستانیوں کی مشین گن عدم تشدد پر کاربند ہے محض اس لئے کہ

پولستانیوں کے پاس مشین گنوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ بالفاظ دیگر اگر بالاتر قوت کے مقابلہ میں تشدد برتا جائے تو وہ تشدد بھی خود بخود عدم تشدد بن جاتا ہے[1]

ایک نقاد نے کہا "یہ تو نہایت مفید مطلب نظریہ ہے خصوصاً ان باغیوں کے لئے جو بلا ہتیار شورش مچاتے ہوں۔"

بے شک یہ نظریہ مفید مطلب ہے۔ عدم تشدد پر عمل کرنے والے ان قوم پرستوں کے لئے جنھوں نے کو تو الی پر اکثر عدم تشدد کے ساتھ پٹرول چھڑکا اور عدم تشدد کے ساتھ اس پٹرول کو آگ لگائی یا عدم تشدد پر عمل کرنے والے ان مجموں کے لئے جو ان صورتوں میں جب کہ وہ ایک کے مقابلہ میں ایک ہزار تھے نوجوان برطانوی اور کناڈائی فوجیوں کو عدم تشدد کی لاٹھیوں سے مار ڈالا، یہ عدم تشدد کا نظریہ دائمی تسکین کا باعث ہے۔

ان لوگوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر جن کی موت گاندھی جی کی عدم تشدد ہی کی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ گاندھی جی مسکراتے ہوئے اپنے پوپلے منہ سے اب بھی کہہ سکتے ہیں "ہاں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو کچھ ہوا وہ تقریباً عدم تشدد ہی تھا۔"

بہر حال قید ہونے سے کچھ عرصہ قبل خود گاندھی جی اپنا نقاب سرکانے لگے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ برطانیہ ختم ہو چکا اور جاپان نے جنگ جیت لی۔ انھیں یہ فکر تھی کہ ان پست قد زرد فام افراد سے جو ان کے خیال کے مطابق بہت جلد

---

[1] "فسادات کی کانگریس ذمہ دار ہے" (مطبوعہ مطبع حکومت ہند) بابتہ ۴۳-۱۹۴۲ء۔

ان کے آقا بننے والے تھے کس طرح اچھے راہ و رسم پیدا کئے جائیں یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنے اس ایقان کا اعتراف نہیں کیا کیونکہ کچھ ہتنے وقت ہمیشہ ان کی نگاہ امریکہ پر رہتی ہے اگر امریکہ جاپان کے ساتھ ان کا علانیہ خلا ملا دیکھ لے تو اس سے ان کے وقار کو بڑا دھکہ لگے گا۔ اس کے باوجود بھی وہ جس حد تک پہنچ سکتے تھے وہاں تک پہنچنے میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی۔ انھوں نے پہلے ہی سے ایک سادہ اخلاقی چک جاپان کے حوالہ کر دیا جسے وہ ہندوستان پر اپنے حملہ کو حق بجانب قرار دینے کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ گاندھی جی نے کنایتہً یہ بھی کہا کہ جاپانی تو صرف امن چاہتے ہیں لیکن چونکہ ہندوستان کی مدافعت برطانوی کر رہے ہیں اس لئے وہ کچھ پس و پیش کے بعد مجبور ہو گئے ہیں کہ اقدامی کارروائی کریں۔

انھوں نے کہا " ہندوستان میں برطانویوں کی موجودگی گویا جاپانیوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت ہے۔ اگر برطانوی چلے جائیں تو یہ ترغیب بھی جاتی رہے گی "

دوسرے الفاظ میں ساری برمی سرحد کے ساتھ ساتھ اگر میگنیو لائن بنائی جاتی اور اس پر ایک سو بالکل مسلح ڈویژن متعین کئے جاتے اور ساتھ ہی ہوائی طاقت کا معقول انتظام بھی ہوتا تو غالباً گاندھی جی اس مدافعتی لائن کو " ترغیب " کہہ کر بھک سے اڑا دیتے۔ اور اس " ترغیب " کے رفع ہو جانے کے بعد جب کہ سرسبز و شاداب میدانوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ ہوتا یقیناً جاپانی حملہ کرنے کے بجائے لوریاں گاتے ہوئے اُلٹے پاؤں اپنے وطن چلے جاتے۔

اگر حقیقتاً گاندھی جی کا یہی منشا رتھا تو پھر مشکل ہی سے کوئی صاحب فراست انکار کر سکتا ہے کہ گاندھی جی کا اثر متحدہ اقوام کے مقصد کے لئے ایک خطرہ یا محور کیلئے

بیش قیمت سرمایہ نہ تھا جتنی کہ جواہر لعل نہرو نے جو گاندھی جی کے سب سے بڑے شریک کار رہیں کانگریس کی مجلس عاملہ کے آخری اجلاسوں میں سے ایک میں پس و پیش کے بعد مجبوراً کہہ دیا تھا کہ گاندھی جی انھیں جس مسلک کو اختیار کرنے کا حکم دے رہے تھے وہ اپنے مضمرات کے اعتبار سے ایک محوری منشور تھا۔

انھوں نے کہا " مسودہ کا سارا پس منظر ایسا ہے کہ اس سے لازمی طور پر دنیا یہی سمجھے گی کہ ہم محوری طاقتوں سے رشتہ جوڑ رہے ہیں بمسودہ کا سارا نشا دیہ ہے کہ جاپان کی حمایت کی جائے "

ہندوستان کے دوسرے درجہ کے قائد کے اس انکشافی اعتراف کے بعد ان لوگوں کے اسلوب فکر کو اختیار کرنا مشکل ہے جو اس بات کا ادعا کرتے ہیں کہ گاندھی جی کی رہائی سے فوراً ہی ہندوستان کی " سعی جنگ " میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ ہم پوچھ سکتے ہیں کہ " یہ سعیٔ جنگ کس کے خلاف ہوگی جاپان کے یا متحدین کے ؟ "

جو شخص حقیقی طور پر جنگ کو ناپسند کرتا ہو اور جو عدم تشدد کا سچا پیرو ہو اسے رواداری سے محروم رکھنے کی رائے ظاہر کرنے میں میں سب سے آخری انسان ہوں گا اگرچہ کہ تلخ تجربوں نے مجھے قائل کر دیا ہے کہ امن عالم کا راستہ کسی رومانی علاقہ سے نہیں گزرتا اور اصول کے ساتھ ساتھ کوتوالی کے ذریعہ اس کی حفاظت لازمی ہے نیز اس کی تیاری کے لئے نیک ارادوں کے علاوہ قوانین درکار رہوں گے۔ لیکن گاندھی جی کا " عدم تشدد " تو مجھے ابتدا سے آخر تک بالکل بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود جانتے ہیں عدم تشدد نہ صرف خون ریزی پر ختم ہوتا ہے بلکہ اس کے اصول ہی ایسے ہیں کہ اسے بہیمانہ قوت سے سینکڑوں بار مصالحت کرنا پڑتی ہے۔

کچھ اوپر ہم نے بیان کیا تھا کہ جیل بھیجے جانے سے قبل گاندھی جی نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹانی شروع کر دی تھی۔ اب ہم خود انہی کی تقریروں اور منشوروں ــــــ کے اقتباسات سے اس بیان کی وضاحت کریں گے۔

"ہم کریں گے یا مریں گے"

"یہ کھلی بغاوت ہے"

"اگر فساد واقع ہو تو مجبوری ہے"

"اپنے آپ کو آزاد سمجھو اور آزادی سے عمل کرو"

"ساری دنیا اس تحریک کو محسوس کرے گی یہ برطانوی فوجوں کی نقل و حرکت میں مداخلت نہیں کرے گی لیکن یقیناً یہ برطانوی توجہ کو مبذول کرے گی"

بلا شبہ۔ یہ سب کچھ عدم تشدد پر مبنی ہے! ان سب بیانات کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں جن کی جوشیلی طبیعت انہیں طاقت کے استعمال پر اکسائے اگرچہ گاندھی جی بظاہر طاقت کے استعمال سے نفرت کرتے ہیں، خاص طور پر جب مذکورہ بالا بیانات کو ان کانگریسی منشورات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جن کی ہندوستان میں بوچھار کی گئی تھی تو کانگریس کا مقصد واضح تر ہو جائے گا۔ ان بلیٹنوں میں گاندھی جی کے اشارے کو اس کے منطقی نتائج تک پہنچا دیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر یہ بلیٹین علانیہ جاپان کی تائید میں تھے۔

"جاپان نے مسلسل اور اصرار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ اسے نہ ہندوستان کی فتح کی ہوس ہے اور نہ اس میں کوئی دلچسپی ہے سوائے اس کے کہ برطانوی یہاں سے نکال دیئے جائیں اور ہندوستان فوراً

آزاد ہو۔

اِن منشورات میں قتل کی ترغیب علانیہ طور پر دی گئی ان میں لکھا تھا کہ فوراً "چھاپہ مار دستے تیار کئے جائیں تاکہ وہ ٹامیوں (برطانوی فوجیوں) کو اپنے چھاپوں سے بدحواس کر دیں۔ ان میں یہ بھی ہدایت تھی کہ برطانوی لوگوں کے باورچیوں کو سکھایا جائے کہ وہ اپنے آقاؤں کے لئے خراب کھانا پکائیں۔" یہ دراصل تمام برطانویوں کو زہر دینے کی ترغیب کا شائستہ انداز تھا۔

مذکورہ بالا کانگریسی بلیٹنوں میں چوری، آتش زنی، بلوہ، غرض توڑ پھوڑ کی ہر کارروائی کی کھلم کھلا وکالت کی گئی اور اس کا کچھ خیال نہیں رکھا گیا کہ ان کارروائیوں سے معصوم لوگوں کی بھی جانیں تلف ہوں گی اور خیال رکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کیا ان امور کو من جانب اللہ جائز قرار دینے کے لئے "عدم تشدد" کا بڑا رہنما اپنی ساری خیالی نزاکتوں، لفظی ہیر پھیر اور تاویلات کے ساتھ موجود نہیں۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے وقت ہریجن میں جو ان کا خاص پرچہ ہے ایک "سنجیدہ سوال کے جواب میں پہلوتہی کرنے کا حسب ذیل شاہکار شائع ہوا تھا۔

سوال۔ عدم تشدد کی حدود کے اندر حکومت کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے کن کن چیزوں کی اجازت دی جا سکتی ہے؟"

جواب۔ میں صرف اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر سکتا ہوں۔ وہ عدم تشدد کا بے داغ طریقہ ہوگا۔ خیر یہاں تک تو درست ہے مگر دوسرا جملہ؟ اس قسم کی جدوجہد میں اگر تار کاٹ دیئے جائیں ریل کی پٹریاں

۱۵؎ بمبئی کانگریس بلیٹن ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء۔

اکھاڑی جائیں اور چھوٹے چھوٹے پلوں کو منہدم کیا جائے تو قابل اعتراض نہیں سمجھا جائے گا۔

"چھوٹے چھوٹے پل۔ گاندھی جی یہ تو بہت ہی عجیب و غریب جملہ ہے۔ پل کب چھوٹا ہوتا ہے" اور کب چھوٹا نہیں ہوتا؟ اور یہ مقدس الفاظ جن کے زور سے عدم تشدد کے فدائی راستوں کو برباد کر دیتے ہیں ان افراد کے لئے کیا تشفی بخش ہو سکتے ہیں جو ان کے ہاتھوں سے لائے ہوئے حادثوں کا شکار بنتے ہیں؟

۶

پونا کے قصر میں جہاں یہ نظر بند ہیں گاندھی جی اپنی تعریف میں ساری دنیا کے حقیقی مخالف فاشسٹیوں کی آوازیں سنتے ہیں۔ بیسویں صدی کی یہ سب سے بڑی ستم ظریفی ہے کہ فسطائیت کے مخالفین بھی ایک ایسے شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جو فسطائیت کی تلقین میں دریغ نہیں کرتا۔

تصور کیجئے کہ اس شر و فساد کی حدیں کیا ہوں گی جو اگر چاہیں تو گاندھی جی پیدا کر سکتے ہیں؟ کیا ان کے مسلک میں نمایاں تبدیلیوں کا امکان ہے؟ اگرچہ ان سوالات کا جواب قیاس کی بنا پر ادا کیا جا سکتا ہے تاہم یہ ممکن ہے کہ صورت حال کی رفتار کے پیش نظر نہایت صحیح اور معقول پیشینگوئی کی جا سکے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ متذکرہ صدر نعرہ ہائے تحسین کے باوجود

گاندھی جی کا اثر و رسوخ نہایت سرعت کے ساتھ روبہ انحطاط ہے اور ممکن نہیں ہے کہ موافق حالات رونما ہونے پر بھی ان کا یہ اثر دوبارہ قائم ہو سکے۔ اِس کتاب کی اشاعت تک گاندھی جی کی عمر (۷۵) سال کی ہو جائے گی۔ اب جبکہ وہ جیل سے باہر آئے ہیں تو دنیا کو انھوں نے جس حال میں چھوڑا تھا اس سے ایک بالکل ہی مختلف ماحول ان کے سامنے ہوگا۔ برطانیہ اب کشمکش کی اس نازک حالت میں نہیں ہے جس سے نکلنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ زرد چہرے اور زرد فام جاپانی مسکراتے ہوئے اور دلفریب وعدوں کے ساتھ ہندوستان کے دروازہ پر موجود نہیں ہیں کہ ان کا استقبال کیا جا سکے۔

سب سے زیادہ اہم یہ کہ ان کی تصوف آمیز اندھی عقیدت مندی اور تلخ مگر ہیجان خیز حقائق کے درمیان بہت ہی زبردست حد فاصل قائم ہو گئی ہے جو ہمیشہ سے زیادہ نمایاں ہے یہ صورت حال کانگریس کے ذہین اور سمجھدار ارکان کے لئے ہمیشہ باعث تردد ثابت ہوئی ہے۔ پنڈت نہرو نے کھلے بندوں اپنی خود نوشت سوانحعمری میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ فی الحقیقت کتاب کا سب سے زیادہ سنسنی خیز حصہ وہی ہے جس میں انھوں نے اپنی اس دماغی کاوش کا مفصل حال قلمبند کیا ہے جو ان کو گاندھی جی کے ساتھ وفاداری کے دعووں اور عصر جدید سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں پیش آئی ہے۔ ایک طرف تو تبرک گئوماتا کے تصور کے ساتھ چرخہ عدم تشدد اور قرون وسطیٰ کی روایات غرض ان سب کا معجون مرکب ہے جس پر "الویا چھوڑ دو" کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف ایک ایسی دنیا ہے

کہ جدید ذرائع حمل و نقل کی بدولت اس کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، جو تیز تیز رفتار کے ساتھ حرکت کر رہی ہے، آئے دن کے سماجی تجربات سے اس میں جوش و خروش نمایاں ہے، دلکشی ہے اور عقیدت کے بجائے تشکک پایا جاتا ہے۔ پنڈت ہرو جیسا شخص ان متضاد حالات میں کیوں نہ الجھن محسوس کرے گا جبکہ ان کے دوسرے رفقائے کار بھی اسی الجھن میں گرفتار رہیں۔ تکلف وہ مصالحت اور عیارانہ توجیہات سے وہ اس تلخ حقیقت سے کیسے اغماض کر سکتے ہیں کہ ایک روشن خیال آدمی کے سر پر گاندھی ٹوپی کچھ زیب نہیں دیتی۔

وسیع پیمانہ پر ہندوستان کے نوجوانوں کا یہی حال ہے۔ گاندھی جی کی نظربندی کے دوران میں ایسے نوجوان ہندوستانیوں کی تعداد میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے جن کو بالارادہ یا بلا ارادہ مساعی جنگ سے وابستہ کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بیسویں صدی کے حقائق سے دوچار کیا گیا۔ ہزارہا دیہاتوں سے نوجوان جوق جوق فوجی مراکز میں داخل ہو رہے ہیں جن کو ان کی زندگی میں پہلی دفعہ حفظان صحت اور نظم و انضباط کے ابتدائی اصول سے واقف کرایا جاتا ہے اور اس کے علاوہ یہاں ان کو جدید شہری کی سحر طرازیوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے جس کی آج کل بڑی اہمیت ہے۔ موجودہ جنگ کے دوران میں برطانیہ کے ممتاز ترین کارناموں میں وہ عظیم الشان جنگی نمائش ہے جو گزشتہ (۱۸) ماہ میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتی رہی ہے۔ اس نمائش میں کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستانیوں کو جنگ کے اسباب اور طریقوں سے واقف کرایا جائے یہ نمائش محض

دبابوں اور پروپاگنڈہ کی خاطر اشتہاروں کا مجموعہ نہیں بلکہ وسیع پیمانہ پر جدید فن انجینیری، ہوابازی، ذرائع حمل ونقل، زراعت، ریڈیو، طباخی، سماجی خدمات، نباتیات، طب وغیرہ وغیرہ کا ایک مکمل اور خود مکتفی ادارہ ہے۔

کانگریس کی جانب سے مقاطعہ کی دیوانہ وار کوششوں کے باوجود اس نمائش نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں نے اس کے ساتھ بڑی وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی زندگی میں اس نمائش کی بدولت ایک انقلاب رونما ہوگیا ہے۔ وہ ایسے دیہاتوں سے آئے ہیں جہاں تاریکی، اور غفلت کے سوا کچھ نہ تھا اگر گاندھی جی کی کوشش کامیاب ہوتی تو اس تاریکی میں کچھ اور اضافہ ہوتا۔ ان دیہاتیوں کے سامنے کے عجائبات اور اس کی کرشمہ سازیوں کو بے نقاب کیا گیا۔ حیرانی اور مسرت کے ساتھ وہ ان کو دیکھتے ہیں اور ان پر سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اغوا کرلئے جاتے ہیں کہ پھر واپس نہیں لوٹتے۔ وہ ایسی نئی دنیا میں بسر کرتے ہوں گے کہ مہاتما کی طلسمی آواز بھی انھیں واپس نہیں بلا سکتی۔

تخیل کی کسی پرواز کے تحت بھی مہاتما نئی دنیا کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ وہ تمام نوجوان خواہ گاندھی جی کو اور خود ان کو اس کا علم ہو یا نہ ہو، ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہوگئے اور ۱۹۴۴ء کے اختتام پر ان کی تعداد چالیس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔

مختصر یہ کہ گاندھی جی کی کبرسنی کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ عصر حاضر کی حقیقتوں نے اب ان میں کوئی زور باقی نہیں رکھا۔ عدم تشدد کا بھانڈا پھوٹ گیا کہ وہ درحقیقت تشدد کے سوا کچھ نہیں۔ اگرچہ ان کے بعض متبعین چند کے نصب العین کے ساتھ ممکن ہے محض زبانی وابستگی قائم رکھیں لیکن ان کے

اکثر پیرو جلد ہی یہ نقاب اتار پھینکیں گے کہ ہندوستانی مسائل کے حل کرنے میں چرخہ کی کوئی اہمیت حاصل ہے۔

اس دوران میں یقیناً گاندھی جی پر عقیدت کے پھول چڑھتے رہیں گے اور ان کے چہرہ کا حلقۂ نور عقیدت مند ہاتھوں سے زیادہ روشن بنایا جاتا رہیگا۔ اور جب اپنے وقت پر وہ اس دنیا سے سدھار ینگے تو یہ بات دھری ہوئی ہے کہ انھیں ہندو دیو مالا میں داخل کرکے ان گنت دیوتاؤں کی محفل میں بٹھا دیا جائے گا۔

دوسرا باب

پاکستان کا پس منظر

اب ہم اس کتاب میں ایک نہایت اہم اور نہایت ضروری مسئلہ پر بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم پاکستان کی حدود کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ 'پاکستان' ایک سلطنت ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ فی الحال وہ محض خواب و خیال ہے لیکن مسلمان اس کے وجود واقعی پر یقین کامل رکھتے ہیں اس کے لفظی معنی ہیں 'پاکوں کا ملک' جغرافیہ کی اصطلاح میں اس کے دو منطقے ہیں:- ایک شمال مغربی منطقہ جس میں بلوچستان، سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد داخل ہیں۔ دوسرا منطقہ مشرق ہے جو تقریباً پورے بنگال پر مشتمل ہے۔

تجویز یہ ہے کہ یہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے بقیہ ہندوستان سے جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر لئے جائیں اور سب مل کر ایک آزاد اور مستقل حکومت ہونے کا اعلان کر دیں

اس تجویز کو مسلم لیگ کی زبردست تائید حاصل ہے۔ مسلم لیگ ایک مستحکم اور طاقتور نظام ہے جس کے قائد مسٹر محمد علی جناح ہیں، اور کم از کم ۸۰ فی صد ہندوستان کے جوشیلے مسلمان اس کی پشت پر ہیں۔

اس بات کا بہت قوی امکان ہے کہ یہ خیالی سلطنت اچانک طور پر ایک دن وجود میں آجائے اور دنیا کے نقشہ پر نمودار ہو جائے۔ خود میں ان لوگوں میں سے ہوں جو نہ صرف یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا بلکہ یہ کہ ایسا ضرور بالضرور ہونا چاہیئے۔ جب کبھی ایسا ہوگا ایشیا میں بالکل نئے حالات رونما ہوں گے جن کے باعث موجودہ توازنِ قوت پارہ پارہ ہو جائے گا اور دنیا کے ہر ملک کو اپنی پالیسی بدلنی پڑے گی۔

اس کی اہمیت کے مدنظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطنت کا ذرا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ تفصیلات میں پڑنے سے پہلے ان جذبات کا مطالعہ ضروری ہے جو اس تجویز کے پس پشت کام کر رہے ہیں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ داری اختلافات جن کے حل کے طور پر پاکستان کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ یوں تو پوری کتاب میں ہر جگہ ان اختلافات کی کچھ نہ کچھ شہادت ملتی ہے۔ لیکن اب تک ہم نے پوری توجہ اس مسئلہ پر مرکوز نہیں کی تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی جائے۔

۲

ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کے مقابلہ میں بمبئی ایک پرسکون، منظم اور مہذب شہر ہے۔ سڑکیں بجلی کے قمقموں سے روشن ہیں۔ پولیس کا انتظام بہت اچھا ہے۔ ایک عورت بھی رات دن میں کسی وقت

بغیر کسی خطرہ کے تن تنہا شہر میں پھر سکتی ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس شہر میں فرقہ واری جذبات نسبتہً ٹھنڈے ہیں۔ ایسے وقت بھی جبکہ دوسرے کئی شہروں میں ہندو مسلم خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، بمبئی میں اطمینان کے ساتھ کاروبار جاری تھا۔

فروری ۱۹۲۹ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک یعنی حالیہ چند سال میں جن کے اعداد شمار ہمیں مل سکے ہیں اس پرسکون شہر کا خونین ریکارڈ حسب ذیل ہے:۔

۱۹۲۹ء میں دو مرتبہ فرقہ واری فسادات ہوئے۔ پہلی مرتبہ میں (۱۴۹) مقتول اور (۷۳۹) زخمی۔ اور یہ فساد (۳۶) روز تک جاری رہا۔ دوسری مرتبہ (۲۲) روز تک فساد رہا اور اس میں ۳۵ مقتول اور (۱۰۹) زخمی ہوئے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے دونوں سالوں میں بھی دو دو مرتبہ فسادات ہوئے۔ ان سب کی نوعیت تقریباً یکساں تھی۔ ہمیں صرف ۱۹۳۲ء کے دوسرے فساد کے اعداد شمار مل سکے ہیں۔ یہ فساد (۴۹) روز تک جاری رہا اور اس میں (۲۱۷) مقتول اور (۲۷۱۳) سخت زخمی ہوئے۔

۱۹۳۳ء ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء بھی خالی نہیں گئے لیکن یہ فسادات معمولی تھے۔ البتہ ۱۹۳۶ء کا فساد بڑا خونین تھا جس کا ہنگامہ (۶۵) روز تک گرم رہا اور جس میں (۹۴) مقتول اور (۶۳۲) زخمی ہوئے۔

۱۹۳۷ء نسبتہً پرامن گزرا۔ کیونکہ (۲۱) روز کے فساد میں صرف (۱۱) مقتول اور (۸۵) زخمی ہوئے۔

لیکن ۱۹۳۸ء کے ایک فساد میں جو کہ صرف ڈھائی گھنٹے رہا (۱۲)

مقتول اور (۱۰۰) زخمی پولیس کے علم میں آئے[1]۔

اُس وقت کی نسبت اب حالات اور بھی بدتر ہو گئے ہیں۔ قارئین کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اُس شہر بمبئی کا حال ہے جو فرقہ واری جذبات کے لحاظ سے نسبتہً پرسکون کہا جاتا ہے۔

"ہندو مسلم اتحاد کے لئے مسٹر گاندھی کی دیوانہ وار کوشش کے باوجود سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک کے ہندو مسلم تعلقات کا ریکارڈ سخت تکلیف دہ اور دل ہلا دینے والا ہے۔ یہ بیس سال کی خانہ جنگی کا ریکارڈ ہے۔ اِس طویل مدت میں اگرچہ وقفہ وقفہ سے امن قائم ہو گیا لیکن جانبین برابر مسلح رہے۔" ایڈ صفحہ ۱۸۰

ہمارے وہ آزاد خیال دوست کانگریسی پروپیگنڈے کے باعث جن کی مت ماری گئی ہے اور جن پر لفظ "ہندوستان" اور اس کی جغرافیائی وحدت جادو کا سا اثر رکھتی ہے۔ وہ ہندوستان جہاں اس قسم کے فرقہ وارانہ جذبات کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ ان واقعات کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں، حالانکہ دنیا کی نظروں میں یہ واقعات نہایت اہم اور دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ اگر یہ حضرات بادلوں کی بلندی سے نیچے آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں اور ذرا قریب سے ہندوستان کا مطالعہ کریں تو یقین ہے کہ

---

[1] یہ اعداد و شمار ڈاکٹر امبیڈکر کی کتاب تھوٹس آن پاکستان سے لئے گئے ہیں میں اس کتاب کا بہت ممنون ہوں اور "پاکستان" کے طالب علم کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

وہ اپنی رائے بدل دیں گے۔

مثلاً مالابار کے موپلوں کے فساد کے واقعات کچھ اچھے مناظر ان کے سامنے پیش نہیں کریں گے ـــــ ہندوکشتوں کے پشتے لگے ہیں، حاملہ عورتیں پیٹ پھٹی پڑی ہیں، شاندار مکانات نذر آتش ہو رہے ہیں، غرض ہر طرف تباہی اور بربادی کا دور دورہ ہے۔ ہمارے وہ انگلستانی دوست جو خواب خرگوش میں پڑے ہیں اور جو بے سمجھے بوجھے یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ فرقہ واریت تو برطانیہ کی پروردہ ہے، اگر وہ موقعۂ واردات پر واقعات کی تحقیق کرنیکی تکلیف گوارا فرماتے تو یقیناً اس سفید جھوٹ کی اشاعت سے پہلے ان کو کچھ تامل کرنا پڑتا۔ مثلاً ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک مخالف اسلام نظم کی اشاعت کوہاٹ کے گزشتہ فساد کی بنیاد تھی۔ اس چھوٹی سی نظم کی وجہ سے تقریباً (۱۵۵) مرد اور عورتیں مقتول اور زخمی ہوئیں۔ تقریباً دس لاکھ کی جائداد تباہ ہوئی اور ہزاروں آدمی خوفزدہ ہو کر وطن چھوڑ کے بھاگ گئے۔

تمام ہندوستان کا یہی رنگ ہے۔ اگر کسی نے ہندوؤں کے دیوتا کی ذرا سی توہین کر دی یا مسلمانوں کے اللہ کے متعلق کچھ کہہ دیا جلوس پر اینٹ پھینک دی یا مسجد کے سامنے باجا بجا دیا ـــــ ان میں سے کوئی بات بھی ہوئی کہ بس سمجھئے غضب ہو گیا۔ تلواریں چلنے لگیں بندوقیں سر ہونے لگیں، لاٹھیاں اور پتھر برسنے لگے، ذرا سی دیر میں خون کی ندیاں بہ نکلیں۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ چند نو آموز برطانوی سپاہی اس طوفان پر قابو پا لیتے ہیں۔ حال کی بات ہے کہ کراچی میں ۲۵ ہزار کے مجمع کو چند سپاہیوں نے منتشر کر دیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ کسی ہندو نے اسلام کی توہین

کی۔ ایک مسلمان نے اس مجرم کو ختم کر دیا۔ ہندو انتقام لینے پر تل گئے۔ ایک ہجوم غفیر مسلح ہو کر وسط شہر کی طرف چلا۔ مجمع پولیس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ چند گوروں نے آکر گولی چلائی۔ ۲۰ آدمی مارے گئے۔ مجمع کا جوش رفو چکر ہو گیا۔ امن تو قائم ہو گیا۔ لیکن کانگریس نے خوب شور مچایا کہ برطانیہ اس قسم کے مظالم ہندوستانیوں پر کرتی ہے اور اس طرح اپنی شہنشاہی طاقت کا ناجائز استعمال کرتی ہے۔ ایک ہزار مذہبی دیوانوں کے مقابلہ میں ایک برطانوی سپاہی بھی ——— ذرا خیال تو کیجئے "یہ ہے" شہنشاہی طاقت ——— کیا مزے کی بات ہے:

ہندو مسلم منافرت کی شہادت ایسی عام اور ایسی نمایاں ہے کہ اس پر زور دینا اور اس کی وضاحت کرنا قارئین کی ذہانت کی توہین کرنا ہے۔ اگر کچھ حضرات ایسے ہیں جو مزید شہادت کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ فسادات اور قتل و غارتگری کے اعداد و شمار کی طرف رجوع کریں۔ اعداد و شمار کی شہادت ناقابل تردید ہے اور کٹر ہندو بھی اس پر لفظوں کی ملمع سازی نہیں کر سکتا ہے۔

یہ ہے پاکستان کا پس منظر ——— ایک خونی پس منظر ——— ماضی بھی خونین حال بھی خونین اور جب تک اس خواب کی تعبیر صحیح نہ ہو اندیشہ ہے کہ مستقبل خونین تر ہوگا۔

۳

آپ کہہ سکتے ہیں کہ "یہ سب فسادات فرو ہو جائیں گے۔ جبکہ دوسری قوموں نے اپنے اختلافات دفن کر دیئے ہیں ہندوستانی کیوں

ایسا نہیں کریں گے۔؟

اس سوال کا جواب اس وقت تک نا ممکن ہے جب تک کہ ہم لفظ "قوم" کے معنی کی تعیین نہ کرلیں۔ رینان نے اپنے مشہور مقالہ "قومیت" میں اس علمی فریضہ کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ بغیر کسی تبدیلی کے ہم اسی کے الفاظ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

قوم کن عناصر سے بنتی ہے؟

رینان کہتا ہے:-

"قوم ایک ذی حیات عقلی جوہر ہے۔ اس جوہر کے دو عناصر ہیں۔ ایک کا تعلق ماضی سے ہے اور دوسرے کا حال سے۔ قوم کا پہلا عنصر قیمتی یادگار ماضی کی مشترک ملکیت ہے۔ باہم مِل جل کر رہنے کی حقیقی خواہش اور اسلاف کی غیر منقسم میراث کو اس کے شایانِ شان طریقہ پر محفوظ رکھنے کا عزم صمیم۔

لفظ قوم کے معنی کا دوسرا عنصر ہے۔ ماضی میں مشترکہ مفاخر اور حال میں مشترک عزم۔ یا یوں کہئیے ماضی میں شاندار کارناموں کی انجام دہی میں کامل اشتراک عمل اور مستقبل میں اِس اشتراک عمل کو اسی طرح جاری رکھنے کا عزم صمیم ——— یہ وہ ضروری شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر ایک قوم کا وجود میں آنا قطعاً محال ہے۔"

آئیے دیکھیں کہ ہندوستان اِس امتحان میں کہاں تک پورا اترتا ہے رینان کی بیان کردہ پہلی شرط کو لیجئے، یعنی قیمتی یادگار ماضی کی مشترک ملکیت مسلمانوں کی یادگار کیا ہے؟ مسلمانوں کی شاندار یادگار یہ ہے کہ برطانیہ کے

آنے سے پہلے آٹھ سو سال تک اس ملک کے آقا ہی تھے۔ اپنی دماغی اور جسمانی
صلاحیتوں کے بل بوتے پر انھوں نے ہندوؤں پر حکومت کی۔ مسلمانوں کے
دورِ حکومت کی ناخوشگوار تفصیلات کو ہندو ابھی تک نہیں بھولے ہیں "ہندو
قومی تحریک" میں بھائی پرمانند کے الفاظ پڑھیئے:۔

"ہندو تاریخ میں ہندو پرتھوی راج، پرتاب، شیواجی
اور بیراجی بیر کے ناموں کی عظمت کرتے ہیں جنھوں نے
ملک کی عزت اور آزادی کی خاطر مسلمانوں سے جنگ
کی، درآں حالیکہ مسلمان محمد بن قاسم جیسے حملہ آور اور اورنگ زیب
جیسے حکمران کو اپنا قومی ہیرو سمجھتے ہیں"

یہ صحیح ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں "قیمتی میراث" کے مالک ہیں لیکن
یہ میراث نفرت اور عداوت کی یاد تازہ کرتی ہے نہ کہ محبت اور یگانگت کی۔
علاوہ ازیں اس قسم کے واقعات نہ صرف ماضی میں ملتے ہیں بلکہ حال
میں بھی ان کا پتہ چلتا ہے۔ اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا نصب العین
محض عارضی اور حال کی پیداوار ہے، یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے چاہے
کتنا ہی ناخوشگوار طور پر سہی بہرحال ایک ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا اور یہ کہ ان
حالات میں پاکستان کی صورت میں علیحدگی ایک انتہائی اقدام ہے۔ یہ استدلال
پیش کرنے والے حضرات تازہ اور حالیہ واقعات سے چشم پوشی برتتے ہیں
بیشک یہ صحیح ہے کہ ماضی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات
یا گوریلا قسم کی لڑائیوں پر اکتفا ہوئی اور کسی بڑی اور فیصلہ کن جنگ کی نوبت
نہیں آئی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جب تک ہندوستان کا نظم برطانوی ہاتھوں میں ہے
تب تک یہی حالت باقی رہے گی۔ لیکن جوں جوں آزادی کا وقت قریب آتا جا رہا ہے

فرقہ واریت کی آگ تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ درحقیقت حکومت خود اختیاری عطا کیئے جانے کے بعد ہی سے مطالبہ پاکستان نے شدید صورت اختیار کر لی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ استدلال ناقابل تردید ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ حکومت خود اختیاری کے معنیٰ صدفی صد 'ہندو حکومت' کے ہیں۔ اور جوں ہی ہندوؤں کے ہاتھوں میں حکومت آئی انھوں نے اس کو بری طرح استعمال کیا۔ انھوں نے قبل از قبل مسلمانوں کو اس سخت آزمائش کا مزہ چکھایا جو شاید اس وقت مسلمانوں کو چکھنا پڑے گا جب کہ برطانیہ ہندوستان سے دست بردار ہو چکا ہو گا۔

واقعات یوں رونما ہوئے:-

۱۹۳۵ء کے قانون کی رو سے آزاد انتخابی بنیادوں پر گیارہ صوبوں میں نمایندہ حکومت خود اختیاری قایم ہوئی۔ اس موقع پر ہم قانون کی تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا کافی ہے کہ چند ضروری تحفظات کے ساتھ یہ قانون ترقی کی طرف ایک بڑا قدم تھا اس میں ان تمام امور کا لحاظ رکھا گیا تھا جو ایک ایسی قوم کے لئے ضروری ہوتے ہیں جو عہد طفلی سے گزر رہی ہو اور جس نے ابھی آزادی کی دہلیز پر قدم رکھا ہو اس قانون کے تحت پیدا ہونے والے ادارے نہایت مناسب طور پر ان ہندوستانی سیاست دانوں کی اغراض و مقاصد کی تکمیل کرتے تھے جو کامل ذمہ داری کی نعمت سے بہرہ اندوز ہونے کی تڑپ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔

۲ ہر اگست ۱۹۳۵ء کو شاہی منظوری صادر ہوئی اور ۳۷-۱۹۳۶ء کے موسم سرما میں جدید انتخابات عمل میں آئے۔ گیارہ صوبوں میں سے سات میں کانگریس کو بڑی اکثریت حاصل رہی۔ ان صوبوں میں طاقت حاصل ہوتے ہی

کانگریس کا اصلی چہرہ بے نقاب ہوگیا۔ بجائے اس کے کہ کانگریس کسی قسم کے اتحاد کی کوشش کرتی اور عہدوں کے مال غنیمت میں حصہ بٹانے کے لئے مسلمانوں کو دعوت دیتی، اس نے ایک دم آنکھیں پھیر لیں اور اقتدار سے مسلمانوں کو ایک قلم محروم کر دیا غضب تو یہ کیا کہ کانگریس نے اپنے مطلق العنان اقتدار کو صرف سیاسی معاملات ہی کی حد تک محدود نہ رکھا بلکہ اس نے مسلمانوں کی زندگی کے مادی اور غیر مادی ہر شعبہ پر حملہ کیا۔ بجائے سادہ اور سلیس اردو کے سنسکرت آمیز زبان جبراً جاری کرنے کے لئے ایک مہم شروع کی گئی۔

مدارس میں ایسے نفرت انگیز طریقے جاری کیئے گئے جو صرف نازیوں ہی کو پسند آسکتے۔ مثلاً یہ کہ مسلمان بچوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ہندو بچوں کے ساتھ گاندھی کی تصویر کی پوجا کریں۔ کانگریسی جھنڈے کو قومی جھنڈا قرار دیا گیا۔ انصاف بری طرح پامال کیا گیا بعض حالات میں تو پولیس نے مسلمانوں کے خلاف ایسی خودسری اور تمرد کا اظہار کیا کہ مسلمان آج تک کانگریسی پولیس کو "گستاپو" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کاروبار اور تجارت میں بڑے زمینداروں اور تاجروں سے لے کر معمولی کاشتکاروں تک مسلمانوں کے خلاف سخت بیرحمی کے ساتھ امتیاز برتا گیا۔

اس واقعہ سے ان الزامات کا ثبوت ملتا ہے کہ جب یورپ میں جنگ چھڑی اور کانگریس وزارتوں سے مستعفی ہوئی تو صدر مسلم لیگ مسٹر جناح نے کانگریسی عہد استبداد کے خاتمہ پر "یوم شکر گزاری" منانے کے لئے ایک اپیل شائع کی۔ چنانچہ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے نہایت پرجوش طریقہ پر "یوم شکر گزاری" منایا۔

یہ بحث تھی رینان کی پہلی شرط کے متعلق ——— یعنی "ماضی کی قیمتی میراث"

جو قوم کے افراد کو محبت اور یکرنگی کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے اور جو پوری قوم کے لئے سرمایۂ افتخار ہوتی ہے۔

۴

رینان کی دوسری شرط یعنی "مل جل کر رہنے کی خواہش اور مشترکہ طور پر شاندار کارنامے انجام دینے کا عزم" کو بھی دیکھ لیجئے کہ کہاں تک اس کا انطباق ہندوستان پر صحیح ہے۔

متذکرۂ بالا واقعات کے سلسلہ میں اس سوال کا جواب بڑی حد تک دیا جا چکا ہے۔ لیکن مزید تاکید کی خاطر ہم اور واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

ہندو اور مسلمانوں کی باہم مل جل کر رہنے کی خواہش ٹھیک اسی درجہ کی ہے جس درجہ کی کہ فرانسیسیوں کی جرمنوں کے ساتھ رہنے کی خواہش یا امریکیوں کی جاپانیوں کے ساتھ رہنے کی خواہش۔

ذیل میں ڈاکٹر امبیڈکر کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:۔

ان دونوں (ہندو اور مسلمانوں) میں مقابلہ ایسا ہے جیسا کہ دو معاند قوموں میں توفیر اسلحہ کے بارے میں مسابقت ہوتی ہے اگر ہندو بنارس یونیورسٹی بناتے ہیں تو اس کے جواب میں مسلمان جامعہ علی گڑھ کھڑی کر دیتے ہیں۔ اگر ہندو ایک تحریک شروع کرتے ہیں تو مسلمان بھی اس کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر ہندو آر۔ ایس۔ ایس (ہندو رضا کاروں کی جماعت) کی تنظیم کرتے ہیں تو مسلمان بھی جماعت خاکسار بنا ڈالتے ہیں جنگ کرنے والی دو قوموں کے احساس خطرہ اور عزم مدافعت کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین معاشرتی امور میں یہ مسابقت جاری ہے۔

مسلمان خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندو ان کو غلام بنا رہے ہیں اور ہندو ڈرتے ہیں کہ مسلمان پھر ان پر فتح پانے کی فکر میں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دونوں جنگ کی تیاری کر رہے ہیں[1]"

دیکھنے یہ ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ساتھ رہنے کی خواہش

اب تک ہم نے صرف اس پہلو پر غور کیا ہے کہ کس طرح مسلمان اپنے کو ہندوؤں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مسٹر گاندھی کے "ہندوستان کی وحدت اور ہندوستانیوں کی "مشترکہ قومیت" کے نعرہ کے باوجود ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت ٹھیک اسی طرح اختلافات کو تسلیم کرتی ہے۔

مثلاً کٹر ہندوؤں کا نقطۂ نظر ہے جس کو مہا سبھا پیش کرتی ہے مہا سبھا ایک طاقتور سیاسی جماعت ہے جس کو چند اعلیٰ صلاحیت کے ہندو چلا رہے ہیں۔ ایک حالیہ خطبۂ صدارت میں مسٹر ڈی۔ وی ساورکر کے حسب ذیل الفاظ نے مجمع سے خوب خراج تحسین حاصل کیا:۔

"ہندوستان میں ہم ہندوؤں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ہم خود ایک مستقل قوم ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہم ایک مشترک وطن رکھتے ہیں جو ایک جغرافیائی وحدت ہے، بلکہ ایک ایسی خصوصیت جو دنیا میں دوسری جگہ مشکل سے ملے گی، یہ ہے کہ ہم ایک مشترک 'ارض مقدس' رکھتے ہیں اور وہی مشترک وطن بھی ہے۔

" اس وجہ سے ہمارا جذبۂ حب الوطنی دو آتشہ ہے۔

---

[1] ڈاکٹر امبیڈکر کی کتاب تھوٹس آن پاکستان صفحہ ۲۴۲

ہم تہذیبی، مذہبی، تاریخی، لسانی اور نسلی روابط رکھتے
ہیں۔ اور صدیوں کے اختلاط اور میل جول نے ہم کو ایک
متجانس اور ہم آہنگ قوم بنا دیا ہے۔ ہندو از روئے
معاہدہ ایک قوم نہیں ہیں بلکہ یہ ایک عضوی قومی جوہر ہے[1]
ہندو قوم کی اس تصویر میں مسلمان کہاں سما سکتے ہیں؟ جواب
یہ ہے کہ کہیں نہیں! مہاسبھا نہ ان کو پسند کرتی ہے، نہ ان کی ضرورت محسوس
کرتی ہے اور نہ ان کو تسلیم کرتی ہے۔ ان ہندوؤں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ
مسلمان جا سکتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں وہ کہاں جائینگے اور کیا کریں گے؟
لیکن پوشیدہ نفرت کے اظہار کے سلسلہ میں مسٹر ساورکر کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ
ہندوستان ایک متجانس اور ہم آہنگ قوم نہیں ہے بلکہ صدیوں کے تہذیبی
مذہبی اور قومی معاندانہ جذبات کی پیداوار ہے۔ مسٹر ساورکر نے اعلان کیا
کہ "ہم کو ایک بہادر کی طرح ناخوش گوار واقعات کو برداشت کرنا چاہیئے۔
ہندوستان میں دو قومیں ہیں —— ہندو اور مسلمان"۔

یہاں تک تو ٹھیک ہے! اتنی وسیع ذمہ داری رکھنے والے ہندو
لیڈر کے منہ سے ہم نے اعتراف کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے اسی سانس
میں جس میں وہ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں،
عملی طور پر اس کے اظہار کے لئے کوئی تدبیر اختیار کرنے کی ان کو اجازت
نہیں دیتے۔ وہ اور ان کی جماعت "پاکستان" کے سخت مخالف ہیں۔ وہ
کہتے ہیں "بیشک ہمیں تسلیم ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں بالکل اسی طرح جس طرح

---

[1] خطبۂ صدارت، ہندو مہاسبھا اجلاس، کلکتہ دسمبر ۱۹۳۹ء۔

ہم ایک قوم ہیں۔ لیکن ہم ان کو رہنے کے لئے کوئی جگہ دینی نہیں چاہیئے۔
بیشک وہ ہندوستان میں ہیں اور بدقسمتی سے دس کروڑ ہیں؛ وہ ادھرمی
ہیں اس لئے ذات سے باہر ہیں۔ ہندوستان تو ہمارا ہے اور ہم اس کو
اپنے قبضہ میں رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ کئی سو سال
تک وہ ملک میں با اقتدار رہے۔ اور برطانیہ کے علاوہ یہی لوگ تھے جنھوں
نے ہندوستان کو ایک حد تک وحدت بنا دیا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ماضی کی
داستان ہے اور اب ہم عزم مصمم رکھتے ہیں کہ وہ حالات پھر عود نہیں کریں گے۔
ہم برطانیہ کے شکرگزار ہیں کہ اس کی بدولت ہم برسر اقتدار آ گئے۔ تعداد میں
ہم تین گنے ہیں اور دولت میں بیس گنے اور جب دولت برطانیہ ملک سے
دست بردار ہو جائے گی تو ہمارا اقتدار اور بھی بڑھ جائے گا۔ لیکن یہ کس
طرح ہوگا؟ کٹر ہندوؤں کے نقطۂ نظر کا یہ تجزیہ ہے بیشک! مسٹر گاندھی
اس تجویز پر توبہ توبہ پکاریں گے کہ یہ خیالات ان کے مقدس دماغ میں پیدا
ہوں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یہ خیالات ان تمام بڑے بڑے تاجروں کے
دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں جو مسٹر گاندھی کے چیلے ہیں۔ لیکن وہ کبھی اس
طرح آپے سے باہر نہیں ہوتے کہ ان خیالات کا بے دھڑک اظہار کر دیں۔

لہٰذا اب ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :-

مسلمان بڑی قوت اور انتہائی جوش سے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ
ایک علیحدہ اور آزاد قوم ہیں۔ اور وہ بالکل حق بجانب ہیں!-

ہندو ------ یا کم از کم ان کی ایک بڑی تعداد ------ اتنے ہی
جوش کے ساتھ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ ایک علیحدہ اور آزاد قوم ہیں وہ بالکل
حق بجانب ہیں لیکن جب مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ اپنی آرزوؤں کو روبعمل لائیں

اور اپنا ایک قومی وطن بنائیں تو ہندو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، کانگریسی پریس پوری قوت سے اس کی مخالفت شروع کر دیتا ہے۔ نوجوان ہندو جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کو اس کام کے لئے بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں، بڑی قوت سے اکھنڈ ہندوستان، کا پرچار کرنے لگتے ہیں اور مسٹر گاندھی بستر پر لیٹ کر برت کی دھمکی دیتے ہیں۔

ان سب کا کیا مطلب ہے؟

جواب ظاہر ہے کہ پاکستان سے ان کے ذاتی اغراض و مقاصد متاثر ہوتے ہیں۔

درحقیقت یہ ذاتی مفاد ہی کا معاملہ ہے۔ ذاتی مفاد ایک پرانا بھوت ہے بلکہ وہ ایک ایسی منحوس حقیقت ہے جو دنیا کی تمام بے چینیوں کی جڑ ہے۔

ہم ہی پہلی مرتبہ ہندوستان کو ملزم نہیں ٹھہرا رہے ہیں ذیل میں مسلم لیگ کے ایک مستند ترجمان کا فیصلہ ملاحظہ کیجئے:-

"ہندو پاکستان کی کیوں اتنی شدید مخالفت کرتے ہیں اس کا اصلی اور بنیادی سبب یہ ہے کہ پاکستان انکی ذاتی اغراض کی جڑوں پر کاری ضرب لگاتا ہے اور پورے ملک پر دستبرد کرنے کے خواب کو خواب پریشان بنا دیتا ہے۔ ہندوستان کی وحدت اور اس کے ناقابل تقسیم ہونے کا نعرہ ایک چال ہے جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان سیاسی اور معاشی میدانوں میں

اپنے حصہ سے دست بردار ہو جائیں[1]۔"

کوئی شخص جو اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ کس طرح بڑے بڑے ہندو تاجر کانگریس پر چھائے ہوئے ہیں، اس دعوے کی صداقت میں ذرا بھی شبہ نہیں کر سکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہندو سرمایہ دار اپنی دولت کے زور پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ وہ مسلمانوں پر اپنی معاشی گرفت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

ہندو اس بات کے لئے مرتے دم تک لڑیں گے کہ وہ علاقے جو ان کے ہاتھوں سے چھینے جا رہے ہیں، وہ ان پر اپنا معاشی اقتدار باقی رکھیں بلکہ اس کو وسیع تر کریں ــــ وہ علاقے پہلے ہی سے دولت مند ہیں اور مستقبل میں وفور دولت کے امکانات ان علاقوں میں بہت زیادہ ہیں۔ بنگال میں صنعتی تنظیم کے مواقع نہایت اعلیٰ درجہ ہیں۔ علاوہ ازیں بنگال مغربی ہند کے زراعتی صوبوں کے لئے ایک بہترین بازار ہے۔ ان صوبوں میں معدنیات اور جنگلات وافر ہیں، پنجاب کی اس لاکھوں ایکڑ زرخیز زمین کا تو کچھ ذکر ہی نہیں جو ہندوستان بھر میں اپنی قسم کی ایک ہی زمین ہے۔

بیشک ہندو سرمایہ دار اپنے اغراض کی خاطر آخری دم تک پاکستان کے خلاف لڑیں گے وہ دنیا میں خوب شور مچائیں گے اور ہندوستان کے ٹکڑے کئے جانے کے خلاف پر زور پروپیگنڈا کریں گے۔ یقیناً ہندو سرمایہ دار روئیں گے، چیخ پکار مچائیں گے، دھمکی دیں گے، رشوت

---

[1] پاکستان اینڈ ماڈرن انڈیا (مالابار ہل بمبئی)

دیں گے، اور دنیا کو فریب میں مبتلا کرنے کے لئے، ایسے سربرآوردہ ہندؤں کی خدمات حاصل کریں گے جن کو ہندو قومیت کے جذبہ نے واقعات سے اندھا کر رکھا ہے۔ اِس قسم کی ایک بڑی ہندو شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ ایسے وقت جبکہ ہندوستان میں خون کی ندیاں بہ رہی تھیں اور ایک خوفناک خانہ جنگی کا خطرہ سروں پر منڈلا رہا تھا، پنڈت جی نے نہایت اطمینان کے ساتھ امریکہ والوں کو حسب ذیل بحری تار روانہ کیا:۔

"ایک مٹھی بھر لوگوں کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نسلی، تہذیبی اور لسانی کسی قسم کے اختلافات نہیں ہیں[1]"

اِس دل ہلا دینے والے دعوے پر جتنا بھی حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ طرہ یہ کہ پنڈت جی اس دعوے کے بعد حسب ذیل بیان کا اضافہ کرتے ہیں:۔

"آج کل کچھ مسلمان ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس مطالبہ کی عمر مشکل سے چار سال ہے۔ کچھ لوگوں نے اِس مسئلہ کو بڑا سنجیدہ بنا رکھا ہے۔"

دس کروڑ کی مہیب تعداد کو پنڈت جی نے "کچھ" کے لفظ سے تعبیر کرنا پسند فرمایا ہے، معلوم نہیں کیوں؟ "زندگی یا موت" کا عزم رکھنے والی ایک زبردست قوم کے طوفان جذبات کو پنڈت جی یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

---

[1] نیویارک ٹائمز میگزین ۱۹ ۱ہ جولائی ۱۹۴۲ء

کچھ لوگوں نے اس مسئلہ کو بڑا سنجیدہ بنا رکھا ہے؟

قارئین کرام! ہم نے آپ کو متنبہ کر دیا ہے۔ باوجود اس شور و شغب اور اس غلط پروپیگنڈے کے اس سلطنت کا نقشہ دنیا کے انصاف پسند حضرات کے ذہنوں میں مرتسم ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان پر سخت تنقیدیں کی جائیں گی۔ اس کے متعلق جھوٹ تراشا جائے گا اور اس کے بارے میں غلط بیانیوں کا ایک طوفان برپا کیا جائے گا۔ لیکن مجھے یقین واثق ہے کہ پاکستان ان سب آزمائشوں میں کامیاب نکلے گا۔ میں اس بات پر اپنے کامل یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ سلطنت ضرور بالضرور وجود میں آئے گی۔

آیئے اب ہم ذرا دیر کے لئے پاکستان کے بالقوہ شہنشاہ سے ملاقات کریں اس تدبر کو دیکھتے ہوئے جس کا مسٹر جناح سیاسی جنگ میں مظاہرہ کر رہے ہیں یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں ہے کہ ان کی شخصیت تمام ایشیا میں سب سے زیادہ اہمیت کی مالک ہے۔

تیسرا باب

ایک بطلِ عظیم سے مکالمہ

(مسٹر محمد علی جناح)

ایشیاء کا اہم ترین انسان سرسٹھ سال کی عمر میں ہے۔ دراز قد، چھریرا بدن۔ وضع دار، سلک سوٹ زیب تن کئے ہوئے اور یک چشمی عینک چہرے پر لگی ہوئی۔ ایک سخت سفید کالر لگائے ہیں جسے وہ شدید گرمیوں میں بھی اِستعمال کرنے کا عادی ہے۔ وہ شرفائے ہسپانیہ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ سیاسی مسلک میں کہنہ مشرب مدبر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی باعظمت آدمی سنیٹ جیمس کلب میں بیٹھا ہوا لطیف مشروب نوش جان کر رہا ہو اور جریدہ دی ٹائمس کے مطالعہ میں مصروف ہو۔

میں نے مسٹر جناح کو ایشیاء کی اہم ترین شخصیت قرار دیا ہے تاکہ آپ کے ذہن میں اُن کا تصور روشن اور قطعی ہو جائے۔ صیغۂ تفضیل کی ساری ترکیبوں کی طرح یہ تعبیر بھی بحث و تمحیص کے لئے کھلی ہوئی ہے لیکن

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر صداقت سے کسی طرح بعید نہیں ہے۔

ہندوستان شاید چند ہی سال میں دنیا کا اہم ترین مسئلہ بن جائے گا۔ اور مسٹر جناح اس باب میں عدیم النظیر نازک اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہیں جنگ کا رخ بدل سکتے ہیں۔ دس کروڑ مسلمان ان کی چشم و ابرو کے اشارہ پر حرکت کرنے کے لئے تیار رہیں۔ یہ مقام کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ ہندو صفوں میں بھی یہ بات نہیں ہے۔ اگر گاندھی جی چل دیں تو جانشینی کے لئے نہرو ہیں۔ راجگوپال اچاریہ ہیں، پٹیل ہیں۔ ایک درجن اشخاص موجود ہیں۔ لیکن جناح کے بعد۔ ع

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟

میرا یہ ہرگز منشا نہیں، کہ بس جناح پر لیگ کا خدانخواستہ خاتمہ ہے۔ وہ نہایت مستحکم اور مربوط جماعت ہے۔ البتہ اس کی حرکت کے رخ بیشمار ہوسکتے ہیں .... یہ ٹرین لائن سے اتر بھی سکتی ہے۔ ہندوستان میں قتل و غارت کا بازار گرم کرسکتی ہے۔ یہ دوسری جنگ کا آغاز کرسکتی ہے۔ جب تک مسٹر جناح موجود ہیں، مسلم لیگ سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوسکتی ...... اس طرح تم دیکھتے ہو کہ کس طرح سب کچھ اس سلک سوٹ اور یک چشمی عینک والے آدمی پر منحصر ہے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ۸،۱۰ دسمبر ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے صرف آدھ گھنٹہ مل سکتا ہے۔ لیکن انھوں نے مجھے تقریباً تین گھنٹے دیئے۔

اس دوران میں انھوں نے ایک وسیع صورتِ حال کا جائزہ لیتا ان کے بیان کا خلاصہ اور ان کی گفتگو کی روح ذیل کے مکالمہ میں موجود ہے۔

جسے انھوں نے از راہِ کرم دیکھ لیا ہے۔
ہم ایک خاموش کمرہ میں بیٹھے ہیں۔ جہاں سے باغ کا منظر پیش نظر ہے دنیا کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ پر گفتگو جاری ہے اور ایک ایسے آدمی سے گفتگو ہو رہی ہے جو اسے حل کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتا ہے۔

۲

میں۔ (مسٹر جناح سے) آپ پر معترضین کا سب سے عام اعتراض یہ ہے کہ آپ نے پاکستان کی کوئی واضح اور جامع و مانع تعریف نہیں کی.... علاوہ ازیں، دفاع، معاشیات اور اقلیتوں کے حقوق وغیرہ کی بہت سی ایسی تفصیلات ہیں جنھیں آپ نے عمداً مبہم چھوڑ دیا ہے کیا آپ کے نزدیک یہ الزام بجا ہے؟

جناح۔ یہ نہ تو بجا ہے اور نہ فہم و فراست کی کوئی دلیل ہے خصوصاً جب کسی انگریز کی جانب سے ہو جسے اپنی تاریخ کی کچھ بھی خبر ہو۔ جب آئرلینڈ انگلستان سے جدا کیا گیا تو تقسیم کے شرائط کی دستاویز صرف دس سطروں پر مشتمل تھی۔ صرف دس مطبوعہ سطریں .... ایک ایسے ناقابل فہم اور پیچیدہ مسئلہ کے حل کے لئے جس نے صدیوں تک برطانوی سیاست کو زہر آلود کر رکھا تھا۔ ساری تفصیلات مستقبل پر چھوڑ دی گئی تھیں .... مستقبل اکثر بہتر ثالث ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے میں نے تو دس سطروں سے کہیں زیادہ مواد پاکستان کے اصول اور عملی ہیئت کو ظاہر کرنے کے لئے دنیا کے آگے پیش کیا ہے۔ یہ کسی آدمی کے بس کی بات نہیں کہ ساری

جزئیات و تفصیلات کو بھی قطعی طور پر فیصلہ کن صورت میں پیش کر دے۔

علاوہ ازیں ہندوستان کی تاریخ بھی ثابت کرتی ہے کہ کوئی ایسی تفصیلی دستاویز غیر ضروری اور لاحاصل ہے۔ گول میز کانفرنس میں جب برما کی علیحدگی کا مسئلہ طے ہوا تھا تو کیا کوئی دستاویز مرتب ہوئی تھی؟ ہے کوئی دستاویز جب سندھ بمبئی سے علیحدہ کیا گیا؟ جواب ظاہر ہے کہ قطعی نفی میں ہے کہ ایسی دستاویز کا کہیں وجود نہیں ۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔

اصل تنقیح یہ تھی کہ علیحدگی کا اصول تسلیم کر لیا جائے۔ تفصیلات تبعاً ظہور میں آجائیں گی۔

بیں ۔ آپ پاکستان کے بنیادی اصول کی کس طرح تعبیر فرمائیں گے؟

جناح ۔ صرف چار لفظوں میں مسلمان ایک قوم ہے ۱-۲-۳-۴ ۔ اگر یہ آپ تسلیم کر لیں اور آپ صاحب دیانت ہوں تو آپ پاکستان کے اصول کو مان لیں گے ۔ اگر موانعات و مشکلات موجودہ صورت سے سو گنے بھی زیادہ ہوتے تب بھی آپ اس اصول کو ماننے پر مجبور رہتے ۔ ہاں اگر آپ ماننا ہی نہ چاہتے ہوں .... انکار کی دل میں ٹھان لی ہو ــــــ تو یہ اور بات ہے ــــــ شانوں کو حرکت دیتے ہوئے وہ مسکرا دیئے ۔

بیں ۔ آپ مسلمانوں کو ایک قوم کن وجوہ کی بنا پر کہتے ہیں کیا آپ کے نزدیک مذہب کے اعتبار سے مسلمان ایک قوم ہیں ۔

جناح ۔ ہاں! اس لیئے بھی لیکن صرف مذہب ہی کی بنا پر نہیں ۔ یاد رکھیئے کہ اسلام صرف روحانی اور مذہبی اصول ہی نہیں بلکہ ایک حقیقی عملی

نظامِ حیات ہے۔ نہ صرف مذہب بلکہ میں تو زندگی پر ایک کل کی حیثیت سے غور کرتا ہوں، اور سارے نظامِ حیات کے اعتبار سے مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم سمجھتا ہوں۔ زندگی کے ہر اہم شعبہ اور عنصر کے لحاظ سے۔ ہماری تاریخ کے لحاظ سے ہمارے مشاہیر و اکابر کے اعتبار سے، ہمارے آرٹ اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے ہماری موسیقی ہمارے قوانین اور اصول قانون کے اعتبار سے غرض ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک ممتاز اور علیحدہ قوم ہیں۔

بیلی۔ کرم ہوگا اگر آپ مجھے ان چیزوں کے لکھنے کا موقع عنایت فرمائیں۔

جناح۔ (کسی قدر وقفہ کے بعد) ان تمام امور میں ہمارا زاویۂ نگاہ نہ صرف ہندوؤں سے مختلف ہے بلکہ اکثر شعبوں میں بالکلیہ متضاد ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری دنیا ہی مختلف ہے۔ زندگی میں ہمیں آپس میں مربوط کرنے والی کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی، ہمارے نام، ہماری غذا، ہمارا لباس یہ سب مختلف ہیں۔ ہماری معاشی زندگی، ہمارے تعلیمی تصورات عورتوں کے ساتھ ہماری روش، حیوانات کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل ہر نقطہ کا رپر ہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ دور کیوں جائیے .... گائے کے ایک دائمی قضیہ ہی کو لیجئے ...... ہم گائے کو ذبح کرتے ہیں اور کھاتے ہیں اور ہندو اسے پوجتے ہیں۔ شاید اکثر انگریز خیال کرتے ہوں گے کہ گئو پوجا صرف خوشنما رواج یا محض تاریخی یادگار ہے حالانکہ حقیقتہً یہ چیز ایسی نہیں۔ چند دن پہلے، اسی شہر میں گائے کا معاملہ پولیس کیلئے

ایک آفت بن گیا تھا۔ ہندو نہایت اشتعال میں تھے کہ گائیں منظر عام پر ذبح کی جا رہی تھیں۔ لیکن گائے کا مسئلہ ان ہزاروں مابہ النزاع مسائل میں سے صرف ایک ہے .... ذرا دم لے کر ......
اچھا تو آپ نے کیا لکھا ہے؟

میں ۔ میں نے صرف یہ لکھا ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں۔

جناح ۔ کیا آپ کو اس کا یقین ہے؟

میں ۔ جی ہاں! مجھے یقین ہے۔

جناح ۔ (تبسم آمیز لہجہ میں) آپ کے اور کیا سوال ہیں۔

میں ۔ پہلا سوال معاشی ہے۔ کیا مسلمان پاکستان میں امیر تر ہوں گے یا غریب تر۔ کیا آپ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابل چنگی کے محاصل عائد کریں گے؟

جناح ۔ میں ذرا تبدیلی کی خاطر ایک سوال کروں گا۔ فرض کیجئے کوئی آپ سے سوال کرے کہ آپ جرمنی کے تحت خوشحال انگلستان کو ترجیح دیں گے یا غریب مگر آزاد انگلستان کو تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

میں ۔ اس میں جواب کی کیا بات ہے؟

جناح ۔ ہاں، بیشک! یقیناً یہی بات ہے .... پھر کیا آپ کا سوال بیجا نہیں معلوم ہوتا؟ .... یہ عظیم الشان نصب العین شخصی آرام یا عارضی راحت کے سوالات سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ مسلمان ذرا سخت جان قوم ہے ـــــ اور سخت کوش۔ اگر پاکستان کے یہ معنی ہیں کہ انھیں کسی قدر اور سختی برداشت کرنی ہوگی تو وہ اس کی پرواہ نہ کریں گے۔ انھیں اس کی کوئی شکایت نہ ہوگی۔

لیکن پاکستان غربت کے مترادف کیوں سمجھا جائے؟ وہ کون قابل قیاس سبب ہے جس کے باعث مستقل قومیت کا یہ تحفہ معاشی حدبندی اور محرومی کے ہم معنیٰ قرار پائے .... دس کروڑ کی ایک آزاد وخود مختار قوم .... اگرچہ وہ فوراً کاملاً خود مکتفی نہ ہو یا صنعتی اعتبار سے کسی قدر پیچھے بھی ہو پھر بھی مشکل ہی سے بدتر معاشی موقف میں رہے گی۔ بمقابلہ اس کے کہ اس قوم کے افراد غیر منظم اور منتشر ہوں اور پچیس کروڑ ہندوؤں کے غلام رہیں جن کا واحد مقصد ان کو اپنے ناجائز استحصال اور معاشی دستبرد کا شکار بنانا ہے۔ عہد نامہ دار سائی کے ہوتے ہوئے کسی یورپین کی کیا مجال ہے کہ پاکستان کو معاشی طور پر ناممکن حقیقت قرار دے۔ یہ میرے لیئے ناقابل تصور ہے۔ وہ بڑے دماغ جنھوں نے یورپ کو غیر متجانس اور متخالف مصنوعی حدود میں تقسیم کردیا۔ وہ ہمارے معاملہ میں معاشیات کے عذر لنگ کا حق نہیں رکھتے خصوصاً جبکہ ہمارا مسئلہ نہایت سیدھا سادہ ہو۔ الجھنوں سے پاک۔

میں ۔ کیا یہی اصول دفاع پر بھی صادق آتا ہے۔

جناح ۔ بیشک! اسی اصول کا دفاع پر بھی اطلاق ہوگا .... میں یہاں پھر ایک سوال آپ سے کروں گا .... افغانستان کس طرح دفاع کا انتظام کرتا ہے؟ ہاں دیکھیئے جواب کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ افغانی اس کے محافظ ہیں۔ بالکل یہی جواب ہمارا بھی ہے۔ ہم ایک ہم آہنگ اور دلیر قوم ہیں۔ جو نہ صرف محنت کے لیئے تیار ہیں بلکہ ضرورت ہو تو جنگ پر بھی آمادہ ہیں۔ پھر آپ ہی بتلایئے کہ دفاع کا

سوال کیا پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ ہمارا مسئلہ دوسری قوموں سے کس باب میں مختلف ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عبوری دور بھی ہوگا۔ ہم برطانوی قوم سے رات کی رات ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں۔ اہل برطانیہ ہی نے یہ گرہ پیدا کی ہے اور ان ہی کو اس سیاسی عقدہ کشائی میں بھی مدد کرنی چاہیئے لیکن اس کو حل کرنے کے قابل بننے کے لیئے انھیں کافی غور و فکر کی ضرورت ہے ہاں مجھے خیال آیا کہ اس مسئلہ میں مجھے آپ کو کچھ دکھانا ہے۔

مسٹر جناح عذر خواہی کرتے ہوئے کمرہ سے باہر چلے گئے اور میں سگریٹ سلگا کر محو انتظار رہا۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ شاید کوئی اہم واقعہ ظہور میں آنے والا ہے یا یہ کہ شاید کچھ نہ واقع ہو۔ میں آپے سے باہر نہ تھا۔ جناح برطانوی پالیسی پر نہایت شدید اور تلخ تنقید فرما رہے تھے (اگرچہ میں نے اس مکالمہ میں ان نقاط تنقید کو نقل نہیں کیا ہے) لیکن بہرحال ان کی جرح و تنقیح نہایت واضح تھی اور ان کے خلاق ذہن کا پتہ دیتی تھی بلکہ یوں کہیئے کہ ان کے ذہن رسا پر صریح دلالت تھی' وہ صرف تلخ کلمات کی ترکیب نہ تھی اور نہ محض نفرت اور اشتعال کا کوئی معجون مرکب تھا۔ جیسے کہ ہندو طرز تنقید میں پایا جاتا ہے۔ یہ تنقید ایک شخص تھی مسٹر جناح کی تنقید اور کسی ہندو سیاستدان کی تنقید میں ایک سرجن اور جادوگر کا سا فرق پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا فیصلہ نشتر تھا لیکن ایک سرجن کا " اہل برطانیہ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ ان کا یہاں کوئی دوست نہیں ہے" مسٹر جناح نے مجھے

مسئلہ پاکستان کے زیر بحث آنے سے پہلے فرمایا "قطعاً کوئی درست نہیں" ایک ہندو مدبر ہوتا تو یہی بات گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا اور بڑی مسرت کا اظہار کرتا۔ جناح نے اسے نہایت خاموشی سے کہا۔ کسی قدر افسوس کے ساتھ۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت ایک کتاب تھی۔

جناح۔ "شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ انگریزوں کو نہایت غور و فکر سے اس موقع پر کام لینا چاہیئے۔ یہ ایک عادت ہے جسے شاید وہ طبیعت کے لئے موزوں نہیں پاتے وہ لاپرواہی اور بے فکری کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ صرف انتظار کرنا چاہتے ہیں .... اس امید میں کہ آخر میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں جب کبھی یہ تکلیف گوارا کرتے ہیں تو پھر خوب تدبر سے کام لیتے ہیں۔ اتنا جتنا کہ کسی قوم کے لئے ممکن ہو سکتا ہے .... ان میں کا ایک بہترین مفکرین اور مدبر .... کم از کم ہندوستانی مسئلہ پر جہاں دیدہ جان برائٹ تھا۔ کیا آپ نے اس کی کوئی تقریر پڑھی ہے؟

میں۔ جب سے ترک مدرسہ کیا ہے میں نے اس کی کوئی تقریر نہیں پڑھی۔

جناح۔ اچھا ذرا اس پر ایک نظر کیجئے۔ اور حسن اتفاق سے اس پر کل ہی میری نظر پڑ گئی۔

انھوں نے کتاب میرے حوالہ کی۔ وہ ایک پارینہ کتاب تھی۔ "جان برائٹ کی تقاریر" جس صفحہ کو کھولا گیا تھا؛ اس میں ایک

تقریر تھی۔ تقریر کی تاریخ ۴ جون ۱۸۵۸ء تھی۔ اس میں سب سے بڑے فصیح البیان رکن دارالعوام کی تقریر کا اقتباس درج ذیل ہے:-

"ہندوستان پر آخر کب تک انگلستان اپنی حکومت کی ٹھانے رہے گا؟ ہے کوئی جو اس سوال کا جواب دے؟ پچاس سال، سو سال، یوں کہئے پانچسو سال سہی۔ کوئی شخص بھی جس میں سمجھ بوجھ کی کوئی جھلک پائی جاتی ہے اس کا یقین کر سکتا ہے کہ اس قدر وسیع ملک اپنی بیس مختلف قوموں اور بیسیوں زبانوں کے ساتھ، مارے باندھے جبراً قہراً ایک سلطنت اور واحد مملکت کی صورت میں قایم رہے گا .... میں تو اس کو قطعی ناممکن تصور کرتا ہوں۔"

میں نے یہ دیکھنے کے بعد کتاب انھیں واپس کر دی۔

جنرل ح۔ مسٹر برائٹ نے جو کچھ اس وقت کہا تھا آج بھی ایک حقیقت ہے بلکہ آج زیادہ حق بجانب ہے۔ اگرچہ آج زور بیس قوموں پر اس قدر نہیں دیا جا رہا ہے۔ جس قدر دو قوموں پر۔ یعنی ہندو اور مسلم! کیوں وہ حقیقت آج زیادہ واضح اور وزنی تر ہے۔ کیوں انقلابات زمانہ نے ہمیں زیادہ متحد نہیں کیا ...... اس لئے کہ مسلمان بیدار ہو گئے ہیں .... وہ صورت حال کو سمجھ گئے ہیں .... تلخ تجربات کے بعد انھیں اس کا خوب اندازہ ہو گیا ہے کہ ایک متحد ہندوستان میں ہندو ان کے ساتھ

کیا سلوک کریں گے "

ایک وحدانی ہندوستان کے معنی ہندو غلبہ کے ہیں۔ اس کے صرف یہی معنی ہیں اور بس۔ آپ کوئی اور مفہوم اس سے پہنانا چاہیں تو وہ صرف ایک توہم ہوگا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں وحدانی ہند ایک برطانوی کرشمہ ہے ...... محض ایک انتظامی وحدت ہے جس پر ایک سامراجی نظام تلوار کے زور سے مسلط ہے۔ بس یہ ہے وحدتِ ہند کی کل حقیقت ......

اس کے علاوہ اس کا کسی اور واقعاتی صورت میں کوئی وجود نہیں۔

میں - عجیب! آپ کے حریف یہ کہتے ہیں کہ پاکستان خود ایک برطانوی کرشمہ ہے۔ گویا یہ تفریق کرو اور حکومت چلاؤ" کا ایک نیا اطلاق ہے جو برطانوی سیاست کاری پر دلالت کرتا ہے۔

جناح۔ (کسی قدر جوش کے ساتھ) جو شخص ایسا کہتا ہے وہ میری دیانتداری تو الگ رہی، برطانوی ذہنیت کو بھی نہیں سمجھتا برطانیہ کو ہندوستان میں جو واحد چیز روکے ہوئے ہے وہ متحدہ ہندوستان کا یہی غلط تصور ہے جس کا گاندھی جی پرچار کیا کرتے ہیں۔ متحدہ ہندوستان ایک برطانوی کرشمہ ہے۔ میں اس کو مکرر بیان کرتا ہوں کہ یہ ایک بے اصل فسانہ ہے۔ اور وہ بھی نہایت خطرناک۔ جو نہ ختم ہونے والی جنگ و جدال کا دروازہ کھولتا ہے۔ جب تک یہ جنگ و جدال جاری ہے برطانیہ کو اپنے قیام کے لئے بہانہ ہاتھ آتا رہے گا۔

میں - آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ "تقسیم کریں اور چل دیں"

جناح۔ آپ نے اس کو بڑی خوبی سے بیان کیا۔

میں ۔ کیا یہ برطانوی رائے دہندوں کے لئے نہایت تلخی کا باعث نہ ہوگا۔
جناح ۔ الحق مرٌ (سچائی ہمیشہ تلخ معلوم ہوتی ہے) لیکن خاص طور پر یہ حق اس قدر تلخ کیوں ہے؟
میں ۔ کیوں کہ عام طور پر شائستہ اور اوسط طبقے کے کھلے دل والے لوگ رائے دیتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ برطانیہ اپنے معاہدات کی تکمیل کریں اور ہندوستان کو اقتدار بخشے۔ انھوں نے کانگریسی نقطۂ نظر کے سوا کچھ نہیں سنا۔ مسلمانوں کا مغرب میں کوئی بھی ترجمان نہیں۔
جناح ۔ (تلخ انداز میں) میں اس کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں۔ ہندوؤں کے صحافت اور اشاعت کا بڑا زبردست انتظام کیا ہے۔ کانگریس اور مہاسبھا کو بڑے بڑے سرمایہ داروں اور کاروباری اصحاب کی بڑی مالی امداد اور سرپرستی حاصل ہے۔ ہم اس سے محروم ہیں۔
میں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ باہر کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس اور ہندوستان ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ کانگریس ہندوستان کے ایک اور ناقابل تقسیم ہونے کی تکرار سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتی۔ ان کا خیال یہ ہو گیا ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی ہر کوشش غیر روادارانہ اور ایک رجعت پسندانہ گناہ ہے۔ باہر کی دنیا میں سنجیدگی سے یہ خیال ذہن نشین ہو گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ہموطن فریب خیال میں مبتلا ہیں لیکن ایسی عمومیت جیسی کہ ہماری ہے ایسی پیچیدہ اور گنجلک تنقیحات کے باب میں

مغالطہ ہی میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ جو کچھ انھوں نے سیکھا ہے وہ یہی ہے کہ وسیع القلبی اور انصاف پسندی، کا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو چھوڑ دیا جائے اور عنان حکومت حوالہ کر دیجائے . . . . . .

جناح ۔ آپ اتنا اضافہ اور فرمائیں کہ سلامتی کی تنہا روش ۔

میں اور جناح :۔ پاکستان ہے اور بس ۔

۳

پاکستان کا خلاصہ . . . . . . کم از کم پاکستان کی روح مندرجہ بالا مکالمہ میں پائی جاتی ہے۔ ساری تفصیلی تنقیحات کا اظہار اس حجم کی کتاب میں ممکن نہیں ۔ اس کے لئے نقشہ جات اور اعداد و شمار کا ایک دفتر مطلوب ہے ۔ یہہ ہمیں ہندوستان کے سرحدوں پرے لے جائے گا شاید ہم بہت سے غیر مفید تصورات میں الجھ کر رہ جائیں ۔

ہاں یہ بات قطعی ہے کہ جو شخص تعصب سے خالی الذہن ہو کر اس معاملہ کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ پاکستان کی راہ میں ناقابل عبور موانعات نہیں ہیں ۔ نہ معاشی نہ نسلی و قومی نہ سیاسی اور نہ عسکری بلکہ مقابلتہً اس مسئلہ کا حل کسی قدر سہل تر محسوس ہوگا۔ ان صدہا مشکل تر مسائل کے مقابلہ میں جن کو دنیا نے پچھلے پچاس سال میں حل کیا ہے بلا شبہہ یہ ایک بہت بڑا آپریشن ہے لیکن افراد اور قوموں کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جبکہ ایسے اہم اپریشن نہ صرف قابل قبول بلکہ قطعی ناگزیر ہوتے ہیں ۔ یہہ صورت بھی ایسے ہی مواقع میں سے ایک ہے ۔ ہندو اور مسلم تفریق ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے جسے اجتماعی جسد میں ایک سرطانی زخم سے تشبیہہ دیجا سکتی ہے ۔

سرطان کا علاج .... خصوصاً جب وہ کافی بڑھ گیا ہو تو ...... صرف
ایک ہی ہے .... یعنی فوری اور تیز نشتر .... گاندھی جی کا
نفسیاتی علاج ...... برطانوی شربت ...... غیر مستند پٹکلے سب
لاحاصل ہیں یہ سب مریض کے حالات اور مرض کو بد سے بدتر بنا دیں گے۔ آخر میں
پھر نشتر و جراحی پر آنا ہی پڑے گا۔ لیکن وقت پر ایک استادانہ ہاتھ کا چلا ہوا
نشتر بہتر ہے۔ بعد کے ہزاروں بے قاعدہ اور بے وقت کے نشتروں سے۔

مقام تعجب، پاکستان کے مختلف فیہ مسئلہ میں یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت
شناسوں کے حلقہ میں قبول عام حاصل کرتا جا رہا ہے بلکہ حیرت انگیز پہلو یہ ہے
کہ ابھی تک ہندوستان کے خیراندیشوں کے بعض حلقوں میں اس کی مخالفت کی
جا رہی ہے۔ یہ دراصل کانگریس کے مسلسل پروپیگنڈا کی طاقت پر منحصر ہے جس
کے پیچھے بڑے بڑے ہندو سرمایہ داروں کی پشت پناہی ہے۔ یہ پروپیگنڈہ تو ہندوؤں
کا اجارہ ہے مسلسل اور محکم پرچار اور ایسا رہا ہے انھوں نے دنیا کو یہ باور کرا دیا
ہے کہ ہندو اور ہندوستان ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ اور تقسیم ہند
کی کوئی سی تجویز بھی ایک شیطانی تجویز ہے۔ یہ برطانوی طاقت کی حد تک تقسیم
کرو اور حکومت چلاؤ کے اصول پر عمل ہی کی ایک صورت ہوگی۔

مغرب کے بڑے بڑے وسیع النظر لوگ اس پروپیگنڈا کا بری طرح
شکار ہو چکے ہیں۔ انجام کار برطانیہ کے صف اول کے مدبرین کا منظر ہے جو پارلیمان
میں اسی پروپیگنڈے کے تاثر سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور پوری قوت
و اخلاص سے اس ہندوستانی وحدت کی وکالت کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ہندوستان
کی آزادی کے مطالبہ کے ساتھ شاید انھیں اس کا شعور نہ رہتا ہو کہ یہی نام نہاد
وحدت ہے جو برطانیہ کے اقتدار کا آلہ کار رہے۔

متحد رکھو اور حکومت کرو۔
تقسیم کرو اور چھوڑ دو۔
یہ الفاظ ہر اس شخص کی میز پر پیش نظر ہونے چاہئیں جو ہندوستانی مسئلہ پر اظہار رائے کرتا ہے۔

کانگریسی پروپیگنڈے کے غیر معمولی اثر کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ایسے کئی مردوں اور عورتوں پر اس کا جادو چل گیا ہے جو دوسرے ممالک میں اقلیتوں پر ظلم سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن باستثنار ہندوستان۔ وہ فوراً ایک کمیٹی منعقد کریں گے اگر سلاویک والوں کا کوئی معاملہ ہو، رومانیہ میں ہنگری والوں کے کسی مسئلہ پر وہ پریشان دل ہو جاتے ہیں یا شمالی اٹلی میں آسٹریا والوں پر کسی زیادتی کا ذکر ہی کیوں نہ ہو ان پر شدید اثر ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے حقوق کے باب میں ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی جن کا ادعائے استقلال و جداگانہ قومیت، زیادہ قدیم اور زیادہ عاجلانہ حل کا طالب ہے۔ اگر یہ لوگ مسلمہ طور پر مخلص نہ ہوتے تو نسلی امتیاز پرستی کے لئے مورد الزام قرار پا سکتے۔

کاش یہاں گنجائش ہوتی کہ میں اُن نتائج کا ذکر کرتا جو برطانیہ کی طرف سے تقسیم کرو اور چھوڑ دو کی پالیسی اختیار کرنے پر ظہور میں آتے۔ میرا یقین واثق ہے کہ یہ نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ برطانیہ اور ساری انسانیت کے لئے مبارکباد کے قابل کارنامہ ہوگا۔ یہ زمانہ کی ترقی کا ایک قدرتی اقدام ثابت ہوگا۔ اور دنیا کے پہلو کو خطرناک کانٹوں سے بچائے گا۔

اگر اس کو صاف واضح غیر مبہم، بغیر کسی لین دین کے عمل میں لایا جائے تو برطانیہ کے لئے سنہری مواقع اور ثمرات پیدا کرے گا نہ صرف تجارتی میدان میں

بلکہ روحانی حلقہ میں بھی یہ عمل عظیم الشان اسلامی دنیا کے ساتھ برطانوی روابط کو مستحکم تر کرے گا۔ اگر ہم اعتراف حقیقت کے لئے تیار رہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی دنیا کے ساتھ ہمارا بہت ہی قریبی اور گہرا ربط ہے۔

ایک دوست نے جنھوں نے اس باب کا مطالعہ کیا اس پر حسب ذیل تنقید فرمائی۔

جناح کا نقطۂ نظر جسے آپ نے بتایا ہے، مدلل اور مسکت معلوم ہوتا ہے لیکن وہ کس حد تک اسلامی ہند کی رائے کی نمایندگی کرتے ہیں؟ کیا مسلم لیگ اسلامی ہند کے مترادف ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر پاکستان کی جیت ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ جماعت کی رائے اس کی مخالف ہے تو پھر آپ کا سارا استدلال بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک اہم نقطۂ بحث ہے۔ یہ جواب کا مستحق ہے۔ مختصر طور پر اس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

اگر مسلم لیگ ہندی مسلمانوں کی نمایندگی نہیں کرتی تو نہایت نرمی سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر کون مسلمانان ہند کی نمایندگی کرتا ہے؟ اگر کوئی دوسری تنظیم ہے جو اس باب میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمایندگی کے حق کے معاملہ میں چیلنج دے سکتی ہے تو وہ کونسی جماعت ہے؟ اور کہاں روپوش ہے؟

اگر مسلم لیگ کی ذرا سی بھی قابل لحاظ مخالفت کا شائبہ ہے تو کانگریس آخر اس کے وجود سے کیوں ناواقف ہے؟ کانگریس اپنی شکایات کا نشانہ اس قدر تلخی کے ساتھ آخر لیگ ہی کو کیوں بنائے ہوئے ہے؟ آخر کانگریس کیوں اس بات کا مسلسل اظہار کرتی رہتی ہے کہ اسے لیگ سے معاملات نبٹنے ہیں؟ آخر گاندھی جی اپنا سارا سندیس، اپنا سارا پرچار، اپنی ساری

دہائی جناح ہی کے لئے کیوں صرف کرتے ہیں جو لیگ کے قائد اعظم ہیں۔

جواب صاف اور کافی ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ مسلم لیگ ہی اسلامی ہند ہے۔ مخالفانہ آوازہ اسی لئے بے اثر ہے کہ مسلمانان ہند کے اجتماعی منصوبہ کا اعلان اور اظہار صرف لیگ ہے۔ ان کے لئے جو اعداد و شمار کے طالب ہیں۔ اعداد و شمار ضرورت سے زیادہ تشفی بخش ہیں ہاں صرف ایک استثناء[1] کے علاوہ۔ ہر ذیلی انتخاب میں جو پچھلے سات سال میں ہوا۔ لیگ ہی کے نمائندہ کو کامیابی ہوئی۔ وہ صدفی صد حامی پاکستان تھے۔ ہر ابہام شک و شبہ سے بالاتر۔ انھوں نے ہی بازی جیت لی۔ ہر وقت ہر جگہ خواہ بنگال ہو، آسام ہو، شمال مغربی صوبہ ہو یا سندھ ہو۔ ہر وہ صوبہ جو پاکستان کا جزو بن کر رہے گا۔ خود مرکزی مقننہ میں تیس مسلم نشستوں میں سے ۲۸ پر کٹر لیگی قابض ہیں۔

اگر یہ مسلمانوں کی مرضی کا اعلان نہیں ہے تو پھر تحقیق کرنی پڑے گی کہ آخر مسلم قوم کی مرضی کیا ہے؟ اور کس طرح معلوم کی جا سکتی ہے؟

---

[1] صرف ایک نادر صورت یوپی میں پیش آئی جہاں باہمی شخصی رقابت نے معاملہ کو الجھا دیا

چوتھا باب

بھوک

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ انگریز ان مسائل سے کس طرح رو براہ ہو رہے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا منشا یہ نہیں ہے کہ کوئی عمومی اور ہمہ گیر قسم کا تبصرہ کیا جائے لہٰذا بہتر ہوگا کہ ہم اپنی توجہ اس ایک واقعہ پر مرکوز کر دیں جس نے وسیع پیمانہ پر تمام دنیا کی توجہات کو اپنی طرف جذب کر لیا ہے۔

اس موضوع کو بحث کے لئے منتخب کرنے کے متعدد وجوہ ہیں۔ سب سے پہلی اور سب سے زیادہ قوی وجہ تو یہ ہے کہ یہ واقعہ اس قدر ہولناک اور جگر خراش تھا کہ دنیا کے ذہن میں مسلسل اس کی یاد تازہ رکھنا ضروری ہے۔ ہر برطانوی اور ہندوستانی مدبر کا فریضہ ہے کہ وہ ہر سال موسم گرما کے آغاز میں ۱۹۴۳ء کے ان ہولناک واقعات کی یاد تازہ

کر لیا کرے کہ کہیں پھر ان روح فرسا حادثات کے اعادہ کا امکان باقی نہ رہے۔

لیکن اس کے سوا ایک دوسری وجہ بھی ہے جس کی بنا پر اس حزنیہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انگلستان اور دوسرے ممالک میں کثرت سے لوگوں کی رائے ہے کہ یہ حادثہ برطانیہ کے تاریخی کارناموں میں ایک بدنما داغ ہے۔ برطانیہ کے گرم جوش مگر آلودہ رائے عوام جنھیں عام طور پر اپنے سر الزام لے لینے میں لطف آتا ہے واقعات کی سرسری طور پر بھی جانچ کرنے کی تکلیف گوارا کیے بغیر یہ آواز بلند کرنے میں پیش پیش رہے کہ "قصور ہمارا ہے"۔ جو لوگ بنگال کے طرز حکومت سے واقف ہوتا تو کبھی نقشہ میں بنگال کا محل وقوع بتانے سے بھی قاصر ہوں گے انھوں نے کانگریسی پروپیگنڈہ بازوں کے ہر شرمناک سے شرمناک الزام کی تائید میں آواز بلند کی اور یہ باور کر لیا کہ مقامی برطانوی عہدہ داروں نے جو بیانات دیئے ہیں محض جھوٹ ہیں۔ برطانوی جامعات میں جو ہندوستانی طالب علم زیر تعلیم ہیں اور جو لازماً واقعات سے بالکلیہ بے خبر ہوں گے، ان کی باتوں کو الہام کی طرح باور کر لیا گیا۔ اور بیس بیس سالہ تجربہ رکھنے والے برطانوی عہدہ داروں کے بیانات کو صدا بصحرا سمجھا گیا۔ یہ اس قومی خصوصیت کی ایک بین مثال ہے جسے عام طور پر انصاف پسندی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کے مواقع پر اسے مرض کہنا بیجا نہ ہوگا۔

بہرحال اس باب کے لکھنے سے ہندوستان میں برطانیہ کے تدبرینا کی کسی جماعت کی حمایت میرا مدعا نہیں ہے بلکہ قابل رحم عوام کی حالت بیان کرنا مقصود ہے جن کے مصائب کو مقامی نزاعات کی گرما گرمی میں تقریباً

فراموش کر دیا جاتا۔

۴

◦ بھوک نہایت دردناک طریقہ پر انسان کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے

بھوک میں ایک دُبلے پتلے بچّہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ پورے جسم میں سے معدہ علیحدہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ گویا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیالی غذاؤں سے بھر کر پھول گیا ہے۔ بنگال میں بھوک کے جو دردناک نقشے نظر آتے تھے اُن میں سب سے زیادہ دردناک نقشہ بچّوں کا ہوتا تھا جب وہ بھوک سے چکرا کر اُلجھ اُلجھ کر سڑکوں پر گرتے تھے تو ان کے چہرے کھنچی ہوئی نقاب اور ان کے ہاتھ پانوں درخت کی مرجھائی ہوئی شاخوں کی طرح معلوم ہوتے تھے لیکن ہیبت ناک معدے ہمیشہ پھول کر سامنے کی طرف نکلے ہوئے ہوتے تھے گویا کہ اپنی دردانگیز حالت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

فاقہ کا یہ عجیب و غریب اثر بڑے آدمیوں میں دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے معدوں کا وجود ہی نہیں ہے۔ نیچے کی پسلیوں سے زانو تک خاکستری چمڑے کا ایک پیوند معلوم ہوتا تھا لیکن بھوک نے جس طرح نقشہ بگاڑا تھا اس کے تمام آثار ان کے جسموں پر بھی نمایاں تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کارٹون میں جان ڈال دی گئی ہے۔ گزشتہ چند سال میں ہماری نظروں سے بہت سے پوسٹر گزر رہے ہیں جن میں یورپ کے مفتوحہ ممالک کے مظلوم اور مصیبت زدہ لوگوں کی حالتیں بتائی جاتی ہیں اور ہماری نگاہیں ایسے نقشے دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں جن میں مائیں جو خشک ہو کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی ہیں مرتے ہوئے بچّوں کو بازوؤں میں لئے دکھائی دیتی ہیں یا جوان جوان مرد

اور عورتیں جن کا گوشت پوست ایک ہو کر ہڈیوں سے جا لگا ہے سنسان آسمان کی طرف بے نور آنکھوں سے ٹکٹکی لگائے دیکھتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں کلکتہ کا بھی بالکل یہی نقشہ تھا۔ آپ ان تصویروں کو دیکھ کر اپنے دل میں یہی کہتے رہے کہ یہ حقیقی نہیں ہیں بلکہ کوئی خوفناک قسم کا تماشا ہے جس کے خاکے بڑھا چڑھا کر لئے گئے ہیں۔ خیال ہوتا تھا کہ آخر رخساروں کی ہڈیوں کی نوکیں اس طرح کیسے نکل آتی ہیں، پسلیاں کیسے اس طرح الگ الگ نظر آسکتی ہیں اور دُبلے پتلے ڈھانچوں کے کندھوں پر سے لٹکتے ہوئے کپڑے کیسے اس قسم کا ہولناک منظر پیش کر سکتے ہیں۔

ہاں واقعی یہ حقیقت نہیں بلکہ نقل ہے لیکن بڑی سخت اور دردناک قسم کی نقل! اور حقیقت تو یہ ہے کہ کسی ناٹک میں نقل پیش کرنے والا بھی اتنی ہولناکیوں کو جمع کر کے دکھانے کی جرارت نہ کر سکے گا۔

مثالاً چوہوں ہی کو لیجئے۔ اگر کسی ناٹک کا کھیل یا سینما کے فلم کا کوئی منظر پیش کیا جاتا تو چوہے اتنی بڑی تعداد میں نہ دکھائے جا سکتے تھے لیکن اگر کوئی شخص رات گئے چورنگی (کلکتہ کا ایک بازار) کی کمانوں کے نیچے کھڑا ہو کر دیکھتا تو فاقہ زدوں کی لاشوں پر جو بیکسی کے عالم میں ایک دوسرے پر پڑی نظر آتی تھیں چوہے اندھیرے میں پھرتے ہوئے بڑے بڑے کتوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ چند ہفتوں کے بعد تو یہ حالت ہوئی کہ نالیوں میں پڑے ہوئے بدقسمت فاقہ زدہ انسان زندگی کے آخری لمحوں میں حرکت کرتے تو چوہے بالکل نہ ڈرتے تھے اور جب وہ کسی بچہ کے بدن پر سے رینگ کر چلتے تو جلدی سے نہ بھاگتے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر چلتے اور آپ کو ان کی آنکھیں چمکتی نظر آتیں گویا کہ وہ بہ چشم انتظار دیکھ رہے ہیں فلم کا کوئی ڈائرکٹر اس قسم کا فلم منظور کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور اگر وہ ایسا کرتا تو اس پر حقیقت کو مسخ کرنے کا الزام عائد ہوتا۔

تاہم یہ نقل اور تماشا نہ تھا بلکہ روز روشن کی طرح کھلے ہوئے واقعات تھے
کلکتہ جانے سے پہلے مجھے جو قصے سنائے گئے تھے ان میں سب سے زیادہ ناقابل
یقین یہ قصہ تھا کہ لوگ جھوٹا پھینکا ہوا کھانا لینے کے لئے کوڑے کی کونڈیوں
کے گرد جمع ہو کر جھگڑتے ہیں۔

یہ قصہ اخبارات میں کثرت سے شائع ہوا اور ایسی جگر خراش تفصیلات
کے ساتھ کہ بالکل گپ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنے کلکتہ پہنچنے
کے چند ہی گھنٹہ بعد اس قصہ کو اپنی آنکھوں سے واقعات کی صورت میں گزرتے
دیکھا۔ میں ایک گلی میں گزر رہا تھا کہ میں نے ایک بچہ کی چیخ سنی میں نے منہ موڑ کر
دیکھا تو سڑک کی پٹری پر ایک بچہ گرا پڑا تھا جسے اس کے باپ نے کونڈی کے پاس
سے ڈھکیل دیا تھا اور خود ایک ہاتھ تو گلی سڑی چیزوں کے ایک ڈھیر میں ڈالے
ہوئے تھا۔ اور دوسرے سے اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کو لٹھ جھکڑ کر
ہٹا رہا تھا۔ وہ لوگ تھکے ہوئے جانوروں کی طرح فریادیں کر رہے تھے اور کوڑے
کچرے میں سے ایک آدھ کمردہ سا ٹکڑا اٹھا اٹھا کر ہونٹوں تک لے جاتے تھے۔

۳

میں قحط کی انتہائی شدت کے زمانہ میں کلکتہ پہنچا اس لئے کہ مسز نائیڈو
نے حیدرآباد میں کہا تھا کہ کانگریس کے پچاس سالہ پروپیگنڈے نے برطانوی
راج کے وقار کو اتنا صدمہ نہیں پہنچایا جتنا کہ صرف اس ایک سانحہ نے۔

یہ چیز محتاج بیان نہیں کہ مسز نائیڈو اپنی بیان کردہ حقیقت سے خوش
تھیں بشرطیکہ ان کا بیان حقیقت بھی ہو۔ یہ شرط لگانا اس لئے ضروری ہے کہ
مسز نائیڈو کے بیان کردہ بعض واقعات، جو کانگریسی پروپیگنڈے کا صحیح نمونہ تھے

خود ان کی خوش خیالی کا نتیجہ تھے مثلاً بظاہر ان کو یقین تھا کہ اسباب قحط میں سے ایک بڑا سبب فوج کی حرص تھا لیکن اس چیز کی جانچ کی جائے تو ایک لمحے کے لئے بھی اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے کہ انگریزی فوج کے لوگ چاول نہیں کھاتے اور ہندوستانی فوج کے لوگ تو فوج میں نہ ہوتے تب بھی چاول ہی کھاتے بہرحال نائیڈو خاندان کے دماغوں پر اسی قسم کے واقعات چھائے ہوئے تھے۔ دوسرا سبب ان اطالوی قیدیوں کے لئے فراہمی غذا بتایا جاتا ہے جو صوبہ متوسط میں کسی جگہ نظر بند ہیں۔ مسز نائیڈو کی باتیں سن کر تو ہر شخص کو یقین آجاتا کہ لاکھوں ہندوستانیوں کی موت کے ذمہ دار دراصل اطالوی ہی ہیں۔

میرے ذوق کے لئے یہ چیز گراں ہے کہ اس خاندان کے افراد پر جنھوں نے میرے ساتھ بڑی عنایت کا سلوک کیا ہے تنقید کروں۔ جب میں حیدرآباد سے روانہ ہوا تو مسز نائیڈو کے صاحبزادہ صاحب جو آیورویدک طب کے ماہر ہیں مجھے رخصت کرنے اسٹیشن تک آئے ٹھیک اس وقت جب گاڑی چلنے لگی تو انھوں نے مجھے ایک چھوٹی سی پڑیہ دی۔ میں نے دیکھا تو اس میں تانبے کی ایک تختی تھی جس میں تین سوراخ تھے۔ اس تختی پر ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا جس میں ہدایتیں تھیں کہ اگر اس تختی کو معدہ پر ناف سے تین انچ اوپر لٹکائے رکھا جائے تو ہیضہ سے حفاظت کے لئے جس کا اس زمانہ میں کلکتہ میں زور تھا مفید ہوگا۔ مجھے یہ علاج عجیب وغریب معلوم ہوا چنانچہ میں نے کچھ دن بعد ایک یورپین ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ کیا واقعی یہ کوئی کام کی چیز ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا ممکن ہے یہ گولی سے بچنے کے لئے مفید ہو مگر جہاں تک ہیضہ کے جراثیم کو مارنے کا سوال ہے اس کا لٹکا لینا یا ایک جاذب کا ٹکڑا لٹکا لینا دونوں برابر ہے۔

بہرحال ان چیزوں کے بیان سے قحط زدہ علاقہ کا بیان دور ہوتا جا رہا ہے

اس لئے اب ہمیں ریل گاڑی کے ساتھ تیزی سے بڑھنا اور خود دیکھنا چاہیئے کہ مسنز نائیڈو کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ قحط نے برطانوی راج پر ایک ضرب کاری لگائی ہے۔

ٹرین کلکتہ میں دوپہر سے پہلے پہنچنے والی نہ تھی لیکن علی الصبح جوں ہی میں نے کھڑکی کھول کر سامنے کے اسٹیشن کو جہاں گاڑی کھڑی ہوئی تھی دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم اس ملک میں پہنچ چکے تھے جہاں موت کی گرم بازاری تھی پورے پلیٹ فارم پر جہاں کہیں سایہ کی جگہ تھی زندہ ڈھانچوں کا ہجوم دیکھنے میں آتا تھا جو بالکل خاموش اور بے حس وحرکت سے نظر آرہے تھے۔ کبھی کوئی بچہ بے چین ہوکر ہاتھ پانوں ہلاتا یا ان ڈھانچوں میں سے کوئی اپنے کھانے کا خالی برتن جو اس کے ہاتھ میں ہوتا آہستگی سے اُٹھا کر اس کے اندر دیکھتا گویا کہ معجزانہ طور پر اس میں سے کھانا مل جانے کی توقع کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی ٹھیک میرے ڈبہ کے سامنے برتن میں اپنی انگلی ڈال کر چاروں طرف پھراتی رہی اور پھر اُسے چوسنے لگی۔

میں برنارڈ شا کے اُن ہم خیالوں میں سے نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ فقیروں کو خیرات دینا غلط طریقہ ہے اس میں کلام نہیں کہ اعلیٰ معیاری سوسائٹی میں انفرادی طور پر خیرات دینا بیکار سی چیز ہے لیکن چونکہ ابھی سوسائٹی کا معیار اتنا بلند نہیں ہوا ہے اس لئے امداد کے ذرائع موجود ہوتے ہوئے کسی کی مصیبت کو نظر انداز کر دینا تو بڑی بے رحمی ہے۔ کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ایسے حالات میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی شخص سوال کرتا تو وہ اس کی امداد کرنیکی بجائے معاشیات پر لکچر دینا شروع کر دیتے۔

اس لئے جب چھوٹی لڑکی برتن میں اپنی انگلی پھرانے لگی تو میں نے اپنا

سوٹ کیس کھولا اور اس میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر دیکھنے لگا کہ کوئی چیز جو لڑکی کے کھانے کے قابل ہو مل جائے۔ نتیجہ زیادہ خوش گوار نہیں نکلا اور زبان کے ایک چھوٹے سے ڈبے، ٹماٹر کے عرق کی ایک بوتل، مچھلی کے ایک ڈبے، ڈبے میں بند کیئے ہوئے تھوڑے سے مٹر کے سوا کچھ دستیاب نہ ہوا۔ تاہم کچھ نہ ہونے سے تو کچھ ہونا غنیمت تھا۔ اس کے ساتھ روپیہ دو روپیہ اور دیا جاسکتا تھا۔

میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن حسب معمول وہ اٹک گیا میں نے زور لگایا۔ میرے قلب میں تقاضا تھا کہ اس چھوٹی لڑکی کو کھانا دے دینا ضروری ہے۔

میرے ساتھ ڈبے میں ایک خوش رو ہندو نوجوان سفر کر رہا تھا۔ جو گزشتہ شب رات گئے گاڑی میں سوار ہوا تھا اور اوپر کی برتھ پر چڑھ گیا تھا اس نے مجھے زور کرتا دیکھ کر پوچھا کہ کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آیا، دروازہ کے پاس آیا اور میرے پاس ٹین کے ڈبے دیکھ کر رُک گیا اور پوچھنے لگا۔

کیا آپ چاہتے تھے کہ یہ چیزیں باہر اسٹیشن کے لوگوں کو دیں۔
میں نے جواب دیا کہ ہیں میرے پاس یہی ہے۔
اس نے کہا یہ کچھ سود مند نہ ہوگا یہ لوگ یہ چیزیں نہیں کھا سکتے۔
میں نے کہا میں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ جو کچھ ملے گا کھا لیں گے۔
اس نے سر ہلا کر جواب دیا کہ نہیں یہ لوگ صرف چاول کھاتے ہیں۔
میں نے چھوٹی لڑکی کو بتا کر کہا کہ کم از کم اسے تھوڑے سے مٹر دیئے جاسکتے۔

اس نے کہا بات تو وہی ہے۔

میں نے کہا میں چاہتا تھا کہ دروازہ کھل جاتا میں کچھ روپیہ دینا چاہتا ہوں۔

اس نے جواب دیا کہ وہ لوگ روپیہ سے کیا خریدیں گے۔ یہاں کوئی کھانا نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ اسٹیشن پر جمع ہیں کہ گاڑی میں سوار ہو کر کلکتہ چلیں۔ گاڑی نے حرکت کی اور ٹھیک اسی وقت دروازہ خود بخود کھل گیا ابھی اتنا وقت تھا کہ میں اپنے ہمدردانہ تحائف ہاتھ بڑھا کر دے دیتا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے یہ کوشش کچھ بے کار سی معلوم ہوئی کھڑکی کے سامنے سے خاموش ڈھانچوں کی قطاریں جب نظروں سے گزر رہی تھیں تو میرے دل میں سوال پیدا ہونے لگا کہ کیا آسمان سے معجزانہ طور پر من و سلویٰ کی ایک سخت طوفانی بارش کے سوا ان کے لئے اور کوئی خدمت کچھ بھی مفید ہو سکتی ہے۔

میں اپنے ہندو دوست کی طرف مڑا اور اس سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ چاول کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔

اس نے جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ لفظ بلفظ صحیح ہے کھانے سے ان کی مراد چاول ہی ہے اور کچھ نہیں۔ ان کے لئے نہ گوشت کھانا ہے، نہ مچھلی نہ انڈے، نہ آلو، نہ کوئی اور غلہ، جوار یا باجرا جو کسی طرح سے چاول سے ملتا جلتا ہے وہ تو اول و آخر صبح، دوپہر، شام، رات، ہر وقت چاول چاہتے ہیں۔ اگر آپ انھیں کوئی چیز دیں تو ان میں سے بہت سے تو یہ بھی نہیں جانیں گے کہ یہ کس کام آتی ہے اور اگر وہ اسے کھا بھی لیں تو انھیں موافق نہیں آئیگی آپ چاول کھانے والوں کو چاول کے سوا کوئی اور چیز کھانے کو دیں تو وہ معدہ کے طرح طرح کے امراض مثلاً اسہال وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہ نوجوان ہندو ایسا رفیق سفر ثابت ہوا جس سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ وہ خود محکمۂ اغذیہ کی کسی شاخ میں ملازم تھا۔ غذا کی قلت کے متعلق اس نے مجھے ایک بات بتائی جو ایسی عجیب و غریب معلوم ہوئی کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ فسانہ گوئی پر اتر آیا ہے۔ لیکن بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ بہر حال اس کے بیان کردہ قصہ کا خلاصہ یہ تھا۔

یہ قصہ آبادی کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ گزشتہ بارہ سال کے دوران میں ہندوستان کی آبادی میں چھ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے (اگر کوئی اوسط درجہ کا انگریز غور کرے کہ یہ تعداد سلطنت برطانیہ کی پوری سفید فام آبادی کے تقریباً مساوی ہے تو وہ چونک پڑے گا۔ اور اسے سامنے افق آسمانی پر طرح طرح کے خطرات کے بادل منڈلاتے نظر آنے لگیں۔ یہی حال ممالک متحدہ کے کسی اوسط درجہ کے باشندے کا ہوگا) لیکن صوبہ بنگال کی آبادی میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ تیز رفتاری سے اضافہ ہوا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں۔ اس کی وجہ وہی ہے جسے اوپر عجیب و غریب کہا گیا ہے۔ اور وہ سبب یہ ہے کہ اس صوبہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی تقریباً اتنی متوازن ہے کہ تمام والدین دیوانہ وار اس فکر میں رہتے ہیں کہ ہر قیمت بچے پیدا کئے جائیں۔ اس کی پرواہ نہیں کہ بچے کھائیں گے کیا؟ پہنیں گے کیا؟ انھیں کوئی ملازمت ملے گی یا نہیں؟ ان کی آئندہ زندگی خوشحالی کی ہوگی یا بدحالی کی؟ جس چیز کی فکر ہے وہ یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرے بچہ کی جلد سے جلد آمد کی تیاری ہونی چاہیئے گویا مسلمانوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ہندوؤں کے نزدیک وشنو کی خوشنودی کا یہی طریقہ ہے۔

اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ ہندوستان میں اعداد و شمار کا مسئلہ اتنا سادہ نہیں جتنا دنیا کے کسی اور ملک میں ہے یہاں اعداد کے پس پشت جادو کا کام کرتا ہے اور اگر آپ ان پر غور کرنے بیٹھیں تو دیکھیں گے کہ آبادی کے اعداد اپنے عجیب و غریب اور متنوع اختلافات کی صورت میں کہیں رقص کرتے اور کہیں ٹمٹماتے نظر آئیں گے۔

اب میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میرا کلکتہ کا سفر کئی طرح پر میری معلومات میں اضافہ کے لئے مفید ہوگا۔

آخر کلکتہ پہنچے۔ اب ہر جگہ اور ہر وقت بھوک کی بگاڑی ہوئی صورت کا وہ نقشہ تھا جس کا ہم نے اس باب کے شروع میں ذکر کیا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ سوسائٹی کے ہر شعبہ میں اس کا اثر سرایت کئے ہوئے ہے۔ کلکتہ میں آمد کے ابتدائی دنوں میں میں ایک نوجوان کے ساتھ جو امدادی طعام خانوں میں ملازم تھا، میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے گیا۔ وہ ایک نئی وضع کے سجے سجائے مکان میں رہتا تھا۔ اس صحبت میں شائستہ اور ممتاز حیثیت کے لوگ شریک تھے اور بڑی مزیدار شرابیں موجود تھیں۔

اس نوجوان نے کہا کہ اس گھر میں چاول بالکل نہیں کھائے جاتے قحط شروع ہونے کے بعد سے میں نے اپنے باورچی کو کہہ دیا ہے کہ چاول ہرگز نہ خریدے جائیں، اور ٹھیک اسی وقت بٹلر ایک کشتی میں ایک قسم کی مچھلیاں اور روسٹ لئے ہوئے داخل ہوا۔ اس میں اس کا قصور نہ تھا۔ یہ مچھلی باہر بھوک کے مارے ڈھانچوں کے کام کی چیز نہ تھی تاہم فاقہ سے بگڑی ہوئی صورتوں کا احساس دماغ میں بری طرح مسلط تھا۔

ہر جگہ یہی حالت تھی جس دوست کے ساتھ میں ٹھہرا ہوا تھا انھوں نے

کچھ سنہری مچھلیاں پال رکھی تھیں۔ پیچھے پر بیٹھے ہوئے ان کو تیرتے ہوئے دیکھنا بڑا اچھا معلوم ہوتا۔ ایک روز میں نے میز پر مچھلیوں کے برتن کے قریب ایک پیکٹ رکھا ہوا دیکھا جس پر لکھا تھا "سنہری مچھلیوں کی بہترین غذا" ذہن میں جس تقابل کا خیال آسکتا تھا وہ محتاج بیان نہیں کہ ایک طرف تو سنہری مچھلیاں ہیں جنھیں خوب غذا ملتی ہے اور دوسری طرف فاقہ زدہ بچے۔ اب دماغ کی حالت یہ ہوئی کہ آفت زدہ اور پریشان خیالات آنے شروع ہوئے جس میں صاف ستھری اور سپھرتیلی مچھلیاں بھی بگڑی ہوئی نظر آنے لگیں۔

تمام بڑے بڑے بازاری مقامات پر ہوٹل اور کھانے کی دکانیں تھیں اُن سے باہر دیواروں سے لگے ہوئے، نالیوں میں پڑے ہوئے سڑک کی پٹری پر لیٹے ہوئے خاموش ڈھانچے نظر آتے تھے۔ اگر آپ انگلستان کو اپنے گھر بھیجنے کے لئے کچھ چاکلیٹ خریدنا چاہتے تو آپ کو ان کے اُوپر سے چھلانگ کر جانا پڑتا۔ مجھے بھی ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز کس قدر دردناک اور تکلیف دہ تھی چند روز کے بعد تو کھانے پر نظر ڈالنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے پہلی مرتبہ انفرادی طور پر خیرات دینے کی جو کوشش کی تھی وہ تو ناکام رہی۔ ایک روز پیچھے پر سے جہاں میرے دوست کی سنہری مچھلیاں رکھی رہتی تھیں ہم نے باہر سڑک کی پٹری پر ایک عورت کو دیکھا کہ لمبی لمبی اوندھی پڑی ہوئی ہے اور ایک بچہ اس کی بغل میں ہے دونوں کے دونوں تقریباً ننگے تھے۔ دونوں کی حالت انتہائی فاقہ زدگی کی وجہ سے ایسی ہوگئی تھی کہ ان کی پیٹھ پر سے چمڑے کو لے کر کپڑے سے جھنجھوڑ

کی طرح لپٹیا جا سکتا تھا۔ ہم چائے پینے کے لئے بیٹھ رہے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھکر
میں نے خانساماں سے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ باہر ایسے لوگ سامنے پڑے ہوں
اور ہم یہاں بیٹھ کر چائے پئیں۔ چنانچہ ہم نے کیک میں سے دو ٹکڑے
کاٹے ایک چمبو میں چائے انڈیلی۔ کچھ پھل اور دو ایک ایک روپئے کے نوٹ
لئے اور خانساماں کو دے کر نیچے بھیجا۔ وہ لے کر گیا اور ہم اوپر سے نتیجہ
دیکھنے لگے۔

عورت کو اٹھ کر بیٹھنے کے لئے کئی منٹ لگے۔ اس کے بعد بالکل
آہستہ آہستہ اس نے کیک اٹھا لیا۔ سونگھا اور پھر نالی میں گرا دیا جہاں اُسے
دیکھ کر دو کوے اس پر جھپٹے اور اپنا لقمہ بنا گئے۔ اس عرصہ میں بچہ نے بھی
ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اس نے بھی کیک لے لیا اور اسے سونگھا۔ اب یہ معلوم
ہو رہا تھا کہ وہ اسے کھانے کا ارادہ کر رہا ہے لیکن اس نے اسے اپنی ننھی ننھی
انگلیوں سے مسل ڈالا۔ چائے لینے سے تو انھوں نے قطعاً انکار کر دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد عورت نے بے پروائی سے پھل اٹھا لیا اور اُسے
روپیہ روپیہ کے دو نوٹوں کے ساتھ میلے کچیلے چیتھڑوں کی ایک پوٹلی میں
باندھ لیا۔ یہ سب کام بہت آہستہ آہستہ ہوا۔ ایک گھنٹہ کے بعد بھی وہ ان
چیتھڑوں میں اسی طرح انگلیاں مارتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد بڑی
مصیبت سے وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے چلے گئے۔

دوسرے روز سرکاری طور پر روزانہ کے حادثات قحط کی جو فہرست
شائع ہوئی وہ حسب ذیل تھی۔

قحط زدہ بیمار شفاخانہ میں داخل ہوئے	۱۳۷
شفاخانہ میں فوت شدہ	۸۴

صفائی کے دستوں نے مردے اُٹھائے ۷۶

میرے دل میں سوال پیدا ہوا کہ ہم نے جن دوبے چاروں کی امداد کی کوشش کی تھی معلوم نہیں وہ اوپر کی کس مد میں شریک ہیں۔

اس کتاب میں قحط کی دردناکیوں اور مصائب کے بیان کو اور زیادہ طول دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ناظرین کے سامنے امدادی باورچی خانوں یا بعض دیہات کا حال بیان کیا جائے جہاں حالات اور بھی بدتر تھے یا وزراء اور مختلف جماعتوں کے کاروباری لوگوں کے دفاتر میں جاکر میں نے اس مسئلہ پر جو تفصیلی بحثیں کی ہیں ان کا ذکر کیا جائے لیکن اس سے ناظرین کو دقت اور الجھن ہی ہوگی۔

لیکن انسانی ہمدردی کی بنا پر اس المناک حادثہ سے جو تعلق خاطر پیدا ہوتا ہے اس سے قطع نظر بھی کیا جائے تو دو سوال پیدا ہوتے ہیں اس لئے مختصر ہی سہی لیکن اس قحط کے اسباب کی تنقیح کرنا ضروری ہے۔

سوالات یہ ہیں۔ اول تو یہ کہ مرکزی حکومت پر کس حد تک اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ جس ڈھنگ سے ہم اس سوال کا جواب دیں گے اس سے اس چیز کا فیصلہ ہو جائے گا کہ ہمیں کس حد تک اس قحط کو اپنی سلطنت کے کارناموں میں ایک بدنما داغ تصور کرنا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ صوبہ واری حکومت کو کس حد تک ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے جس طریقہ سے ہم اس سوال کا جواب دیں گے اس سے اس چیز کا فیصلہ ہو جائے گا کہ ہندوستان کو کس حد تک حکومت خوداختیاری کا اہل سمجھا جاسکتا ہے۔

ہم اس مسئلہ پر فوراً مگر اختصار کے ساتھ بحث کریں گے۔

بنگال میں قحط کے تین بڑے سبب تھے۔ اب ان کو ان کی اہمیت
اعتبار سے یکے بعد دیگرے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بعض دیگر امور
کے متعلق اظہار رائے میں مجھے تامل رہا ہو تو رہا ہو لیکن ان اسباب کی قطعیت
کے متعلق تو مجھے ذرہ برابر بھی شبہہ نہیں ہے یہ ایسے بدیہی واقعات ہیں جو محتاج
دلیل نہیں ہیں۔

سب سے پہلا اور اہم ترین سبب تو آفات سماوی تھیں۔ اگست ۱۹۴۲ء
کی فصل لوگوں کی یاد میں خراب ترین فصل تھی۔ اس کے بعد ہی اکتوبر میں تباہ
کن طوفان آئے۔ اس دوران میں برما کی فصل جنگ میں غنیم کے ہاتھ میں چلی
گئی اور اس سب پر توڑ یہ ہوا کہ ۱۹۴۳ء کے موسم گرما کی ابتدا میں ملک میں
بڑے تباہ کن سیلاب آئے جنھوں نے ذرائع حمل ونقل کو جن پر جنگ کی وجہ
سے ویسے بھی معمول سے زیادہ بار تھا منقطع کر دیا۔

ملک میں کسی قسم کی حکومت بھی برسرکار ہوتی ـــــ مرکزی حکومت
مجسم عقل اصحاب ہی پر کیوں نہ مشتمل ہوتی اور صوبہ داری حکومت کے ارکان
سب کے سب ولی صفت لوگ ہی کیوں نہ ہوتے ـــــ اس کے باوجود
قحط پڑنا ناگزیر تھا اور جو شخص اس سے انکار کرتا ہے وہ بالکل جھوٹا ہے۔

قحط کا دوسرا سبب بد دیانتی، نا اہلیت اور صوبہ داری حکومت کی
غیر ذمہ داری ہے۔

دار العوام کے مباحثوں میں جو تقریریں ہوئی ہیں ان سے اندازہ
ہوتا ہے کہ حزب اختلاف کے بہت سے ارکان اس چیز سے بالکل بے خبر تھے
کہ بنگال میں صوبہ داری حکومت جیسی کسی چیز کا وجود بھی ہے جس کی غالب
تعداد خود ہندوستانیوں پر مشتمل ہے اور جسے ایسے اختیارات حاصل ہیں

جو اس صورت حال سے رد براہ ہونے کے لئے کافی تھے اور اگر کافی نہ تھے تو فوراً مرکزی حکومت کو توجہ دلا کر ان میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھیں گے مرکزی حکومت سے اتنی تاخیر سے ایسی خواہش کی گئی کہ کار از دست رفتہ تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ دارالعوام کے حزب العمال کی تقریریں تو خصوصاً جذبات کی بے ربط ہنگامہ آرائیوں کا نمونہ تھیں ان میں واقعیت کا شائبہ مس آرمی ووڈ فورڈ فنڈلن ______

کی "ہندوستانی غزلیات" سے بھی کم ہے۔

اب دیکھئے کہ اس صوبہ داری حکومت اور اس خالص ہندوستانی حکومت کے جسے آزاد رائے دہندگان نے منتخب کیا تھا کیا کارنامے ہیں۔

قحط کے نازک ترین دور میں اس حکومت کے وزیر اعظم ایک صاحب مولوی فضل حق نامی تھے۔ ممکن ہے مولوی فضل حق کے بارے میں میری رائے کو یکطرفہ خیال کیا جائے اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ ان کے متعلق کلکتہ ہائیکورٹ کے لارڈ چیف جسٹس کی اس رائے کو نقل کر دیا جائے جس کا اظہار موصوف نے ۲۴ اگست ۱۹۴۲ء کو کیا تھا اور جس میں مولوی فضل حق کو سرکاری عہدہ کے لئے نا اہل بتایا گیا تھا وہ ایک ہنگامہ کے مقدمہ میں جو جیا گنج کے لوٹ کے مقدمہ کے نام سے مشہور ہے فیصلہ کر رہے تھے۔ چیف جسٹس صاحب کے الفاظ میں مولوی فضل حق کا تعلق اس مقدمہ سے یہ تھا کہ "جس زمانہ میں وہ بنگال کے وزیر اعظم تھے انھوں نے چاول کی جائز طریقہ پر حمل و نقل میں مداخلت کی۔ چیف جسٹس کے بیان کے آخری جملے جو اسٹیٹ مین کلکتہ سے نقل کئے جاتے ہیں حسب ذیل ہیں :-

"یہ ظاہر ہے کہ مولوی فضل حق نے اپنی وزارت عظمیٰ

کے زمانہ میں سیاسی وجوہ کی بنا پر اپنا اقتدار انصاف رسانی کو متاثر کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ اگر قانونی اور جائز طریقہ پر اغذیہ کی حمل ونقل میں مداخلت کی جا سکتی ہے اور وزیر اعظم مجرمین کی پشت پناہی کر سکتے ہیں تو صوبہ میں قانون وانصاف کا خاتمہ یقینی ہے۔ جس زمانہ میں چاول کی یہ لوٹ ہوئی ہے ہوم ڈپارٹمنٹ کا قلمدان وزارت مولوی فضل حق کے پاس تھا۔ جو چاول لوٹا گیا ہے وہ بہرام پور کے جیل کو جانے والا تھا۔ مجلسوں کے انتظام کا کام ہوم ڈپارٹمنٹ کے فرائض میں سے تھا۔ لیکن نہ تو قبول عہدہ کے وقت کی قسم اور نہ عہدہ کی ذمہ داری کا احساس انھیں اس شر انگیز کام سے باز رکھ سکا"

جناب چیف جسٹس کے حد علم تک اس حلف کی خلاف ورزی کی جو انھوں نے عہدہ قبول کرتے وقت لیا تھا کوئی سزا قانون میں نہ تھی۔ اس قسم کی کھلی عہد شکنی پر بس آدمی کو عہدہ کے لئے ناموزوں کہا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کے حلف کو جو کسی مملکت میں عہدہ قبول کر رہے ہوں اگر محض رسمی چیز قرار دیا جائے تو کسی اچھی حکومت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جناب چیف جسٹس صاحب نے یہ تجویز کی کہ "مولوی فضل حق صاحب کو ان کے اہل ملک کے غور و نظر اور فیصلہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

خیال ہوتا ہے کہ ان کے متعلق اس قسم کی تلخ رائے کے اظہار کے بعد مولوی فضل حق صاحب عہدہ سے دست بردار ہو کر دیہات کو چلے گئے ہوں گے اور بقیہ عمر کاشت کاری میں بسر کرنے کا ارادہ کر لیا ہوگا۔ لیکن نہیں اس سے

ان کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا بنگال کی سیاسیات اسی طرح کی ہے۔

آیئے اب ہم سرکاری دستاویزات کو دیکھیں۔ میں نے جن بڑے قابل ذکر رسائل کو پڑھا ہے ان میں ایک مجلس مقننہ بنگال کی سرکاری روئداد ہے۔ یہ انگلستان کی پارلیمنٹ کی روئداد کے رسالہ ہنسارڈ کی طرح کی ایک چیز ہے لیکن اس میں اور ہنسارڈ میں بڑا تفاوت ہے۔ تقریروں کے دوران میں ارکان کے ایک دوسرے کو ٹوکنے اور شور و غوغا مچانے کی آوازیں اتنی کثرت سے بلند ہوتی ہیں کہ تقریریں سنجیدہ مباحث کی بجائے ناٹک کا مکالمہ معلوم ہوتی ہیں بہرحال کبھی کسی رکن کو مسلسل چند جملے بولنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

اسی قسم کے ایک موقع پر جولائی ۱۹۴۳ء میں آنریبل خواجہ سر ناظم الدین وزیر سول سپلائز نے غذائی موقف پر ایک بیان دیا (ملاحظہ ہو روئداد مجلس مقننہ جلد ۶۵) اگر برطانوی حکومت پر تنقید کرنے والے بلند آہنگ ناقدین اس بیان کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا کرتے تو وہ طعن و تشنیع کرنے میں اتنی عجلت سے کام نہ لیتے کیوں کہ اس موقع پر وزیر موصوف نے صاف طور پر اس چیز کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کہ بنگال میں قحط پھیلنے لگا تھا دانستہ یہ خیال پھیلایا کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ ان کا بیان سنیئے:۔

"میں نے سنا ہے کہ مجھ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ میں نے اس زمانہ میں جب کہ صوبہ میں قحط نے خطرناک صورت اختیار کر رکھی تھی یہ بیان دیا کہ قحط کا کوئی وجود نہیں ہے .... لیکن میری رائے یہ تھی کہ قحط کی موجودگی پر زور دیا جاتا تو اس سے دہشت اور

زیادہ پھیلتی اور قیمتوں میں اضافہ کی حوصلہ افزائی ہوتی لہٰذا
میں نے اس مسئلہ پر بحث کرنے سے انکار کر دیا . . . .
میں صاف دلی سے یہ بیان کرنے کے قابل تھا کہ غلہ کافی مقداً
میں موجود ہے یا ہو جائے گا اور دہشت کی کوئی بات
نہیں ہے ''۔

اس قسم کے بیانات کی موجودگی میں اس برہمی کو سمجھنا مشکل ہے جس کا اظہار ارکان پارلیمنٹ نے مسٹر ایمری پر یہ الزام لگانے میں کیا ہے کہ انھوں نے دوربینی سے کام نہ لیا۔

مسٹر ایمری کے اس بیان کی بھی مخالفت کی گئی کہ کم از کم قحط کا ایک سبب ذخیرہ بندی اور چور بازار میں مال پہنچ جانا بھی تھا۔ اس کی مخالفت میں یہ کہا گیا کہ یہ ہندوستان پر ایک الزام ہے اور اپنے سر سے ذمہ داری ٹال دینے کی ایک بزدلانہ کوشش ہے۔

کیا یہ حقیقت ہے۔ اس چیز کے متعلق خود ہندوستان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی سنیئے۔ اپنی اسی تقریر میں سر ناظم الدین نے بیان کیا:—

> "ذخیرہ بندی' چور بازار میں مال کی خرید و فروخت
> اور دوسری مضر کارروائیاں بھی جاری تھیں۔ ان میں
> سے ایک خاص چیز جس سے ہمیں سابقہ پڑا وہ حرص تھی
> جو قیمتوں میں مزید اضافہ کی توقع کی بناء پر پیدا ہوگئی
> تھی "۔

سر ناظم الدین نے اس کی صراحت کی ہے کہ ۱۰ مرسے ۱۲ مر جون تک ذخیرہ سندوں کے خلاف ایک خاص مہم جاری کی گئی تھی۔ اس مہم کا نتیجہ سن کر

حیرت ہوتی ہے چنانچہ سنئیے کہ "صحیح تخمینہ بتانا تو مشکل ہے لیکن اندازاً کوئی ستر
اسّی لاکھ من اجناس برآمد ہوئی ہوں گی"

مغربی پیمانہ اوزان میں یہ مقدار تقریباً چونسٹھ کروڑ پچاس لاکھ پونڈ کے مساوی ہوتی ہے۔ اس امر کے پیش نظر کہ اتنی بڑی مقدار اڑتالیس گھنٹہ کے عرصہ میں برآمد کی گئی تھی۔ اس کا اندازہ لگالینا چنداں دشوار نہیں ہے کہ ہندوستانی ذہنیت ذخیرہ بندی سے اتنی بیگانہ نہیں جتنا تصور کرلیا گیا تھا۔

نظریہ بازوں نے اس وقت بھی مخالفت میں آواز بلند کی جب دو ایک برطانوی مقررین نے اشارہ کیا کہ اگر ہندوستان کے دوسرے صوبجات زیادہ ہمسایہ دوستی کا رویہ اختیار کرتے اور خود ہندوستانی اپنے اندر برادرانہ اتحاد کا ثبوت پیش کرتے تو حالات اتنے بدتر نہ ہوجاتے معترضین نے فوراً آواز بلند کی کہ یہ ایک اور اتہام ہے اور ہندوستانیوں کے اخلاق پر بیجا طعن وتعریض ہے۔

اب بجا اور بیجا کو بھی دیکھئیے اور خود ہندوستانیوں کی زبان سے سنئیے سرناظم الدین یہ بیان کرتے ہوئے کہ بنگال کی مصیبت سے خلاصی کے لئے بنگال اور پاس کے خوشحال صوبجات کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ کھول دینا ضروری تھا کہتے ہیں :۔

> " جو کچھ پیش آیا وہ سب کو معلوم ہے ہمسایہ
> کی صوبجاتی حکومتوں نے آزاد تجارت کو ناکام رکھنے
> کی ہر ممکنہ کوشش کی اور جتنے ذخائر ظاہر تھے وہ اپنے صوبجات
> کے سررشتہ جات امن عامہ کے ملازمین کو ارزاں فروخت :

کرنے کی غرض سے حاصل کرلے۔"

اس کے بعد سر ناظم الدین نے یہ اپیل کی کہ "میں امید کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ اب بھی یہ حکومتیں صوبہ داریت کی تنگ نظری سے باز آکر ہماری امداد کریں گی۔

ان کی توقع حق بجانب ثابت نہ ہوئی۔ یہ تو حال ہے برادرانہ محبت کا جذبۂ اخوت اور برادرانہ محبت ہی وہ ایک چیز ہے جو اسمبلی کی روئداد کی پرخروش جلدوں میں تلاش کی جائے تو آپ کو دستیاب نہ ہوگی۔ کسی ایک جگہ، ایک لمحہ کے لئے، ایک فقرہ میں بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ارکان انسانی ہمدردی کے جذبہ کی خاطر اپنی ذاتی چپقلشوں کو فراموش کر دینے پر آمادہ ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ جنگ سے پہلے فرانس کی سینیٹ کے مباحثوں کی روئدادیں پڑھتے تو ان نائبین کی غیر ذمہ داری، خود پسندی اور بد دیانتی کا حال پڑھ کر تکلیف ہوتی تھی جنھوں نے اپنے خسیس منافع کی خاطر فرانس کی عظمت کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ لیکن بنگال کے مدبرین کے مقابلہ میں تو فرانس کے نائبین بالکل ایشیا ریشیہ اولیاء اللہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان مباحثوں کی روئدادیں پڑھ کر ذہن پر یہ اثر ہوتا ہے کہ اسمبلی کا پورا ماحول کسی ایسے زہر سے آلودہ ہو گیا ہے جس میں جاکر شائستگی مسموم ہو کر موت کا شکار ہو جاتی ہے۔

اور گو اس بارہ میں پورا بنگال اٹھ کر میرے بیان کی تردید کرے گا لیکن اس پورے زہر کی نوعیت، وہی ہندوستان کا پرانا مرض یعنی مذہبی تلخی ہے۔ شاید ہی کوئی رکن ایسا ہو جو ایوان کے باہر کے ہزاروں فاقہ زدگان کو مردوں اور عورتوں کی حیثیت سے دیکھتا ہو وہ تو ان کو ہندو اور مسلمانوں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ یہ الزام اتنا سخت ہے کہ میں اسے محض اپنی

زبان سے بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کرسکتا۔ مناسب یہ ہوگا کہ ہندوستان پر جو الزامات عائد ہوتے ہیں خود وہیں کے لوگوں کی زبان سے یہاں بیان کئے جائیں۔

مشہور اعتدال پسند لیڈر پنڈت کنزرو نے کلکتہ یونیورسٹی میں منعقد شدہ ایک عام جلسہ میں بتاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء جو تقریر کی تھی اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔ (یہ اقتباس اخبار ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء سے منقول ہے)

"اس وقت بھی جب کہ آنریبل وزیر اغذیہ تمام طبقوں سے تعاون کے خواہشمند ہیں تو انھوں نے کسانوں سے مسلم لیگ کے نام پر اپیل کی ہے کہ بازار میں غلہ کو آنے سے نہ روکیں۔ بنگال کے لئے موجودہ حالات میں ایسے طرز عمل سے زیادہ المناک کوئی حادثہ ہوسکتا ہے۔ باشندوں کے صرف ایک حصہ سے اپیل کی جائے اور ایسے جذبات کو ابھارا جائے جو بنگال کے باشندوں کے بہترین مفاد کے قطعاً خلاف ہیں۔"

یہ چیز واضح ہے کہ مسلم لیگ پر اس قسم کے حملہ پر جتنے جوش کا اظہار کیا گیا اتنے جوش کا اظہار پنڈت صاحب کی تقریر کے کسی حصہ پر نہیں ہوا۔

اب اس بارہ میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو دیکھئے۔ اسٹیٹس مین کلکتہ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں لکھتے ہوئے مسلم نامہ نگار مسٹر شاہد نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"مسلم قائدین نے بارہا اسمبلی کے ہندو حزب الاختلاف سے درخواست کی ہے کہ تاریخ بنگال کی

اِس المناک اور شرمناک مصیبت کو ختم کرنے میں مدد دیں
غذائی موقف پر اسمبلی کے حالیہ مباحثوں میں وزارت
کے خلاف نہایت بیرحمانہ اِتہاموں کے باوجود مسٹر سہروردی
نے اِن اِتہام لگانے والوں کو تعاون کرنے کی دعوت دی۔
جواب ملا کہ ہم قاتلوں کی بات نہیں سنتے۔"

مختصر یہ کہ اس نازک زمانہ کی طویل مدت میں بنگال اسمبلی کے مباحثے غصہ، تعصب اور غیر ذمہ دارانہ ذہنیت کے تکلیف دہ نمونے ہیں[1]۔ ان کو پڑھکر یقین نہیں آتا کہ یہ لوگ عاقل و بالغ مرد ہیں جو کسی ضروری اور اہم مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں بلکہ ان کی باتیں شریر بچوں کی سی معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر الزام عائد کرتے ہیں ان میں سے کسی فریق کو بری قرار

---

[1] بار بار مباحثہ کی اہم کارروائی کسی معمولی مذہبی جھگڑے کے سلجھانے کے لئے رک جاتی ہے۔ اگر آپ اس قسم کی مثالیں دیکھنا چاہتے ہیں تو روئداد کی جلد ۶۴ نمبر (۳) کے ۴۵۴ اور صفحات مابعد کو دیکھئے جس میں اپنی نوعیت کے مخصوص ہندوستانی سیاسی ڈرامہ کے ابتدائی ابواب آپ کے مطالعہ میں آئیں گے۔ واقعہ کی ابتدا دینیا کالج کے چند مسلمان طلباء کے اس مطالبہ سے ہوئی کہ انھیں نماز کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ دیا جائے مسلمان طلباء کے اِس خواہش کا منظور کیا جانا تھا کہ ہندو طلبہ نماز کے وقت کمرہ کے باہر جمع ہوئے اور باجے بجا بجا کر شور کرنے لگے۔ نتیجہ کا اندازہ کر لیجئے کہ پورا کالج فساد اور شور و غوغا کا ایک منظر بن گیا۔ اور قضیہ اسمبلی تک پہنچا۔ اسمبلی کے مباحثوں کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نمایندگان کے نزدیک یہ معاملات اس ملک کی فاقہ زدگی کی مصیبت سے زیادہ اہم تھے۔

دینا تو مشکل ہے۔ لیکن اس امر کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہوگا کہ مسلمانوں نے کسی نہ کسی طرح کے اتحاد کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی ممکن ہے انھوں نے دلنشین طریقہ پر دست مصالحت نہ بڑھایا ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے دست مصالحت بڑھایا ضرور تھا چنانچہ میں پھر مسٹر شاہد کے مضمون کا اقتباس نقل کرتا ہوں :-

"مسلمان پچھلے واقعات کو بھلا دینے پر آمادہ ہیں اور ان کے قائدین تیار ہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کریں جو انھیں متہم کر رہے ہیں بشرطیکہ وہ بھی اسیطرح پچھلے واقعات کو بھلا دیں، فرقہ وارانہ اور سیاسی اغراض کے حصول کے لئے تدبیر سازی سے باز رہیں اور صرف بنگال کے فاقہ زدہ باشندوں کے مسئلہ کو مرکز توجہ بنائیں"

ہم جو اقتباسات پیش کر رہے ہیں وہ نامناسب حد تک طویل ہوتے جا رہے ہیں لیکن مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس سے سرسری طور پر نہیں گزرا جا سکتا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قحط کے دو بڑے اسباب میں سے ایک تو آفات سماوی تھیں اور دوسرے ہندوستانی صوبہ واری حکومت میں پیدا شدہ حالات سے روبراہ ہونے کی صلاحیت کا فقدان۔

اس کے بعد ہمارے سامنے تیسری وجہ آتی ہے یعنی ہمارا اپنا قصور یا یوں کہئے کہ مرکزی حکومت کی کوتاہی۔

اس میں ذرا سا بھی شبہہ نہیں کہ آیندہ زمانہ کا مورخ اس تیسری وجہ کو

دوسری وجوہ کے مقابلہ میں بہت کم اہمیت دے گا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صوبہ داری حکومت نے مرکزی حکومت سے اس وقت تک امداد کی خواہش نہیں کی۔ جب تک کہ وہ ایسے مخمصہ میں نہ پھنس گئے جس سے نکلنے کی صورت باقی نہ رہی اور اس وقت تک ہندوستانی قوم پرستوں کی ذہنیت سے ہم جس حد تک واقف ہو چکے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے اگر مرکزی حکومت صوبہ داری حکومت کو نظر انداز کرکے کوئی ایسا اقدام کرتی جسے قبل از وقت ٹھہرایا جا سکتا تو احتجاج کرکے کتنا شور بلند کیا جاتا۔

لیکن اس سے ہم تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتے لیکن ذمہ داری قبول کرنے کے ساتھ ہمیں جائز صفائی کا حق بھی ملنا چاہیئے مثلاً ہم پر بار بار الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ کہ صحیح اعداد وشمار موجود نہ تھے جن سے کام کرنے والوں کی صوبہ کے طول وعرض میں تقسیم غذا کی جد وجہد میں رہنمائی ہوتی۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ جو اعداد موجود تھے وہ الجھے ہوئے اور از کار رفتہ تھے اور ان کے حصول کے طریقے بھی دقیانوسی تھے۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ صاحب ضلع اپنے چوکیدار کو طلب کرکے سوال کرتا کہ ندی کے کنارے سے لے کر پورے گاؤں میں کیسی فصل ہوئی۔ چوکیدار اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرکے چند منٹ چاروں طرف دیکھتا اور اس کے بعد بتاتا کہ دو سو بیگھے میں بارہ آنے فصل ہوگی اور سو بیگھے میں چودہ آنے ہوگی۔ بس اس بارہ میں یہ ہی عمل تھا اور اگر فرق ۲۵ فیصد سے کم ہو تو چوکیدار کو خوش قسمت سمجھیئے۔ ظاہر ہے کہ جن ملکوں میں بہترین زمانہ میں آبادی کے لحاظ سے ۵ فیصد کم پیداوار ہوتی ہو وہاں ایسے طریقے استعمال کرنا آگے پیچھے مصیبت کو دعوت دینا ہے۔

لیکن اس قسم کے واقعات کا اعتراف کرتے وقت ہمیں ان کا پس منظر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اس پس منظر میں ہمیں کیا نظر آئیگا یہ کہ صرف بنگال میں چھ کروڑ کی آبادی ہے جن میں کثرت سے ناخواندہ ہیں اور انکی تعداد میں اس تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا ہے کہ کسی ایسے ملک کے وسائل بھی ان کے بار کی تاب نہیں لاسکتے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہ رہی ہوں اور پھر ملک کے باشندوں میں مذہبی اختلافات کی بنا پر اتنی شدید منافرت ہے کہ خانہ جنگی نہ ہونا ہمارے نظم و نسق کی خوبی پر دال ہے۔ اس وسیع اور شورانگیز آبادی پر جس میں یکسانیت یکسر مفقود ہے مٹھی بھر یورپین حکمراں جنھیں اپنے ہندوستانی رفقار کار کا جن کو وہ روز افزوں اختیار تفویض کرتے رہے ہیں بہت کم تعاون حاصل ہوتا ہے۔

آپ چاہتے ہوں تو ہم پر الزام عائد کیجئے لیکن الزام اسی بات کا ہوگا کہ ہم نے معجزات کیوں نہ دکھائے۔ یہی ایسا جرم ہے جس کا ہم ایمانداری سے اعتراف کرسکتے ہیں۔

یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں انگریزوں سے کوتاہیاں نہیں ہوئی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کوتاہیاں قوت کے بے جا استعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ نرمی کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ ہم یہ جاننے کے باوجود کہ کس وقت کیا کام کرنا صحیح ہوگا اس کے مطابق عمل کرنے سے محض اس وجہ سے باز رہے ہیں کہ کہیں اس سے ہندوستانیوں کے جذبات مجروح نہ ہو جائیں[1]۔ اگر اکا دکا ادھر ادھر پھیلے ہوئے انگریز

---

[1] اس قسم کے رجحان کی ایک مثال ستی یعنی وہ ہیبت ناک رسم ہے جس کی رو سے

ہندوستانیوں کی بڑی تعداد سما جو مقامی زرعی مسائل اور دیہی زندگی کی پیچیدگیوں سے واقف ہوں تعاون حاصل کر سکتے تو بنگال میں ہرگز قحط نہ ہوتا۔ لیکن کسی ایسی جماعت کا وجود نہ تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں بیکار گریجویٹ موجود تھے جو اس کام کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوتے لیکن انھوں نے اس طرف رُخ کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک یہ کام بالکل خشک باعث زحمت اور ناخوشگوار تھا اور بہتر تھا کہ انگریزوں ہی پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ عدالتوں میں انتظار کی گھڑیاں گِن گِن کر ادنیٰ درجہ کی اخبار نویسی کر کے اور اسٹینوگرافر یا خطوط رساں کی حیثیت سے کام کر کے تھوڑی سی روزی کما لینے کو ترجیح دیتے تھے۔ کوئی اوسط درجہ کا ہندوستانی گریجویٹ جب دیہات سے نکل جائے تو اگر اسے وحشی گھوڑوں سے باندھ کر کھنچوایا جائے تب بھی وہ دیہات کا رُخ نہ کرے گا۔

لیکن اگر دیہی زندگی کو تعلیم، زراعت، صفائی اور زندگی کے دیگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۱) اعلیٰ ذات کی ہندو عورتیں اپنے شوہروں کی موت پر ان کے ساتھ چتا میں جل کر مر جاتی تھیں ہم نے جس وقت اس رسم کو ہٹایا ہے اس سے بچاس سال پہلے ہٹانا چاہتے تھے لیکن قومی معاملات میں عدم مداخلت کی روایتی پالیسی کی وجہ سے ایسا کرنے سے باز رہے گو یہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے لیکن اب بھی بہت سے اعلیٰ ذات کے ہندو ستی کی رسم مٹ جانے کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ میں نے انہیں حسرت سے اس شاندار ماضی کا ذکر کرتے سنا ہے جب عورتیں جرأت آزما سچی محبت کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ جائیں تو بہت ممکن ہے کہ ستی کی رسم [illegible]

بنیادی معاملات میں ترقی دینا ہے تو ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی ان گریجوئیٹوں کو دیہات واپس لے جائے۔ اگر ہم جرات کرکے ایسا قانون منظور کر دیتے کہ سند حاصل کرنے کے بعد ہر گریجویٹ کو کم از کم ایک دو سال دیہات کے انتظامات کے مطالعہ میں صرف کرنا ہوگا۔ تو ہم خود انھیں دیہات واپس لا سکتے تھے لیکن ہم میں اس جرات کا فقدان تھا اور جب کہ ہم نے صوبہ داری حکومت کو اختیار دے دیا ہے ہمارے پاس وہ اختیار بھی باقی نہیں رہا یہ اہم قانون خود ہندوستانی صوبوں کو منظور کرنا چاہئیے۔

اگر ایسا کیا جا سکے تو دیہاتی زندگی میں قطعاً جان پڑ جائے گی۔

میں ایک دفعہ پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اگر ہم کسی قصور کا اعتراف کر سکتے ہیں تو یہی ہے کہ ہم نے معجزات کیوں نہ دکھائے اور لارڈ ویول کی دہلی کو آمد کے بعد تو ہم نے تقریباً یہ بھی کر دکھایا۔ سوال ہوگا کہ کس طرح۔ جواب یہ ہے کہ ہم نے ایک دفعہ پھر قوم پرستوں کی ملامت کی پروا کئے بغیر بلا تامل جس طرح مناسب سمجھا حکومت کی۔ لارڈ ویول نے پورے مسئلے سے فوجی نقطہ نظر سے دوبراہ ہونے کی کوشش کی۔ عاملانہ اور قطعی احکام جاری کئے اور ابتدا ہی سے ظاہر کر دیا کہ وہ کسی یاوہ گوئی کی پروا نہیں کریں گے اس میں شبہہ نہیں کہ اخبارات نے نمایاں طور پر تعاون نہیں کیا اور بہت سے لوگ یہ کہتے رہے کہ اہل برطانیہ اس مسئلے سے محض اس وجہ سے دلچسپی لے رہے ہیں کہ قحط سے ان کا فوجی موقف متاثر ہونے کا اندیشہ ہے۔

تاہم دیکھا جاتا تو تحریروں سے تشکر کے احساس کی جھلک تو ضرور نظر آتی۔ یہ اسی قسم کا تشکر تھا کہ فرقہ واری ہنگاموں کے موقع پر جب برطانوی فوج امن قائم کرنے کو آ جاتی ہے تو ہنگامہ کرنے والے متاثر ہو کر پکار اٹھتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ انگریز یہاں موجود ہیں۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اس تشکر کا اظہار اخبارات کے صفحات

یں نظر نہیں آتا۔ عوام جنھیں خونریزی سے بچا لیا جاتا ہے وہ ایسے لوگ نہیں ہوتے
جو اخبارات کو مراسلات لکھ سکتے ہوں۔ باہر کی دنیا تو ان معاملات کے متعلق
صرف اتنا جانتی ہے کہ فلاں کانگریسی لیڈر کی ناک پر لاٹھی کی ضرب لگی اور اسے
سامراجی بہیمیت کے سیاہ داغوں میں ایک اور اضافہ شمار کر لیا جاتا ہے۔

لیکن ہندوستانی اور صحیح معنوں میں ہندوستانی یعنی وہ کسان جو اپنے
وہاں کے کھیت میں کام کر رہا ہے۔ اس کی قدر و قیمت سے واقف ہے کیونکہ
اس کی انتہائی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اسے امن اور چین نصیب ہو۔ یقیناً اہل ہند
اس چیز کی قدر و قیمت سے باخبر ہیں اور وہ اسے یاد رکھیں گے۔ ہمیں توقع
رکھنی چاہیئے کہ آیندہ جو شور و شر کا زمانہ آنیوالا ہے اس میں ایسے ناگوار و ×
تلخ واقعات پیش آئیں گے کہ یہ زمانہ یاد آئے گا۔

پانچواں باب

انگریز اور اینگلو انڈین

اگر آپ برطانیہ عظمیٰ کی تمام آبادی کو مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت لے جا کر ہندوستان کے بیچ میں کہیں بسا دیں تو پھر بھی ان کی تعداد نو کے مقابلہ میں ایک ہوگی۔

اس سے نہایت واضح طور پر اس عجیب و غریب حقیقت کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان پر ایک مٹھی بھر برطانوی حکمرانی کر رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں جو برطانوی باشندے حقیقتہً مقیم ہیں اس کے زمانہ میں انکی تعداد کا تناسب (ایک چھوٹی سی فوج کے علاوہ جو صرف پولس کے ضروری فرائض انجام دینے کے لئے کافی ہوسکتی ہے) چالیس کروڑ ہندوستانیوں کے مقابلہ میں دس ہزار سے زائد نہیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرہ کو سُن کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ گویا ایک بڑے پیمانہ پر ہجرت، اور ایک آبادی کی منتقلی مہینوں تک جاری رکھنا ہوگی۔ جس کے لئے بہت بڑے پیمانہ حمل و نقل کے انتظامات کرنا ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کام ایک ہفتہ میں ہو سکتا ہے اور جہازوں کے ایک اوسط درجہ کے بیڑے کے ذریعہ تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہندوستان سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔

دنیا میں کبھی اتنی قلیل التعداد جماعت نے اتنی کثیر التعداد انسانوں کا بوجھ اپنے سروں پر نہ لیا ہوگا۔ زیر نظر باب میں ہم برطانوی حکمرانوں کا بھی اسی طرح بے رو رعایت جائزہ لینا چاہتے ہیں جس طرح ہم نے ہندوستانیوں کے حالات کی جانچ کی ہے اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے کیا خصائص ہیں اور وہ اپنی ذمہ داریوں کی بجا آوری کے کس حد تک اہل ہیں۔

ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی عادات و اطوار کے متعلق "پکا صاحب اور ان کی میم صاحب" کا خاکہ عام طور پر ذہنوں میں یہ ہے کہ وہ شراب کا پیالہ دیکھ کر خوشی سے اُچھلنے لگتے ہیں یا اور نفسانی مطالبات کی تکمیل کے لئے ذرا سی آڑ مل جانے کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا اس قسم کے "پکا صاحب اور میم صاحب" کا وجود بھی ہے یا نہیں۔

اس سوال کا جواب زندگی کے دوسرے سوالات کی طرح 'ہاں' یا 'نہیں' ہو سکتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایسے خطرناک قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں خصوصاً عورتوں کے طبقہ میں جو بڑی عامیانہ اور جنسی جذبات سے متعلق ذہنیت رکھتی ہیں اور ہو[illegible]ں کے شراب کے کمروں میں اس طرح بیٹھی ہوئی

وقت گزارتی ہیں کہ بیک وقت شریف بی بیاں بھی معلوم ہوں اور مردوں کو اپنے ناز و انداز سے لبھا بھی لیں حالانکہ بظاہر انھیں نہ اس میں کامیابی ہوتی ہے نہ اس میں۔

یہ نہایت تلخ مزاجی اور تحکمانہ انداز کا اظہار کرتی ہیں اور اگر ان سے جنگ کی امداد میں کوئی خدمت انجام دینے مثلاً گھنٹہ دو گھنٹہ کسی کینٹن میں کام کرنے کے لئے کہا جائے تو وہ سخت برہم ہو جاتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انھیں سولی پر چڑھایا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں فوج کے لوگوں کو شکایت ہے کہ ان کی آسایش کا کوئی انتظام نہیں کیا جا رہا ہے۔

گھوڑ دوڑ دیکھو اور جنگ کی امداد کرو۔

آپ کو یقین آئے نہ آئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اوپر کے الفاظ ہر ہفتہ کے بمبئی کے اخباروں میں عنوان کے طور پر نظر سے گزرتے ہیں جنگ کے زمانہ میں جو لوگ انگلستان سے آتے ہیں اور جب یہ اشتہار ان کی نظروں سے گزرتا ہے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ اور یہ چیز ان کو ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ کوئی ذمہ دار ایڈیٹر اس قسم کے ظالمانہ اور ذوق سے گرے ہوئے عنوان کو اپنے اخبار میں جگہ دے سکتا ہے۔ بمبئی کا گھوڑ دوڑ کا میدان وسط شہر سے سات میل کے فاصلہ پر ہے ہر شنبہ کے روز گھوڑ دوڑ کے زمانہ میں گھوڑ دوڑ کا میدان تیس تیس ہارس پاور کی موٹروں سے گھرا ہوا ہوتا ہے اور اس طرح بہت سا قیمتی پٹرول جو ہزاروں میل کے فاصلہ سے سمندر کے پرشور راستوں سے لایا جاتا ہے، گھوڑ دوڑ کو جانیوالی ان موٹروں میں جلا دیا جاتا ہے ان موٹروں میں سے بمبئی میں رہنے والی

انگریز خواتین مسکراتی ہوئی اترتی ہیں اس لئے کہ ان کی ٹوپیاں بالکل نئی ہیں اور ان کا ضمیر پاک ہے وہ اس خیال میں مگن ہوتی ہیں کہ ہم سعی جنگ میں مدد کر رہے ہیں کیونکہ گھوڑ دوڑ کی آمدنی کا دو فی صد۔ جی ہاں! پورا دو فی صد حصہ جنگی کاموں میں جاتا ہے۔ موسم گرما میں پورا ہفتہ سیر و شکار میں بسر کرنے کے بعد ایک انگریز لڑکی سے اس سے زیادہ اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ شنبہ کی پچھلی پہر اس قسم کی قومی خدمت میں صرف کرے۔

میں نے یورپین ایسوسی ایشن کے مختلف ارکان سے ذکر کیا کہ اس قسم کا اشتہار نا قابل ذکر حد تک سوقیانہ ہے اور برطانیہ یا کسی دوسرے ملک میں جیسے برسر جنگ ہونے کا ذرا سا بھی احساس ہو اس قسم کا اشتہار شایع ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ ہمارے روسی حلیفوں کی ایک طرح توہین اور تجارتی بحریہ کے لئے بڑی شرمناک چیز ہے۔

انھوں نے جواب دیا۔

"لیکن ہندوستانی تو گھوڑ دوڑ دیکھنے جاتے ہیں۔ پھر ہم کیوں نہ جائیں۔"

میں نے کہا۔

"کم از کم ہمیں اچھی مثال قایم کرنی چاہیئے۔"

ان لوگوں نے جواب دیا۔

"لیکن اس سے سعی جنگ کی جو امداد ہوتی ہے۔"

یہاں بات ختم ہو گئی۔ بہت سے تلخ تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ بمبئی کی یورپین ایسوسی ایشن کے ارکان غیر اہم، شہر کے مضافات کی زندگی

کی سستت کوشیوں کا شکار، جاہل، حقیر اور تصنع پسند قسم کے لوگ ہیں۔

لیکن سلطنت کی خوش قسمتی کہئیے کہ یہ لوگ ہندوستان میں کسی طرح برطانوی باشندوں کا صحیح نمونہ نہیں ہیں۔ متوسط قسم کے انگریز مرد اور عورتیں تو انھیں کے الفاظ میں "اچھے خاصے قسم کے شائستہ لوگ" ہوتے ہیں، خصوصاً جو لوگ شہروں سے دور اضلاع میں رہتے ہیں کسی شخص کے لئے ایسی زندگی میں اپنی جودت قائم رکھنا حقیقتہً بڑا مشکل کام ہے جہاں مکان کے اندر سایہ میں بھی درجہ حرارت سو سے کم نہ ہوتا ہو چھوٹی سی تنخواہ ملتی ہو، گھر کے ملازم کے سوا کوئی ذہین تعلیم یافتہ ہم صحبت نہ ہو، اور چار پانچ مہینے کے پرانے اور وہ بھی دیمک کھائے ہوئے رسالوں کے سوا کوئی اخبار پڑھنے تک کو نہ ملتا ہو اور سب سے بڑھکر یہ کہ ان کی خدمت کا نہ ہندوستانی شکریہ ادا کرتے ہوں اور نہ خود ان کے ہم وطن انگریز۔

۲

ان کی ایک خصوصیت جو ان سب میں مشترک ہے وہ ان کی جرأت ہے ان مٹھی بھر مرد اور عورتوں میں جن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک وسیع ریگستان میں چٹکی بھر گرد، آپ کوئی اور خصوصیت تسلیم کریں یا نہ کریں ان کی جرأت وہمت کا تو آپ کو اعتراف کرنا ہی پڑے گا آپ کو اس نوجوان پولیس کے سپاہی کی جرأت کی بھی داد دینی ہوگی جو کل تک اسکول کا لڑکا تھا اور آج ایک مجمع کے خوفناک مذہبی جوش کو دیکھ کر پریشان ہے کہ اسے تن تنہا ہزاروں آدمیوں کے اس مجمع کو قابو میں رکھنا ہے جس پر شدید ضرورت کے وقت بھی گولی چلانے سے مجبور رہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے شدید ضرورت کے

یہ معنی نہیں ہوتے کہ مجمع کانچ کے ٹکڑے پھینک کر اس کا منھ لہو لہان کر دے تو وہ گولی چلا سکتا ہے۔ آپ کو شمال مغربی سرحد کی چوکیوں کے انگریز فوجی دستوں کے سپاہیوں کی جرأت کی بھی داد دینی ہوگی جنھیں ہر وقت ان سرحدی نشانہ بازوں کی زد میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے جو آدمی کو مار ڈالنا ایک کھیل سمجھتے ہیں۔

آپ کو انگریز ججوں کی جرأت کی بھی داد دینی ہوگی جن کی نظریں جھوٹ، فریب اور دشنام کے طوماروں سے حقیقت کو تلاش کر لیتی ہیں یہی حال ڈاکٹروں کی جرأت کا ہے جو عوام اور مخالفت کے حوصلہ شکن ماحول میں اپنے اصول کو نہیں چھوڑتے۔ تجارتی طبقہ کے لوگ بھی قابل داد ہیں جن کے مدمقابل ایسے تاجر ہیں جو تجارتی دیانت کے ابتدائی اصول سے بھی بالکل بیگانہ ہیں۔

سب سے بڑھ کر آپ کو عورتوں کی جرأت و ہمت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ تھوڑی سی تصنع پسند اور معمولی حیثیت کی عورتوں کے سوا جن کا تعارف ہم گھوڑ دوڑ کے میدان میں کرا چکے ہیں باقی ہزار ہا نرسیں مشنری عورتیں اور دیہاتی علاقہ کے سرکاری عہدہ داروں کی بیویاں ایسی ہیں جو انتہائی عزت کی مستحق ہیں۔ ان کی جرأت بہت سنسنی خیز قسم کی جرأت نہ سہی لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے وطن کے رقص و سرود کے جلسوں اور عیش و عشرت کی محفلوں کے حالات پڑھ کر کبھی آنسو نہیں بہاتیں حالانکہ انھیں برسوں اس سے محروم رہنا پڑتا ہے۔ بعض نازک موقعوں پر مثلاً جب کبھی ریل گاڑی روک لی جائے یا بنگلے کے پھاٹک پر کوئی پر جوش مجمع گڑبڑ مچا رہا ہو یہ جس قسم کے سکون اور اطمینان کا مظاہرہ

کرتی ہیں وہ تو بس بالکل غیر معمولی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کو آپ چاہے جس قسم کی جراءت کہیں لیکن اس کی ان میں کمی نہیں ہے۔

ہندوستان کے انگریزوں کا اگر ہم افراد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ برطانوی شہنشاہیت کے پرزوں کی حیثیت سے جائزہ لیں تو ان پر تین قسم کے اعتراضات وارد ہوسکتے ہیں۔

اول یہ کہ وہ کبھی شکریہ ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ جب میں اپنے پہلے ہندوستان کے سفر میں ریل گاڑی میں گوالیار سے دہلی جا رہا تھا تو مجھے ریل میں ایک سرخ سفید چہرہ والے ہندوستانی فوج کے کرنیل سے شکریہ ادا کرنے کے لئے کہنا پڑا۔ واقعہ یہ ہوا کہ جو قلی سامان اٹھا کر لائے تھے وہ مزدوری لینے کے انتظار میں کھڑے تھے گرمی کا موسم تھا اور انھوں نے بہت تیزی اور سلیقہ سے کام کیا تھا۔ صرف مزدوری دے کر ان کو ٹرخا دینا مجھے بہت بدنما معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے جب کرنیل سے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہا تو وہ بولا۔ شکریہ؟ شکریہ؟

میں نے کہا، جی ہاں شکریہ!

اس نے پرزور لہجہ میں، میرے عزیز دوست! آپ کبھی شکریہ ادا نہ کیجئے۔

میں نے حیرت سے پوچھا، شکریہ ادا نہ کروں!

اس نے کہا، جی نہیں! ہرگز نہیں۔ شکریہ ادا نہیں کیا جاتا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر جھکایا اور گاڑی میں چڑھنے لگا۔

اس کے بعد وہ پھر مڑا اور اس نے کہا، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں بالکل واقعہ ہے۔ میں ہندوستان میں تیس سال سے ہوں۔ ہندی جانتا ہوں۔

اردو جانتا ہوں، لیکن کبھی کسی کو شکریہ ادا کرتے نہیں دیکھا۔

میں نے شکریہ ادا نہ کرنے کی تلافی کی غرض سے قلی کو کچھ انعام بھی دیدیا اور کسی ناصح کے سمجھائے بغیر میں نے دیکھ لیا کہ اسے لفظی خوش اخلاقی سے یہ بخشش زیادہ پسند ہے۔ ان کو مزدوری اتنی کم ملتی ہے کہ اگر مزدوری کے علاوہ ان کو ایک آنہ اور دیدیا جائے تو وہ صاحب سے اپنے منھ پر تھکوانے میں بھی دریغ نہ کرے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بعض دفعہ صاحب ایسی حرکتیں بھی کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ منھ پر تھوک ہی دیں گے۔

بہر حال یہ واقعہ مجھے اہم معلوم ہوا۔ انگریزوں نے ہندوستان سے بہت کچھ نفع حاصل کیا ہے لیکن کبھی شکریہ کہنے کی توقع نہیں ہوئی اسی طرح ہندوستانیوں نے بھی انگریزوں سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، لیکن انھیں بھی کبھی شکریہ کہنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

یہ بڑی افسوسناک چیز ہے۔ اس قسم کی چیزوں سے باہمی تعلقات کی استواری میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیلنڈروں میں بہت سے ایسے قطعات چھپے ہوئے نظر آتے ہیں جن میں مزدوروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے اور مزدور عورتوں کو شکریہ کہنے پر بہت زور دیا جاتا ہے مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اس لفظی خوش اخلاقی کے مصنفین چار چھ آنے خیرات یا انعام دینے کی بہ نسبت لفظی خوش اخلاقی کے اظہار کو غنیمت سمجھتے ہیں۔

شکریہ، شکریہ! آخر ہندوستان میں شکریہ کے لئے کیا لفظ ہے دوران سفر میں مجھے ہندوستان بھر میں اس سوال کے جواب کا انتظار رہا

مجھے اپنی حالت بالکل بیگانہ بیگانہ سی معلوم ہوتی تھی اور خیال ہوتا تھا کہ میں دماغی الجھن کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں دیکھتا تھا کہ میرے سوا نہ تو کسی انگریز کو نہ ہندوستانی کو اس لفظ کی کمی محسوس ہوتی ہے ہوٹلوں کے کمروں میں ملازم بھاری بھاری ٹین کے صندوق اٹھا کر ڈگمگاتے ہوئے لاتے لیکن کسی کے منھ سے شکریہ نہیں نکلتا۔

ملازم آدھی رات کو میزوں کے گرد کھڑے ہوئے جمائیاں لیتے ہیں اور صاحب برانڈی کے جام سامنے رکھے ہوئے قہقہہ لگاتے ہیں لیکن کبھی شکریہ کا ایک لفظ ان کے منھ سے نہیں نکلتا۔ لوگ ایک دوسرے کو گری ہوئی چیزیں اٹھا کر دیتے، موٹر بسوں میں جگہ دیتے اور ناواقف لوگوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ لیکن کوئی کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ یہ دیکھ کر میں دم بخود ہو جاتا اور اپنے آپ کو حقیر محسوس کرنے لگتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اپنا ایک عجیب و غریب قسم کا شکریہ ایجاد کر رہا ہوں یعنی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے اور جھجک کے ساتھ رکی رکی آواز میں شکریہ زبان سے نکلتا۔ جسے سن کر مخاطب چونک پڑتا لیکن اس سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

سب سے پہلے شہزادی برار کے منھ سے میں نے وہ الفاظ سنے جو شکریہ کے لئے بولے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اگر کسی خاتون کو سب سے کم یہ الفاظ کہنے کی ضرورت تھی تو وہ شہزادی برار ہیں کیونکہ وہ اس قدر حسین ہیں کہ صرف ان کا مسکرا دینا شکریہ کا نعم البدل ہو سکتا ہے لیکن وہ کسی لحاظ سے ہندوستانی نہیں ہیں۔ وہ سابق خلیفہ ترکی کی صاحبزادی ہیں اور ان کے اخلاق بھی ان کے نسب کی طرح شاہانہ ہیں شکریہ ادا کرنے کے

طریقہ پر وہ بھی میری طرح کوفت محسوس کرتی تھیں بہر حال انھوں نے مجھے دو لفظ تحفہ میں دیئے جو آپ کو یورپین لوگوں کے لئے لکھی ہوئی کسی ابتدائی نصاب کی کتاب میں نہیں ملیں گے۔ بظاہر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ الفاظ اتنے شاذ استعمال ہوتے ہیں کہ ان کے ذکر کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ پہلا لفظ ہے 'مہربانی' اور دوسرا لفظ ہے 'شکریہ'[1] جس کے 'شیرینی' یا اسی قسم کے کچھ معنیٰ ہیں یہ دونوں الفاظ بڑی بلند اور گونجتی ہوئی آواز میں مفلوک الحال فقیر تک سے کہدیا کرتا تھا جسے سن کر صاحب اور اونچی ذات کے ہندو گھبرا جاتے تھے۔ لیکن وہ غریب آدمی جن کے کان ایسے الفاظ سننے کے عادی نہیں ہیں بیحد خوش ہوتے۔

۳

دوسرا اعتراض ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں قطعاً نہیں رہتے۔ ان کے دل تو انگلستان کے کسی نہ کسی حصہ میں پڑے رہتے ہیں وہ اس ملک کو سمجھنے کی مطلقاً کوئی کوشش نہیں کرتے۔ ان کو جو کچھ خیال رہتا ہے وہ یہی کہ جتنی جلد سے جلد اور نفع بخش طریقہ سے ممکن ہو یہاں سے نکل چلو۔

اس قسم کے لوگ تلخی کی حد تک پہنچ کر مجھ سے یہ کہتے "عجیب

---

[1] مصنف نے 'شکریہ' کے لفظ کو 'شگریہ' قرار دیکر غالباً اسے انگریزی لفظ شوگر سے مشتق سمجھا اور اس کے معنیٰ شیرینی کے بتائے ہیں (مترجم)

بات ہے ! تم ہندوستان کے متعلق کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں یہاں ایک سال سے زیادہ نہیں ہوا۔ اور ہم تو بیس سال سے یہاں ہیں اور ہندوستان کے متعلق ایک بات بھی نہیں جانتے "

اِس بات کا تو بس یہ جواب دینے کو جی چاہتا ہے " درست ہے ! اگر آپ یہاں بیس سال اور بھی رہیں تب بھی آپ جاہل کے جاہل ہی رہیں گے "

ایک مشاق رپورٹر کو یہ سُن کر بہت تکلیف ہوتی ہے کہ کسی ملک کے حالات کے متعلق اظہار رائے کا اہل ہونے کے لئے وہاں کم از کم بیس سال گزارنا چاہیئے۔ ایک عامی کسی ملک میں سال بھر رہنے کے بعد جن حالات کا مشاہدہ کر سکتا ہے ایک مشاق رپورٹر ریل کے ایک سفر میں اس سے زیادہ واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

ذیل میں ہندوستان کے متعلق کچھ ابتدائی قسم کے سوالات اور ان کے وہ جوابات درج ہیں جن کی کسی اوسط درجہ کے انگریز سے توقع کی جا سکتی ہے۔

سوال :- کیا آپ نے کبھی کوئی ہندوستانی فلم دیکھا ہے ؟

جواب :- نہیں ! خدا نہ کرے ! ہندوستانی فلم فضول سی چیز ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی فلم قومی نفسیات کو سمجھنے کا قریب ترین ذریعہ ہو سکتی ہیں۔

سوال :- کیا آپ نے بھگوت گیتا پڑھی ہے ؟

جواب :- یہ کون صاحب ہیں ؟ آپ نے کیا فرمایا ؟
واقعہ یہ ہے کہ بھگوت گیتا کا نام بھی ہندوستان میں رہنے والے

انگریزوں کے سننے میں نہیں آتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ انگلستان آنے والے کسی ہندوستانی نے انجیل کا نام نہ سنا ہو۔

میں بہت سے پادریوں سے ملا لیکن ان میں سے دو نے" ابے ڈیوبائی" کی کتاب" ہندوؤں کے عادات، رواج اور رسوم" کا نام سنا تھا اور پڑھنے کی کوشش تو ان لوگوں نے کبھی نہ کی تھی۔ حالانکہ" ڈیوبائی" کی یہ کتاب ایسے ادب عالیہ میں سے ہے جس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ڈیوبائی ان مصنفین میں سے ہے جن کو ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرنے والا کوئی متعلم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سوال:۔ کیا آپ نے ہندوستان کے کسی گاؤں میں سو کر رات بسر کی ہے۔

جواب:۔ جی نہیں! بس شکریہ! وہاں بہت کھٹمل ہوتے ہیں۔

آپ ہندوستان کے حقیقی حالات سے کیسے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں جب تک آپ کسانوں کے ساتھ کسانوں کی طرح رہ کر کم از کم ایک رات بھی بسر نہ کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے بھی بہت زیادہ راتیں اس طرح بسر نہیں کیں۔ لیکن ایک مختصر سے تجربہ سے مجھے وہ معلومات حاصل ہو گئیں جو ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً جانوروں کے ساتھ ہندوستانیوں کے عجیب و غریب جذبۂ یگانگت کا مجھے علم ہوا۔ یہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں کہ رہنے کی جھونپڑی کے ایک کونے میں چار بکریاں پڑی سو رہی ہیں، دوسرے کونے میں بہت سی مرغیاں آرام کر رہی ہیں اور دروازہ سے وقتاً فوقتاً ایک بیل بے تکلفی سے اپنا سر نکالتا رہتا ہے۔ اچھی طرح سونا

تو ممکن نہ تھا، کیونکہ کھٹمل بری طرح کاٹ رہے تھے۔ لیکن بدلے میں بہت سے لطف حاصل ہو رہے تھے۔ مثلاً سر شام بانسری کی آواز، کنوئیں پر عورتوں کی کالی کالی پیاری صورتیں جو نیلے آسمان کے مقابلہ میں کوئلے کی طرح سیاہ نظر آ رہی تھیں، دہی کے پیالے اور تازہ پھل جو سونے سے پہلے وہ لوگ میرے پاس لائے اور چنبیلی کا ہار جو انھوں نے میرے گلے میں پہنایا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے ہار اتار کر دیوار پر لٹکا دیا اور رپہلی پتی پر جو انھوں نے ہار میں لگا رکھی تھی، قندیل کی شعاعیں پڑتی ہوئی دیکھنے لگا۔

پھر اس کے بعد صبح تڑکے کا سامان بڑا دلکش تھا پو پھٹنا اور شفق پھولنا بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف نارنجی رنگ چھایا ہوا ہے۔ اور اس پر مستزاد کسانوں کا دہان کے کھیتوں کو جاتے ہوئے گانا صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں یہاں کے کھیت جتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں اتنی خوش منظر چیزیں بہت کم ہونگی۔

چند کھٹملوں کے ڈر سے اس قسم کے تجربے سے باز رہنا بڑی پست ہمتی ہے۔

سوال:- کیا آپ کے کوئی ہندوستانی دوست ہیں؟

جواب:- دوست؟ میں بہت سے شایستہ ہندوستانیوں سے واقف ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ حقیقتہً بہت شایستہ قسم کے ہندوستانی ہیں لیکن میں ان کو اپنا دوست تو نہیں کہہ سکتا۔

غالباً بڑی المناک چیز ہے۔ اس قسم کی خلیج ضرور موجود ہے اور بہت سے لوگ انتہائی کوشش کے باوجود اس کو پاٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ناقابلِ فراموش گارڈن پارٹی جس کا ای۔ ام فارسٹر کی کتاب (اے پیسیج ٹو انڈیا) کے ابتدائی صفحات میں ذکر ہے۔ کچھ زیادہ پرانا واقعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے ہزاروں چمنوں میں اب بھی اس قسم کی گارڈن پارٹیاں ہوتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اونچے طبقے میں کالے اور گورے ایک دوسرے سے قریب ہو گئے ہیں۔ ساڑیاں اور سائے گاندھی ٹوپیاں اور ہیٹ پہنے سب ایک جگہ ملے جلے نظر آتے ہیں گفتگو بھی ایک دوسرے سے رُک رُک نہیں کرتے ہیں، کیونکہ آج کل انگریز میزبان اپنے پوزیشن کے متعلق اتنے مطمئن نہیں ہیں جتنے کہ ان کے ہندوستانی مہمان۔ اس کے باوجود یہ گارڈن پارٹیاں ٹھیک مذکورہ صدر گارڈن پارٹی کی طرح ہوتی ہیں۔ اس پارٹی میں جن تکلفات اور آرائشوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے قطع نظر کیجئے اور غیر جانب دار ناقد کی حیثیت سے نظر ڈالیئے تو نظر آئے گا کہ حقیقتہً گورا کالے سے کترا رہا ہے ساڑی سائے سے نہیں مل رہی ہے۔ مشرق اور مغرب ملتے نظر نہیں آتے۔

یاد رکھئے اس میں انگریزوں کا کوئی قصور نہیں ہے ــــــ رتی برابر قصور نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انگریز مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے اور ہندوستانی ہاتھ ملانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مثال موجود ہے۔ پہاڑی مقامات میں کلب مخلوط قسم کے ہیں تمام ارکان ساوی طریقہ پر ملتے جلتے ہیں بشرطیکہ چندہ باقاعدہ طور پر ادا کر دیا جائے۔ نہ کوئی کچھ چون و چرا کرتا ہے اور نہ کسی کو کوئی خصوصی حقوق دیئے جاتے ہیں۔

نظری حیثیت سے اس حد تک تو درست ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ

عملاً کیا ہوتا ہے۔ ہندوستانی مرد اپنی بیویوں اور لڑکیوں کو کلب نہیں آنے دیتے وہ خود ہر رات آئیں گے۔ انگریز عہدہ داروں کی بیویوں کے ساتھ ناچیں گے لیکن اِن کی بیویاں مکانوں پر ٹھہری رہیں گی۔ اِس سے انگریزوں کو تکلیف ہوتی ہے، خصوصاً نوجوان مردوں کو نسبتہً ترقی یافتہ ہندوستانی مردوں سے گھروں میں بھی عورتوں کو باہر سامنے نہیں آنے دیا جاتا۔ گویا کہ اگر ایسا موقع دیا جائے تو کوئی ان کو دبوچ لے گا۔

یہ چیز محتاج بیان نہیں کہ یہ چیز کوفت کا باعث ضرور ہوتی ہے مگر یہ اسی قسم کی کوفت ہے جو ہندوستانیوں کو اس وقت برداشت کرنی پڑتی ہے جب وہ اِنگلستان میں رنگ کے تعصب کا شکار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی کوفت کے اِحساس کو یاد دلانے کے لئے مفید ہوگا کہ ہم انگریز بھی اس کا مزا چکھیں۔

سب سے اہم سوال جو ہم کر سکتے ہیں یہ ہے کہ اینگلو انڈین لوگوں کے متعلق آپ کے کیا اِحساسات ہیں۔

اس سوال کے جواب سے غالباً پکے صاحب کی صحیح ذہنیت عیاں ہو جائے گی۔

۴

ہندوستان میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار اینگلو انڈین[1] ہیں اور غالباً یہ دنیا میں سب سے زیادہ کم نصیب جماعت ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ

---

[1] اینگلو انڈین حقیقتہً دوغلوں کا ایک مہذب نام ہے۔ دس میں سے نو صورتوں میں باپ انگریز ہوتا ہے اور ماں ہندوستانی۔ انگریز عورتوں کی ہندوستانی مردوں سے

لاابالی ہولا، دلاالی ہولا۔ گولی خواہ نشانہ پر ٹھیک بیٹھے یا نہ بیٹھے ان کی ہر صورت میں ہار ہے۔ انسان کی غیر رواداراںہ فطرت اور اس کے دماغ کے پرغرور اور غیر منطقی ہونے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپنے ان سوتیلے بھائیوں کو انگریز اور ہندوستانی دونوں ہی تحقیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

اور سب سے بدتر چیز یہ ہے کہ یہ خود اپنے آپ کو نفرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

ان کا خیال جو خبط کی حد تک پہنچا ہوا ہے یہ ہے کہ کالی نسل سے اپنی بے تعلقی ظاہر کریں۔

یہ صورت حال المناک نہ ہوتی تو مضحکہ خیز ضرور ہوتی۔ میری ایک اینگلو انڈین نرس سے واقفیت ہو گئی۔ وہ بہت خوب لڑکی تھی بڑی متین، صلاحیت والی اور سانولے پن کے ساتھ حسین۔ اس کی نسل کے متعلق کچھ شبہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے بالوں، آنکھوں اور ہاتھ کی ہتھیلیوں سے یہ چیز صاف عیاں تھی۔ لیکن اگر آپ اس کی گفتگو سنتے تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنا شجرۂ نسب کسی نجیب الطرفین بڑے انگریزی خاندان سے ملاتی ہے۔

کبھی کوئی ملازم غلط دوا لے آتا یا بہتر کام میں سستی دکھاتا تو وہ برہم ہو کر کہتی "یہ ہندوستانی! آخر آدمی ان لوگوں کے ساتھ کیسے گزارا کر سکتا ہے؟"

اس لڑکی کا باپ انگریز تھا اور ماں ہندوستانی وہ مجھے ایسی تصویر یا

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۳۶۹) شادی کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ایک لاکھ چالیس ہزار کی تعداد حقیقی تعداد سے کم ہی ہے۔ کیونکہ اینگلو انڈین اپنے آپ کو اینگلو انڈین کہتے جھجکتے ہیں اور اپنے رنگ کی اصلیت کو چھپانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں۔

دکھایا کرتی تھی جس میں وہ اور اس کا باپ ساتھ ساتھ نظر آتے۔ ان تصویروں میں ماں تو کبھی دیکھنے ہی میں نہیں آتی۔ صرف ایک مرتبہ میں نے اس کی جھلک دیکھی۔ ایک حقیر سی کالی عورت تھی جو دور پس منظر میں کھڑی نظر آتی تھی۔ جونہی تصویر سامنے آئی لڑکی نے جلدی سے ورق الٹ دیا۔

اینگلو انڈین لڑکیوں کو اس قسم کے جملے کہنا بہت پسند ہیں جیسے "یہاں ہندوستان میں آئے ہوئے مجھے بہت عرصہ ہوا" یا یہ کہ "وطن سے میرا رابطہ بالکل چھوٹ گیا ہے" مگر واقعہ یہ ہے کہ ان غریبوں نے انگلستان کی تو کبھی صورت بھی نہیں دیکھی۔ لیکن وہ اس کا اعتراف کرنے پر موت کو ترجیح دیں گی۔

ایک اور جملہ جو اکثر ان کی زبان سے سنائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ "میری رگوں میں ہسپانوی خون ہے" یہ چیز ہے جو سانولی رنگت اور سیاہ بالوں کی توجیہہ کے لئے مفید ہوتی ہے۔ بعض لڑکیاں تو اپنی زبان کے کچھ الفاظ بھی سیکھ لیتی ہیں اور گفتگو میں وقتاً فوقتاً ان کو استعمال کرتی ہیں۔

بدن کے رنگ کو سفید کرنے کے لئے جو مرکبات فروخت ہوتے ہیں ان میں سے ایک کے اشتہار کی سرخی ملاحظہ ہو:۔

"چار ہفتوں میں چار درجہ رنگ سفید ہو جاتا ہے"

اینگلو انڈین لڑکیاں اپنی آمدنی کا ایک بیش قرار حصہ ان مرکبات پر صرف کرتی ہیں۔ ان کی فروخت میں طرح طرح کی جدت سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک اور رنگ سفید کرنے والے مرکب کا موجد لکھتا ہے۔

"آپ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کیجئے کہ اگر پیدائشی طور پر آپ کا رنگ سیاہ ہے تو آپ کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔ فلاں مقوی جلد مرکب کی ایجاد نے خوبصورتی بڑھانے کے فن میں انقلاب پیدا کر دیا ہے"

ان مرکبات کے موثر ہونے یا نہ ہونے کی بابت رائے دینے کا میں اہل نہیں ہوں۔ لیکن ان میں جو خواص بیان کئے جاتے ہیں ان سب پر عمل کرنے کے باوجود بھی اینگلو انڈین لڑکی اینگلو انڈین کی حیثیت سے پہچانی جا سکتی ہے۔ مثلاً وہ اپنی آواز نہیں چھپا سکتی۔ اس کی آواز میں ایک عجیب و غریب قسم کے تیز نغمہ کی سی کیفیت ہوتی ہے خصوصاً جب وہ ہنستی ہے اور گو وہ پیدائشی طور پر صبیح اللون ہو لیکن اس کی جلد میں ہمیشہ گندمی رنگ کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ گویا کہ اس کی رگوں میں شہد جھلک رہا ہے بعض دفعہ یہ چیز بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ہاتھی دانت پر شمع کی روشنی پڑ رہی ہے۔ لیکن یہ چیز قطعاً مشرقی ہے۔

ان لڑکیوں کی بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی حیلہ سے کسی انگریز سے شادی کر لیں۔ وہ انھیں اس مشکوک موقف سے جس میں وہ "نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے" کی مصداق بن کر رہتی ہیں نکالکر کسی طرح اور کہیں لے جائے۔ جنگ کے بعد سے تو قدرتی طور پر اس جذبہ میں اور بھی تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ انگریز اور امریکن سپاہیوں کے پاس بکثرت شادیوں کے پیش کش آتے ہیں۔ جس کے ساتھ کافی نقدی کی بھی لالچ دی جاتی ہے۔

اگر کوئی لڑکی اس قسم کا پیش کش کرتی ہے تو اسے ملامت نہیں کیجا سکتی خصوصاً اگر وہ ذرا سمجھ بوجھ کی لڑکی ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ اگر وہ ایسا نہ کرے گی تو آیندہ اس کا راستہ گرشتے میں ہوگا۔ ان کی جو بہنیں سفید فام اشخاص سے شادی کرنے میں ناکام رہی ہیں ان کا حشر اس کے سامنے ہوتا ہے۔ یا تو انھیں ناکتخدائی کی حالت میں تنہائی کی زندگی بسر کرنی

پڑتی ہے، جس میں وہ اپنے فخر کو اپنے فقر کا سعادمندہ سمجھ لیتی ہیں۔ یا پھر انھیں کسی ہندوستانی گھرانے میں شادی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا اقدام ہوتا ہے جس پر انھیں بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہندوستانی اقربا اس سے نفرت کرتے ہیں اور اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ نہ وہ اس سے اپنوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ اگر اس کے کوئی لڑکا ہو جائے اور اپنے نانا کی طرح سفید فام ہو جیسا کہ بعض دفعہ ہوتا بھی ہے تو لوگ اس سے اور بھی بھڑکتے ہیں اینگلو انڈین کیتھولک مدرسوں میں بھی اُسے بیگانہ سمجھا جاتا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اس کے جھوٹے تفاخر کا حجاب اٹھتا جاتا ہے اور اس کے جذبات تلخ ہوتے جاتے ہیں۔ جوانی تک پہنچتے پہنچتے بے راہ روی اس کی طبیعت کا جزو بننے لگتی ہے، وہ شہر کے چھٹے ہوئے لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھ کر شرابیں پیتا ہے، دیسی قہوہ خانوں میں جاکر جھگڑے کرتا ہے اور بازاری ہندی زبان میں گالی گلوچ کرتا ہے۔

پہلی نسل کے اینگلو انڈین لوگوں کی جو یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ ان کا باپ انگریز ہے اتنی بری حالت نہیں ہوتی۔ اس امر کی ضمانت کے لئے کہ انھیں سوسائٹی میں نہ سہی تو سرکاری طور پر قابل عزت سمجھا جائے۔ سرکاری ملازمتوں خصوصاً پولیس اور ریلوے میں قابل لحاظ تعداد میں ملازمتیں ان کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض اشخاص نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر بہت بڑی حیثیت اور دولت حاصل کرلی ہے۔ لیکن اینگلو انڈین جماعت کے بڑے حصہ کا مستقبل کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہے۔

گو ہمیں ان سے ہر طرح کی ہمدردی ہے تاہم اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بہت سی مشکلات ان کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں ـــــــ

——— ان کی طبائع میں جو احساس کمتری راسخ ہو گیا ہے اس کی وجہ سے وہ اپنے ہندوستانی ماموں زاد خالہ زاد بھائیوں کے مقابلہ میں تفوق کے دعویدار رہتے ہیں اور ان سے اپنے آپ کو علیحدہ قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں ——— حکومت سے وفاداری کے اظہار میں مضحکہ خیز حد تک شدت دکھاتے ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی راج کو بھی کسی حد تک اس نامناسب صورت حال کا ذمہ دار خیال کیا جا سکتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے یا یوں کہئے کہ ۱۸۵۷ء کی اس ذہنیت کی باقیات میں سے ہے جبکہ ہندوستانیوں کو ذلیل دیسی سمجھا جاتا تھا اور چند چلے ہوئے دماغ کے لوگ اپنے آپ کو ہندوستانیوں کی فلاح و اصلاح کا واحد اجارہ دار سمجھتے تھے۔ یہ طرز عمل جو غیر مفید بھی ہے اور غیر انسانی بھی، ولندیزی قوم نے اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے ابتدا سے دونوں قوموں کے درمیان باہمی شادی بیاہ کی ہمت افزائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولندیزی نوآبادیات کے یوریشین خود دار اور قوی طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں اور ولندیزیوں کے مقبوضات کے استحکام میں بہت مفید عنصر ثابت ہوئے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم بھی ولندیزیوں کی مثال کی تقلید کرتے تو کیا نتیجہ ہوتا۔ فرض کیجئے ہم بڑی تعداد میں مشرق اور مغرب کے لوگوں کی باہمی شادی کو رواج دیتے اور ایک کثیر التعداد اینگلو انڈین جماعت کو عالم وجود میں لاتے جسے خاص خاص حقوق اور مراعات حاصل ہوتے۔ یہ بہت سی دلچسپ قیاس آرائیوں کے منجملہ ایک قیاس آرائی ہے جس پر مورخ خامہ فرسائی کر سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ چیز آئندہ ہمیشہ کے لئے قیاس آرائی کی حدود سے تجاوز نہ کر سکے گی اب اس قسم کے عملی تجربہ کا وقت باقی نہیں رہا۔ انگریزوں کی قوت کا دریا تیزی سے

اتار رہے ہے اور اینگلو انڈین حالت بیچارگی میں ساحل پر کھڑے خالی سمندر کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دوستوں کا کوئی جہاز آتا ہوا دکھائی دے۔ لیکن افسوس کہ اس قسم کا کوئی جہاز اب ہندوستان کے ساحل کی طرف نہیں آئے گا۔

چھٹا باب

متفرقات

اِس قسم کی کتاب میں جگہ جگہ بہت سی باتوں کا چھوٹ جانا ناگزیر ہے یہ کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اُس خیال کے لوگوں کی تائید کرتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ "آدمی ہندوستان میں کم از کم تیس سال تک رہے جب اِس ملک کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کے قابل ہو سکتا ہے" میں تو اِس خیال کا آدمی ہوں کہ اگر کوئی شخص تین سو سال تک بھی ہندوستان میں رہے تب بھی وہ اپنے معلومات مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہ ملک اِتنا وسیع ہے اور اس کے حالات اِتنے پیچ در پیچ ہیں کہ اگر تحقیق کرنے والوں کی ایک پوری فوج کو عمر نوح عطا فرمائی جائے اور یہ جماعت اِس طویل مدت میں سخت تن دہی سے ہندوستان کے حالات کے متعلق تحقیقات جاری رکھے تب بھی چند

سطحی معلومات کے سوا، کچھ اور اس کے ہاتھ نہ لگ سکے گا۔

ایک تن تنہا کام کرنے والا اس کے سوا، اور کیا کرسکتا ہے کہ اس ملک کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ تیار کرے اور اس میں ان چند امور کو واضح طور پر پیش کرے جو اس کو نہایت اہم اور نمایاں معلوم ہوں۔

ہماری کوشش بھی یہی ہے۔ ہمارے خاکہ میں کچھ نقوش غیر واضح ہیں۔ اس باب میں ہم ان نقوش کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہندوستان پر جو لوگ کتابیں لکھتے ہیں وہ سب ایک مسئلہ کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم اس غلطی کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتے اور اس لئے اس باب کو ہم اس مسئلہ کے لئے وقف کرتے ہیں۔

ریاستیں

اگر ہندوستانی مسائل سے متعلقہ دارالعوام کے مباحث کا مطالعہ کیا جائے تو پہلی نظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اکثر مقررین اس حقیقت سے قطعاً لاعلم ہیں کہ اس ملک کے رقبہ کا تقریباً ۲/۵ حصہ انگریزوں کے زیر حکومت نہیں بلکہ روساء کے زیر اقتدار ہے۔ اس رقبہ کے باشندوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے[1]۔ اگر کبھی وہ اپنی تقریروں میں ہندوستانی ریاستوں کا ذکر

---

[1] ہندوستانی ریاستوں کی مجموعی تعداد ۵۶۲ ہے۔ لیکن کم از کم ایک تہائی ریاستیں بالکل غیر اہم ہیں اور ایک سو سے کچھ زیادہ تو اتنی چھوٹی ہیں کہ ان کو جاگیرات، کہنا زیادہ مناسب ہے، لیکن حیدر آباد، کشمیر، میسور جیسی ریاستیں کافی وسیع رقبہ پر مشتمل ہیں اور بمقابلہ کئی ایک یورپی ملکوں کے ان کی آبادی زیادہ گنجان ہے۔

کرتے بھی ہیں تو مغرورانہ اور مُربیانہ انداز میں کہ گویا ہندوستانی ریاستیں صرف
ان ہی کے سہارے باقی ہیں اور اگر وہ ان کی سرپرستی کرنا چھوڑ دیں تو کانگریس
ایک معمولی سے اِشارے میں ان ریاستوں کو ملک کے نقشہ سے محو کر ڈالے گی
وہ کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ آیا یہ امر مناسب بھی ہے یا نہیں کہ ریاستوں
کو مٹا ڈالا جائے یا فرض کیجئے کہ مٹا یا جائے تو اس کے لئے کیا تدابیر اِختیار کی
جائیں، وہ یہ سوچتے ہیں کہ ریاستوں کو فنا کے گھاٹ اتارنے والا کون ہے اور
نہ ان کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی شدید تدابیر کے عواقب
و نتائج کتنے خطرناک ہوں گے ۔

کیا ہندوستانی ریاستوں کی تائید میں کچھ کہا جا سکتا ہے؟
اس سوال کا جواب یقیناً اِثبات میں ہوگا اگر ہم ایک عملی اِنسان کی طرح
غور کریں ۔ یہ مسئلہ ہماری اوّلین توجہ کا محتاج ہے ۔ اِس مسئلہ کے حل کا بہترین طریقہ
یہ ہے ہم کسی ایک ریاست میں جائیں اور چشم دید واقعات کی بناء پر اپنی رائے
قایم کریں ۔

۲

بلاری سے بنگلور کی طرف سفر کرتے ہوئے تقریباً ۵ بجے شام میں اگر
ریل گاڑی کی کھڑکی کھول کر باہر کی طرف دیکھو تو اس خطہ کے حالات تم کو کچھ
اور ہی طرح کے نظر آئیں گے اس سے ہماری مراد جغرافیائی حالات کی تبدیلی
نہیں ہے ۔ بلکہ اس خطہ کے بدلے ہوئے سماجی حالات کی طرف توجہ دِلانا
ہمارا مقصود ہے ۔ فاقہ زدہ چوپایوں، پتھریلے میدانوں اور تباہ حال دیہاتوں
کے دیکھنے کے بعد اچانک، خوش نما مناظر سامنے آجاتے ہیں اور لہلہاتے کھیت

سرسبز چراگاہیں، چھپر کے صاف ستھرے مکانات اور ایسے موٹے تازے مویشیوں کے گلے جن پر ہمارے ملک والے بھی فخر کرسکیں دیکھنے والوں کی نظروں کو تازگی بخشتے ہیں۔ یہ تغیر ایسا حیرت انگیز ہوتا ہے کہ متجسس آدمی اپنے دل میں یہ سوال کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کے کیا اسباب ہیں؟ جواب یہ ہے:۔

"برطانوی ہندوستان کے علاقہ کو پار کر کے ہم ریاست میسور میں داخل ہوگئے ہیں"

ان واقعات کا ردعمل ایک انگریز پر جو کہ پہلی مرتبہ ان کو سنتا ہے، ضرور پریشان کن ہوتا ہے ــــــ یا یوں کہو کہ ہونا چاہیئے ــــــ وہ اپنے دل میں سوچتا ہے کہ اگر ریاست میسور کی خوش حالی اور برطانوی ہند کی فلاکت میں اتنا غیر معمولی فرق ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان میں انگریزی راج اندھیر راج ہے۔"

ہم عنقریب اس سوال پر بحث کریں گے۔ یہ ایک موزوں اور برمحل سوال ہے اور ضرور اس کا جواب ہونا چاہیئے فی الحال تھوڑی دیر کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان سرسبز کھیتوں اور خوش حال دیہاتوں ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں ــــ کیونکہ یہ چیزیں ان ہندوستانی ناقدین کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں جو حقارت آمیز لہجہ میں کہتے ہیں ہندوستانی ریاستیں دقیانوسی زمانہ کی یادگاریں ہیں اور کچرے کے ڈھیر ہیں جو کانگریسی غیظ و غضب کی آگ کی نذر ہونی چاہئیں۔

بنگلور ایک جدید طرز کا شہر ہے، بجلی سے خوب روشن، پختہ سڑکوں سے آراستہ اور ــــــ ہندوستانی معیار پر ــــــ اچھا خاصا

صاف ستھرا۔ ناقابل بیان غلاظت جو اکثر ہندوستانی شہروں کے راستوں میں بکھری پڑی رہتی ہے، بدبودار گندے نالے اور غلاظت کے ڈھیر جن پر مکھیاں بھنکتی رہتی ہیں ـــــ بنگلور ان سب سے پاک ہے تباہ حال کتوں کی فوج ـــــ بیماری اور غلاظت کا خزانہ ـــــ بھی یہاں نظر نہیں آتا ہم نے سنا کہ مہاراجہ نے جو بڑے مذہبی آدمی ہیں، اپنے مذہبی جذبات کے خلاف اس حد تک اخلاقی ہمت وجرات دکھائی کہ اس بدنصیب مخلوق کی ایک بڑی تعداد کو زندگی کے عذاب سے نجات دلائی۔

شہر میسور کا بھی یہی حال ہے ـــــ دواخانے، تحقیقاتی ادارے صنعت وحرفت کے مدارس ـــــ اِکّا دُکّا نہیں بکثرت اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پائے جاتے ہیں۔ اگر موٹر میں سوار ہوکر شہر سے باہر نکلو تو تم دیکھو گے کہ چوڑی چوڑی اور صاف ستھری سڑکیں لہلہاتے کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی میلوں چلی جاتی ہیں۔ آبپاشی کے ایک وسیع نظام کی بدولت جہاں تک آنکھ کام کرتی ہے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ سڑکوں اور کچے راستوں کے کنارے گاؤں آباد ہیں جو ـــــ ہندوستانی معیار کے مطابق ـــــ اچھے خاصے صاف ستھرے ہیں۔

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ مظاہر ایک سیاح کو متاثر کرسکتے ہیں جو کم وقت میں ہر چیز سے واقف ہونا چاہتا ہے بہت ممکن ہے کہ محل کے اس شاندار دروازہ کے اندر شاہانہ استبداد اپنی بدترین صورت میں پرورش پا رہا ہو۔

یہ بالکل ممکن ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے واقعہ ایسا نہیں ہے۔ ریاست اور حکومت کے میدان میں بھی نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے وہی اعلیٰ معیار قایم رکھا گیا ہے۔ ریاست میسور کے نمایندہ اداروں کا صرف اس وجہ سے مذاق اڑانا کہ عاملہ مقننہ کے روبرو صحیح معنی میں جواب دہ نہیں ہے، بالکل لغو ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی دارالامرا کی افادیت کا انکار کرے۔

نظری حیثیت سے دارالامرا کے وجود کی ضرورت ثابت کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن عملاً کم از کم آجکل تو وہ بہت اچھی خدمت انجام دے رہا ہے اگرچہ میسور کی مجلس عاملہ کی وہ حالت ہے جو اس صدی کے شروع میں دارالامرا کی تھی، تاہم عاملہ کے ارکان عوام کی منتخب کردہ مقننہ کے مقابل صف آرا ہونے کی ہمت نہیں کرتے کیونکہ ارکان مقننہ اپنی طاقت سے واقف ہیں میسور کی مجلس قانون ساز کے مباحث کے مطالعہ سے اس شخص کا پردہ فریب چاک ہو سکتا ہے جو یہ فرض کئے بیٹھا ہے کہ جمہوری نظام ہندوستانی ریاست کی فضا میں پرورش نہیں پا سکتا۔ یہاں کی مجلس قانون ساز کیا بلحاظ خطابت اور کیا بلحاظ فہم عام بہت سی مجالس قانون ساز پر فائق ہے جس وقت میسور پہنچا "اجتماعی جرمانہ" کا مسودۂ قانون اسمبلی میں پیش تھا۔ اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ ان گاؤں والوں پر اجتماعی جرمانہ، لگایا جائے جنھوں نے فساد میں حصہ لیا تھا۔ اگرچہ ایک حد تک بحث کرنے والوں کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ برطانوی رپورٹ کے صفحات بھی اس سے زیادہ متوازن اور معتدل قانونی بحث کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ اختتام پر تقسیم آرا سے معلوم ہوا کہ (۳۴)

رائیں مسودۂ قانون کی تائید میں تھیں اور (۲۱) مخالفت میں۔ مخالف جانب سے چند نازک اور اہم ترمیمات پیش ہوئیں جو سب کی سب مسترد کر دی گئیں۔

اِس قسم کی اعلیٰ مثالوں سے روشن خیال جمہوریت کو ——— بلکہ کہنا چاہیئے روشن بادشاہت کو ——— تقویت پہنچتی ہے، اگرچہ یہ لازم نہیں ہے کہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد ہوں۔

میں نے میسور کو ہر زاویہ سے دیکھا۔ میں نے مہاراجہ کے محل سے اپنا کام شروع کیا۔ وہ محل بھی کیا محل ہے! دن میں وہ ایک نہایت خوش نما شادی کے کیک کی طرح نظر آتا ہے۔ اور رات کے وقت برقی قمقموں کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پریوں کے سرزمین میں پہنچ گئے ہیں۔

مہاراجہ خود شائستگی اور خوش خلقی کا ایک مجسمہ ہیں وہ برطانیہ کے طرفدار نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ ہندوستان میں ہماری حکمت عملی پر انھوں نے چند آزاد اور دانشمندانہ تنقیدیں کیں لیکن یقیناً وہ میسور کے طرفدار ہیں۔ ان کے وزراء میں سے اکثر ایسے ہیں جو کسی برطانوی کابینہ میں اپنے کو ممتاز ثابت کرسکتے ہیں ——— ممکن ہے کہ یہ ان کی دورخی تعریف ہو یہ وزراء بڑی فیاضی کے ساتھ سماج کے مختلف طبقوں میں سے چنے گئے ہیں۔ ان میں سے چند نے اپنے اِس عزم کا اظہار کیا کہ ریاست میسور ہرگز کانگریس کے پنجوں میں نہیں پھنس سکتی۔ انھوں نے اِس خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا "وکیلوں کا راج ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے"۔

میسور میں میں نے ہر چیز سے واقفیت حاصل کی ——— کسان

ان کی بیویاں، ان کے بچے، ان کے گھر، ان کے کھیت، ان کے کام کے اوقات نیز ان کے کھیل کے اوقات اور عبادت کے اوقات کا بھی میں نے بغور مطالعہ کیا۔ شہر سے کچھ دور فاصلہ پر ایک پہاڑی ہے۔ اس پر ایک جوگی رہتا ہے کہتے ہیں کہ تیس سال سے وہ وہاں غار میں تپسیا کر رہا ہے۔ دور دور سے لوگ اس کے درشن کے لئے آتے ہیں۔ میں بھی مجمع کے ساتھ مل کر جوگی کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ کسی نے تکلیف محسوس نہیں کی اور مجھ کو گھور کر نہ دیکھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ لوگ سب چلے گئے اور مجھ کو جوگی کے ساتھ تنہائی میں ملاقات کا موقع ملا۔ میں غار میں گھسا اور کبڑا ہو کر غار کی پست چھت کے نیچے بیٹھ گیا۔ غار کی چھت اور دیواروں پر جگہ جگہ عطریات کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ جوگی اگرچہ بوڑھا اور کثرت ریاضت کے باعث نحیف الجثہ تھا لیکن نہایت وجیہہ اور حسین۔ کچھ الفاظ اور کچھ اشاروں میں ہم بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اس نے خاص دلچسپی کی کوئی بات نہیں کہی۔ اس لئے چند ایسے واقعات کی طرف اشارے کئے جن سے ہر شخص واقف ہے۔

مثلاً اس نے کہا "جنگ ایک عذاب ہے اور انسان شہر اور خبا ثت میں مبتلا ہے"۔ بہر حال یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس نے کیا کہا۔ اس کی صورت نہایت جاذب نظر تھی۔ کاش اس کو کسی عجائب خانہ میں شیشہ کی الماری میں رکھا جاتا، تاکہ ناظرین اس کو ہر طرف سے دیکھ سکتے۔

۳

بحیثیت مجموعی کانگریس ریاستوں کی مخالف ہے۔ کانگریس کا دعویٰ ہے کہ ریاستیں برطانوی حکومت کی پناہ گاہیں ہیں۔ نیز کانگریس نے اس خیال کو شہرت دی ہے کہ ریاستیں برطانوی حکومت کی پیداوار ہیں۔

درحقیقت ریاستیں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہیں اِس قسم کا دعویٰ کرنیوالا تاریخ ہند کے ٹھوس واقعات سے اپنی جہالت کو آشکارا کرتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں مغل شہنشاہیت کے زوال کے وقت جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کی تو اس نے نظام اور مرہٹوں جیسے ہندوستانی روساء کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تاکہ ان کی مدد سے ہندوستان میں فرانس کی بڑھتی ہوئی طاقت کی روک تھام کر سکے۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی سیاسی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ جن سیاسی حالات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اعانت کی، بعینہٖ انھیں حالات نے ان دیسی حکمرانوں کی آزادی کو مستحکم کیا، جو اس وقت تک برائے نام دہلی کے مغل شہنشاہ کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ اس طرح اگر بڑی ہندوستانی ریاستوں کی اکثریت، قدیم ہندوستانی شہنشاہوں کی بقیۃ السلف نہیں ہے تو وہ برطانوی حکمت عملی کی پیداوار بھی نہیں ہے۔

یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ کانگریسی پروپیگنڈا کرنے والے حالات کی غلط ترجمانی کرنے میں کہیں ایسی پست ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کرتے جیسی کہ ریاستوں کے بارے میں کرتے ہیں۔ ہم ہزار میں سے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ کانگریسی ادب کی کثیر الاشاعت کتابوں میں سے ایک وہ

رسالہ ہے جس کا نام ہے "ہندوستان کے متعلق پچاس واقعات" ——————

—————— یہ رسالہ جواب ہے اسی نام کے ایک رسالہ کا جو برٹش انفارمیشن سروسیس ان امریکہ ——————

کی طرف سے شایع ہوا تھا اور اس کا ذیلی عنوان تھا۔

"ہندوستان میں سیاسی اور معاشی دوزخ"

بلا ایسا سفید جھوٹ ہے کہ ڈاکٹر گوئبلز جیسوں کو بھی اس کی لیاقت پیدا کرنا تو درکنار، اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ وہ اس قسم کی دروغ مصلحت آمیز سے بھرا پڑا ہے: "ہندوستانی زبان جاننے والا ملک کے گوشہ گوشہ میں اپنے مافی الضمیر سے دوسروں کو آگاہ کر سکتا ہے" یہ بیان ایسا ہی درست ہے جیسے یہ دعویٰ کہ جاپانی زبان ایک آئرستانی کے لئے قابل فہم ہے۔ بہرحال اس وقت تو اس رسالہ کے صرف وہی بیانات ہمارے پیش نظر ہیں جو ہندوستانی ریاستوں سے متعلق ہیں۔ واقعات تو یہ ہیں کہ میسور معاشی حیثیت سے ملک میں سب سے زیادہ خوش حال علاقہ ہے، ٹراونکور، کوچین اور بڑودہ نے تعلیم کا بلند ترین معیار قائم کر رکھا ہے، حیدرآباد تعلیم اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لحاظ سے بہت پیش پیش ہے، بہت سی دوسری ریاستوں میں ترقی کی علامات رونما ہو چکی ہیں جن کا کانگریس کے زیر اقتدار علاقوں میں نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ ان حقائق کے باوجود مذکورۂ صدر کتابچہ میں بالا ہتیاز سب ریاستوں کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں رائے قائم کی گئی ہے:-

"وہ گندے پانی کے گڑھے ہیں۔ وہاں ناانصافی اور رجعت پسندی کا دور دورہ ہے۔ بد معاشی اور

پست ذہنیت کے اشخاص وہاں مطلق العنان ہیں جن پر
کوئی روک ٹوک نہیں ہے "

۔ یہ صحیح ہے کہ چند رئیس بد اخلاق اور نا اہل ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جب ان کی بد اخلاقی اور نا اہلیت کا یقین ہو گیا تو برطانوی حکومت نے ان کے معزول کرنے میں اپنی طاقت کا استعمال کیا۔ اس قسم کا ایک شخص رئیس الور تھا۔ ظلم پسندی اور خونخواری میں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ ایک ہندوستانی خاتون نے جو رئیس الور سے اچھی طرح واقف تھیں مجھ سے بیان کیا کہ نہایت بیدردی سے اس نے اس گھوڑے کو پیٹتے پیٹتے مار ڈالا جو ایک مقابلہ میں بازی نہیں لیجا سکا تھا۔ آپ جانتے ہیں اس وحشی کی بابت مذکورۂ صدر کتاب میں کیا لکھا ہے؟ سنیئے پڑھیئے :-

" رئیس الور معزول کر دیئے گئے صرف اس لئے کہ
وہ ایک وطن پرست ہندوستانی تھے "
یہ بیان تشریح سے مستغنی ہے۔

۴

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ایک غیر جانبدار انگریز حسب ذیل سوال کے دیانتدارانہ جواب کی خواہش کرتا ہے ——— "ایسا کیوں ہے کہ چند ریاستیں تعلیم اور صنعتی ترقی وغیرہ میں برطانوی ہند پر فوقیت رکھتی ہیں؟" اس سوال کا جچا تلا اور برجستہ جواب کوئی نہیں ہے۔ کانگریس کا جواب یہ ہے کہ ریاستوں کا راج، اگرچہ وہ کیسا ہی برا ہو کم از کم برطانوی راج سے

بہتر ہے، اس اصول پر کہ ایک برا ہندوستانی جابر رئیس سول سروس کے اچھے برطانوی حاکم کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دعویٰ کرنا واقعات کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ اس سوال کا صحیح اور ٹھیک ٹھیک جواب نہایت پیچیدہ ہوگا اور اس کے لئے ہمیں تاریخی واقعات کے ایک طویل سلسلہ پر نظر ڈالنی ہوگی۔ ایک عام اور سرسری بات تو یہ ہے کہ بعض ریاستوں میں اس قسم کی خوبیوں کا جمع ہو جانا شخصی حکومت کے ایک مخصوص دور کی رہین منت ہے۔ ریاست میسور ہمارے پیش نظر ہے۔ ۱۷۹۹ء میں اس ریاست کا برطانیہ سے معاہدہ ہوا۔ ریاست کی ترقی کے بہت نازک دور میں کئی حکمران کم عمر تھے۔ خوش قسمتی سے ان کے برطانوی اتالیق غیر معمولی طور پر روشن خیال واقع ہوئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ حکمرانوں کی صغر سنی کے زمانہ میں ان کے اتالیقوں نے ریاست کی سیاست کو اپنے سانچوں میں ڈھالا، بلکہ انھوں نے اپنے اعلیٰ خیالات کے نقوش کم عمر مہاراجاؤں کے دماغوں میں ثبت کر دیئے اور اس طرح انھوں نے اپنے اثر کو مہاراجاؤں کی پوری زندگیوں پر وسیع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان "نام نہاد" جابروں" نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی تو انھوں نے قدیم طرز کے وسیع النظر راجاؤں کی طرح حکومت کی نہ کہ مشرقی ظالم بادشاہوں کی طرح۔

دوسری بات یہ ہے کہ میسور کی صنعتی ترقی کے مقابلہ میں برطانوی ہند کے علاقے پس ماندہ معلوم ہوتے ہیں سنجیدہ تنقیح کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ بڑی حد تک میسور کی صنعتی ترقی اس علاقہ کے طبعی حالات کی رہین منت ہے۔ ان میں دو بہت نمایاں یہ ہیں:-

ایک تو وہاں کی معتدل آب و ہوا جو ہندوستان جیسے ملک کے لئے

بہترین نعمت ہے۔

دوسرے آبی طاقت کا وجود جس کی بدولت آبی برقی طاقت کا ایک وافر ذخیرہ ریاست کو میسر آسکا۔

میسور کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے کم و بیش بڑودہ کے متعلق بھی وہی صحیح ہے۔ آنجہانی گیکواڑ ایک اعلیٰ صلاحیتوں کے انسان تھے اور اپنے طویل دور حکومت میں رعایا کی بہبود کے لئے والہانہ دلچسپی سے کام کرتے رہے۔

کانگریسی پروپیگنڈا کرنے والے ٹراونکور اور کوچین کا بہت ذکر کرتے ہیں اور ان ریاستوں کو بطور نمونہ کے پیش کرتے ہیں کہ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ دیں تو ہندوستانی اس طرح اپنے ملک کا انتظام کر سکتے ہیں کیونکہ ان ریاستوں میں تعلیم علی الترتیب (۵۵) اور (۳۵) فی صد ہے، جبکہ برطانوی ہند میں ۱۲½ فی صد ہے۔

تعلیمی مسائل پر ہم آئندہ فصل میں بحث کریں گے۔ لیکن فی الحال ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ٹراونکور اور کوچین کی ترقی بھی چند غیر معمولی حالات کی بدولت ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ہندوستان بھر میں یہ دونوں ریاستیں بڑی ہی کٹر مذہبی واقع ہوئی ہیں، اور ان کی آبادی برہمنوں کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل ہے۔

اور کچھ اس وجہ سے کہ تاریخی واقعات کچھ اس طرح پیش آئے۔ کہ عیسائی مبلغین نے ان ریاستوں کو اپنا مرکز بنایا۔ تعلیم کی حد تک یہ دونوں ریاستیں بقیہ ہندوستان سے ہمیشہ ہمیشہ پیش پیش رہیں۔

رائے زنی کرنے والا اپنے رجحان طبع کے مطابق ہندوستان میں تعلیمی اعداد و شمار کو جیسا چاہے استعمال کر سکتا ہے ——— چاہے اس سے کچھ ثابت کرے اور چاہے کچھ بھی ثابت نہ کرے۔ بہت سے مصنفین

تعلیمی اعداد وشمار کا حوالہ دیتے ہیں لیکن اس امر کی ذراسی بھی کوشش نہیں کرتے کہ ان تاریخی وجغرافیائی پس منظروں سے واقفیت بہم پہنچائیں جن کے مقابلہ میں یہ اعداد وشمار رکھے گئے ہیں۔ صوبہ اڑیسہ کی پس ماندگی کا ذکر سنکر وہ توبہ توبہ پکارتے ہیں اور یقیناً وہ اس حقیقت سے غافل ہوتے ہیں کہ یہ علاقہ ناقابلِ عبور جنگل پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان کے قدیمی باشندے بھرے پڑے ہیں صوبہ بمبئی کی جہالت کا بھی وہ بڑے زور شور سے ذکر کرتے ہیں۔ گویا کہ صرف شہر بمبئی ان کے پیش نظر ہے حالانکہ اعداد وشمار پورے صوبے سے لئے گئے ہیں جو قبیلوں اور زبانوں کی پریشان کن تقسیم در تقسیم پر مشتمل ہے، اور یہ قبیلے اور زبانیں ایسے دور افتادہ مقامات میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں تک موجودہ حمل ونقل کے ذرائع میں سے کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔

مستقبل میں ریاستوں کا کیا حشر ہوگا؟

غالباً ریاستیں فنا ہو جائیں گی یا پھر اُن کو اپنی حکومت کے اداروں میں اس قسم کی اصلاحات جاری کرنی پڑیں گی کہ جن سے اگرچہ اُن کی شان وشوکت کم ہو جائے لیکن افادیت ضرور بڑھ جائے گی۔ اگر صرف معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غالباً یہ بات پسند کی جائے گی کہ ریاستیں مٹ جائیں۔ آزاد تجارت کی ترقی میں ریاستیں سدراہ ہیں اور اُن میں وافر دولت کے خزانے جمع ہیں جن کو نفع بخش کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ کوئی ہندوستانی رئیس بت کی طرح سونے کے پہاڑ پر بیٹھا رہے جس کو جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا اتنی وافر دولت رکھنے والوں پر بھی اسی طرح محاصل عائد کئے جائیں جیسے عام دولت مندوں پر کئے جاتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ بعض چھوٹی ریاستوں میں بڑی بے رحمی سے رعایا کے حقوق کی پامالی ہوتی ہے اور انصاف کا بُری طرح خون

ہوتا ہے، شخصی بداخلاقی اور عیاشی کا ذکر ہی کیا ہے جو ناقابل بیان ہے۔ برطانوی حکومت مداخلت کرتی ہے جبکہ حالات ابتر ہو جاتے ہیں عوام کا خیال ہے کہ برطانوی حکومت تاخیر کرتی ہے۔ مہاراجاؤں کے اس قسم کے جذباتی تماشوں کو پہلے ہی دن بند کرا دینا چاہیئے بجائے اس کے کہ ان کو ڈھیل دی جائے یہاں تک کہ سازش اور قتل کے واقعات رونما ہوں۔

بحیثیت مجموعی برطانوی حکومت کا طرز عمل ریاستوں کے ساتھ مبنی برحقیقت ہے۔ ہم نے روساء کو جتا دیا ہے کہ اگر وہ اپنی بقا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ اپنی ریاستوں کے اداروں کو زمانۂ حال کے مطابق بنائیں۔ ہم نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ جدید حالات کی روشنی میں معاہدات نظرثانی کی جائے اور بعض اوقات ہمیں اس مقصد میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔

بہر حال معاہدات گزشتہ سو سال سے قائم ہیں اور اب بھی قائم ہیں ان معاہدات پر دستخط کنندگان میں سے بہت سے روساء نے خود کو برطانوی شہنشاہیت کی وفادار رعایا ثابت کیا۔ خارجی معاملات کو چھوڑ کر اس قسم کے وفادار روساء کو وہ حقوق اور اعزازات عطا کئے گئے جن پر وہ فخر کرتے تھے اور جن کی حفاظت وہ اپنا فرض سمجھتے تھے[1]۔ اگر ان معاہدات کا احترام نہ کیا گیا تو عہد شکنی کے ارتکاب کے علاوہ اس کا خطرہ ہے کہ نتیجۃً ملک میں فساد اور

---

[1] روساء ہند کے ساتھ برطانوی حکومت نے وقتاً فوقتاً جو مواعید کئے تھے شہنشاہ جارج پنجم نے حسب ذیل واضح الفاظ میں ان کی توثیق مزید فرمائی " ان روساء ہند کے مراعات حقوق اور اعزازات کا ہمیشہ احترام کیا جائے گا جو اس کو مقدس اور ناقابل شکست یقین کرتے ہیں "۔

خانہ جنگی برپا ہو جائے۔ بعض روساء ہند کے پاس اچھی تربیت یافتہ فوج ہے جو مرتے دم تک ان کا ساتھ دے گی اگر برطانوی بحیثیت اقتدار اعلیٰ کے نہ رہے اور یک لخت ہندوستان سے دست بردار ہو جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس صورت میں یہ فوجیں کیا قہر ڈھائیں گی۔

ہندوستان کی سرزمین ـــــ برطانیہ کی آمد تک بھی ـــــ صدیوں تک لاتعداد خانہ جنگیوں کی آماجگاہ رہی ہے ـــــ یہ فرض کرنا بالکل بے بنیاد ہے کہ تاریخ خود کو نہ دہرائے گی۔

بہرحال قیاس آرائیوں کے مقابلہ واقعات زیادہ وزن رکھتے ہیں اور ہم نے اس باب میں بہت سے واقعات کا حوالہ دیا ہے جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ہندوستانی ریاستوں کی سچی داستان وہ نہیں ہے جس کا کانگریس ہمیں یقین دلانا چاہتی ہے ریاستوں میں آرائش اور تفریح کے پہلو کے ذکر سے ہم نے قصداً اعراض کیا ہے۔ ورنہ ایک جوشیلا کانگریسی بھی قطعاً اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ ریاستوں کے وہ میلے ٹھیلے اور تماشے یک لخت مٹ جائیں جن کو وہاں کی رعایا بہت عزیز رکھتی ہے اور جن سے وہ اپنا دل بہلاتی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ریاستوں کا فریضہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ سرکس اور تماشگاہوں کا انتظام کریں۔

لارڈ کرزن نے ریاستوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا دہرانا آجکل ضرور مفید ہوگا۔ لارڈ کرزن کے زمانہ سے اب تک دنیا میں بہت سے تغیرات رونما ہو چکے ہیں، لیکن پھر بھی ان کے الفاظ کافی وزن رکھتے ہیں۔ لارڈ کرزن نہ تو حواس باختہ تھے اور نہ وہ خطرہ کی گھنٹی بجانے والے تھے۔ انگریزوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، جتنا وہ اپنے وقت کے ہندوستان کو سمجھتے تھے

ذرا بہت کم ہندوستانیوں نے اس کو سمجھا ہوگا۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں):-

"والیان ریاست نے ہندوستان کی روایتی شجاعت وشہامت کو باقی رکھا ہے اور قدیم اور اعلیٰ خاندانوں کے حسن ودلکشی کو فنا ہونے سے بچالیا ہے۔ وہ اپنی شخصیتوں کے ذریعہ اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ایک اعلیٰ خاندان اب بھی بلند حوصلگی، شجاعت اور خوش اخلاقی کا اعلیٰ معیار پیدا کرسکتا ہے۔ اگر ان چیزوں کو نیست ونابود کردیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی سوسائٹی کا نظام پارہ پارہ ہوجائے گا اور اس کا حال اس شکستہ مستول جہاز کی طرح ہوگا جو موجوں کے تھپیڑوں سے دیکھتے دیکھتے غرق ہوجاتا ہے اور اس کا نام ونشان بھی نہیں ملتا"

تعلیم

تعلیم کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث کرنے کے لئے تو کئی جلدوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کتاب میں زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرسکتے ہیں کہ اس مسئلہ کے چند نمایاں پہلوؤں پر گفتگو کریں۔

ہندوستان میں تعلیم کے متعلق دو نقطۂ نظر ہیں۔ ایک نقطۂ خیال کے لوگ تو کہتے ہیں کہ تعلیم معاشیات کے تابع ہونی چاہیئے کیونکہ بھوکے بچوں کو اخلاقی تعلیم دینا بے سود ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر کے لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم کو دوسری تمام ذمہ داریوں کے مقابلہ میں مقدم رکھنا چاہیئے کیونکہ کسانوں کی

فہم کے معیار کو بلند کئے بغیر انھیں ایسے علوم کی تعلیم دینا ممکن نہیں جن کی مدد سے وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے قابل ہوسکیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں مسئلے ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک ہیں اس قسم کا سوال اٹھانا اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرنا کہ انڈا پہلے یا مرغی پہلے ـــــ تعلیم کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور روپیہ حاصل کرنے کے لئے تعلیم ضروری ہے ـــــ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا قوموں اور افراد دونوں پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔

بہت کم لوگ اس چیز کا اندازہ کرسکتے ہوں گے کہ بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان کو اوسط درجہ کی تعلیم دینے کے لئے کتنی کثیر مقدار میں روپیہ خرچ کرنا پڑے گا۔ آخر پورے بنی نوع انسان کی آبادی کے پانچویں حصہ کو لکھنا پڑھنا سکھانا ایسا کام تو نہیں ہے جسے سنجیدہ فکر کے بغیر ذمہ لیا جاسکے۔ ہندوستان کی ۸۵ فیصد آبادی بالکل دیہاتی زندگی بسر کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر تقریباً چونتیس کروڑ یعنی ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی سے تقریباً دوچند انسان گاؤں میں آباد ہیں جن میں سے ہر گاؤں کے لئے کم از کم ایک استاد کی ضرورت ہوگی۔ موضع کی انتہائی آبادی ۵۰۰ فرض کیجئے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس مہم کو شروع کرنے کے لئے آپ کو پینتیس ۳۵ لاکھ استادوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ تعداد اتنی بڑی ہے کہ ممکن ہے کہ ناظرین واضح طور پر اس کے مضمرات کا اندازہ کئے بغیر گزر جائیں لہٰذا ہم انھیں ایک اشتہار کی شکل میں لکھتے ہیں۔

ملازمت کے لئے ضرورت ہے

ایسی ۳۵،۰۰۰،۰۰۰ استانیوں کی جو اضلاع میں تنہا رہنے پر آمادہ ہوں
تنخواہ ۶۰ روپیہ ماہانہ

۶۰ روپیہ ماہانہ تقریباً ۲۵ شلنگ یا ۶ ڈالر فی ہفتہ کے مساوی ہوتے ہیں
ہندوستان میں یہ اُجرت زندگی کے لئے کافی ہوتی ہے لیکن اُسے فراداں
نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ہم اپنی استانیوں کی فوج کو یہ اجرت دیں تو ہمیں ہرسال
اکیس[1] کروڑ پونڈ خرچ کرنا ہوگا اور یہ رقم نہ صرف موجودہ مصارف کے مقابلہ میں
دس گنی ہے بلکہ خود ہندوستان کے محاصل کی جملہ مقدار سے کہیں زیادہ ہے۔
یہ رقم تو صرف تنخواہوں پر صرف ہوگی، رقوم کی ان حوصلہ شکن مقداروں کا
تو ذکر ہی نہیں جو مدرسوں کی عمارتوں اور سامان پر خرچ کرنا ہوں گی۔

فرض کیجئے کہ ہمارے پاس مدرسہ کی استانیوں کو ادا کرنے کے لئے
رقم بھی موجود ہوتی اور مالیاتی شعبدہ بازی کی کسی اسکیم کے ذریعہ ہم استانیوں
کی اس فوج کو تنخواہ ادا کرنے کے قابل بھی ہوتے تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ

---

[1] سارجنٹ اسکیم میں جس کی بنیادوں پر ہندوستان میں غالباً جنگ کے بعد تعلیم کی
ہم شروع کی جائے گی آخرکار ۳۱۳ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کرنے کی تجویز ہے لیکن
اس کے باوجود بھی اس اسکیم میں اکثر صورتوں میں ۱۴ سال سے زیادہ عمر کے اشخاص کو
شریک نہیں کیا گیا ہے۔ اتنے کثیر سالانہ اخراجات کی ابتدا چھوٹے پیمانہ پر ہوگی اور پچاس
سال سے پہلے ان کی مقدار ۳۱۳ کروڑ روپیہ تک بڑھا دی جائے گی۔

خود یہ اُستانیاں کہاں سے ملیں گی۔ یہ توقع کرنا تو ممکن نہیں کہ ہم ایک دستک دیں گے اور استانیوں کی یہ فوج پنسل، مسطر اور ربڑ سے سجی سجائی زمین میں سے اُبل پڑے گی۔ موجودہ حالات میں تو یہ توقع کرنا بھی مشکل ہے کہ ہمیں اس تعداد کا پچاسواں حصہ بھی مل سکے گا۔ اچھا فرض کیجئے کہ ہمیں یہ پچاسواں حصہ مل بھی گیا تو ان اضلاع میں جہاں انھیں جاکر تنہا رہنا ہوگا ان کی حفاظت کے لئے پنسل اور ربڑ سے زیادہ موثر وسائل کی ضرورت ہوگی کیونکہ گو یہ چیز افسوسناک معلوم ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دیہی علاقے بے سہارا عورتوں کے لئے محفوظ مقام نہیں ہیں۔ اس بارہ میں ان علاقہ جات اور مغرب وسطیٰ یا انگلستان کے اضلاع کے مابین کوئی مشابہت نہیں ہے۔ مدرّس کی استانیوں کی حفاظت کے لئے جن انتظامات کی ضرورت ہوگی ان پر خود ان استانیوں کی حفاظت سے زیادہ اخراجات ہوں گے۔ ہندوستان میں مدارس کی استانیوں کے پیشہ کو نرسوں کے پیشہ کی طرح اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اس پیشہ کے ساتھ بداخلاقی کا ایک محکم سا تصور وابستہ ہوگیا ہے اس لئے رقم بہم پہنچانے اور ان استانیوں کو تلاش کرنے کے مسئلہ سے قطع نظر ہمیں ایک اور مسئلہ سے بھی دوچار ہوتا ہے یعنی یہ کہ ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان مردوں کا استانیوں کے متعلق جو نقطۂ نظر ہے اس میں یکسر انقلاب پیدا کیا جائے۔

یہ اتنی سیدھی سادی چیز نہیں ہے جتنا کہ ہمارے نظریہ باز اصحاب ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں۔

لہ کسی امریکی یا انگریز کے لئے یہ چیز سمجھنا مشکل ہے کہ ہندوستانی کسی ایسی عورت کو جو

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر استانیوں کی بجائے ہم استادوں کو بھرتی کریں تو ان تمام دقتوں کا سامنا نہ ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ مطلوبہ تعداد کے پچاسویں حصہ کی بجائے مردوں میں سے چالیسواں حصہ مل سکے اور ظاہر ہے کہ نوجوان مردوں کی عصمت کی حفاظت کے لئے کسی جداگانہ انتظام کی ضرورت نہ ہوگی۔ تاہم پھر بھی یہ مسئلہ باقی رہ جاتا ہے کہ رقم کہاں سے لائیں اور ایک سوال جو اور بھی زیادہ اہم اور حل طلب ہے کہ ہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شہر چھوڑ کر دیہات واپس جانے پر آمادہ کریں کیونکہ اس کے بغیر ہندوستان میں تعلیم ہو کیسے سکتی ہے اس کام کے لئے انھیں تنہائی اور ویرانہ کی زندگی اختیار کرنا ہوگی اور ایک طویل مدت کے لئے شہر کی دلچسپیوں کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اس کام کے لئے انھیں چل کر اونچے نیچے راستوں پر جانا ہوگا جہاں سے موٹر بس ہفتہ میں دو دفعہ سے زیادہ نہیں گزرتی اور بس کے راستہ کے سرے پر ایک دوسرا گاؤں ہوتا ہے جو اس گاؤں سے جسے وہ چھوڑ کر آیا ہے کچھ ہی زیادہ بڑا اور کچھ ہی کم میلا کچیلا ہوتا ہے۔

کانگریسی پروپیگنڈہ باز آپ سے کہیں گے کہ برطانوی حکومت کے ختم ہوتے ہی نوجوان شہر چھوڑ کر نکل کھڑے ہوں گے اور شہر کی ہنگامہ پرور دلچسپیوں کو فراموش کر کے اپنے آپ کو ویرانوں میں دفن کر دیں گے۔ اس کا جواب

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۹۵) کھانے پکانے اور بچوں کی داشت کے سوا کسی اور مشاغل سے دلچسپی کا اظہار کرے کیسی شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں مثلاً بنگال میں محض اس چیز کو کہ ایک لڑکی کی آواز اچھی تھی اور اسے گانے کا شوق تھا اس کی شادی کے سلسلہ میں ایک نقص سمجھا جا رہا تھا۔ (ملاحظہ ہو ڈاکٹر دھرجتی مکرجی کی کتاب ماڈرن انڈیا کا صفحہ ۱۹۱)

ایک ملبی "ہوں" کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک نہایت تلخ حقیقت ہے کہ
جو ہندوستان جدید میں دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں نمایاں ہے کہ کوئی
نوجوان ایک دفعہ اپنے گاؤں کو چھوڑ کر شہر چلا آئے تو اسے کھینچ کر گاؤں کو واپس
لانے کے لیئے وحشی گھوڑے بھی کافی نہوں گے گاؤں میں جاکر کمانے پر وہ شہر
کی فاقہ کشی کو ترجیح دیتا ہے اور اکثر ایسی صورتیں پیش بھی آتی ہیں۔

یہ منتشر پارہ ہائے مضامین جو آپ کے پیش نظر ہیں بلاشبہ سلبی نوعیت
کے ہیں تاہم ان سے اِس حماقت کی اصلاح مقصود ہے جس کا انگلستان میں عام
طور پر اظہار کیا جاتا ہے اور جس میں مدرسہ کے نوجوان اساتذہ بہت پیش پیش
ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سری نگر سے ترچناپلی تک ہندوستان کے
ایک سرے سے دوسرا بس کا ایک آنہ کے ٹکٹ کا راستہ ہوگا۔

ایجابی اور تعمیری پہلو پر تو جلدیں کی جلدیں لکھی جا سکتی ہیں۔ میں صرف
اپنی ذاتی رائے کے اظہار پر اکتفا کروں گا یعنی یہ کہ اس مسئلہ کے حل کے
لیئے بالکل جدید انقلابی وسائل سے کام لینا ہوگا۔ جس میں سینما اور ریڈیو بہت
نمایاں ہوں گے اور بڑی حد تک خود مدرسہ کے اساتذہ کی جگہ کام دیں گے
اس میں کلام نہیں کہ اس قسم کی اسکیموں کی نوعیت بالکل عارضی ہوگی کیونکہ
مشینیں کسی طرح بھی وہ کام انجام نہیں دے سکتیں جو اساتذہ سے لیا جا سکتا ہے
تاہم مشینیں کم از کم جہالت کے زنگ کی اس تہہ کو توڑنے کا کام تو ضرور کر سکتی
ہیں جو ہندوستانی عوام کے ذہنوں پر صدہا سال سے جمتا چلا آرہا ہے۔

زبان

کانگریسیوں کو جو ہندوستان کے ایک ملک ہونے کا راگ، الاپتے رہتے ہیں

کسی چیز سے ذہنی پریشانی نہیں ہوتی جتنی اس سادہ حقیقت کے اظہار سے کہ ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حقیقت جیسا ہم آئندہ دیکھیں گے گمراہ کن ضرور ہے لیکن اس سے متاثر ہو کر کانگریسی ایسے جوابات تراشنے لگتے ہیں جو اور بھی زیادہ گمراہ کن ہیں مثلاً یہ مبالغہ آمیز بیان کہ "ہندوستانی زبان ملک کے ہر حصہ میں سمجھی جاتی ہے اور کوئی شخص جو ہندوستانی بول سکتا ہے اُسے ہندوستان کے کسی حصہ میں اظہار مدعا میں دقت نہیں ہوتی" لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے ہاتھ یا پاؤں کے یا جیب میں جو رقم ہو اس کے ذریعہ سے تو ضرور اظہار مدعا کر سکتا ہے لیکن اپنی زبان سے تو اظہار مدعا نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ اسے منہ سے باہر نہ نکالے۔

ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں سے بڑی تعداد مقامی زبانوں کی ہے جو کوئی اہمیت نہیں رکھتیں مثلاً تبتی چینی گروہ کی قبیلہ واری زبانیں جو صرف ہندوستان کی شمال مشرقی سرحدوں پر بولی جاتی ہیں۔ عملی اغراض کے لئے شمار کیا جائے تو ہندوستان کی بڑی اور اہم زبانیں پندرہ ہیں۔ کتنی بھی کوشش کی جائے کوئی کانگریسی اس تعداد میں کمی نہیں کر سکتا۔

ان میں سے سب سے زیادہ اہم ہے۔

اردو
ہندی } جنھیں ۵۱ کروڑ باشندے بولتے ہیں

ہم نے جن وجوہ کی بنا پر ان دونوں کو ایک قوس میں رکھا ہے انھیں ہم ابھی بیان کریں گے۔

اس کے بعد بنگالی کا نمبر آتا ہے جو ایک بالکل علیحدہ زبان ہے جسے

ساڑھے پانچ کروڑ باشندے بولتے ہیں۔

بعدازاں جنوبی ہند کی زبانیں تامل، تلنگی، کنڑی اور ملاین ہیں[1]۔ اور یہ سب بھی دوسری زبانوں سے بالکل علیحدہ ہیں گو ان میں آپس میں خفیف سی شباہت پائی جاتی ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد بھی ساڑھے پانچ کروڑ ہے۔

دوسری دو بڑی زبانیں مرہٹی (دو کروڑ) اور گجراتی (ڈیڑھ کروڑ) ہیں۔

ان میں سے اردو اور ہندی سب سے زیادہ اہم ہیں کیوں کہ ان کے بولنے والوں کی تعداد کسی دوسری زبان کے بولنے والوں کی تعداد سے چند ہے۔ یہ دونوں زبانیں ایک نہیں ہیں کیونکہ اردو میں کثرت سے عربی اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے اس حد تک ملتی جلتی ہیں کہ ان کے بولنے والوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ گاندھی جی دونوں کو ہندوستانی کے مشترکہ نام سے ملا کر ایک کر دینا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس مرکب کو باقی بیس کروڑ ہندوستانیوں کے حلق سے نیچے بھی اتار دیں لیکن ابتدا ہی سے انہیں ایک سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ گو دونوں زبانیں بولنے میں تو مشابہ ہیں لیکن باعتبار رسم الخط بالکل مختلف ہیں۔ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے اور یہ الٹی طرف سے سیدھی طرف ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اردو فارسی سے نکلی ہے۔ اور داہنی طرف سے بائیں طرف فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کی کتاب مقدس قرآن کو اسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے جس میں فارسی لکھی جاتی ہے اس لئے اگر اس رسم الخط کو ہاتھ لگانے یا اگر

---

[1] مصنف نے زبان کا نام ملین لکھا ہے حالانکہ صحیح نام ملیالم ہے۔ (مترجم)

زبان کو ہندی بنانے کی کوشش کی جائے تو مسلمان اس کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔

کانگریسی اس سنجیدہ اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتے اور ان کے پروپیگنڈہ باز کہتے ہیں کہ یہ سب انگریزی حکومت کی پیداوار ہیں وہ ہندوستانی زبانوں کے اختلافات پر پردہ ڈال کر باور کرانا چاہتے ہیں کہ ایسے کسی اختلاف کا وجود ہی نہیں۔ تاہم کبھی سرکش مسلمانوں پر برہمی کے جوش میں کہ وہ ان میں جذب ہو کر گم ہونے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہیں یہ لوگ حقیقت بھی بیان کر جاتے ہیں۔ اردو ہندی زبان کی ایک صدائے بازگشت کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مستقل زبان کی حیثیت سے باقی رکھنے کے متعلق مسلمانوں کے پرجوش عزم کو ایک ممتاز ہندو فاضل پروفیسر امرناتھ جھانے بڑی اچھی طرح بیان کیا ہے۔ اخبار "لیڈر" الہ آباد میں حال میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں:-

"صاف گوئی سے کام لینا بہتر ہے۔ ہندو طلبہ کے کسی اقامت خانہ کو جائیے وہاں دارالمطالعہ میں آپ کو کچھ نہ کچھ اردو کے رسالے ملیں گے۔ مسلم اقامت خانہ کو جائیے وہاں آپ کو بھولے سے بھی کوئی ہندی رسالہ نظر نہ آئے گا۔ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اردو لینے والے ہندو طلبہ کی فہرست دیکھئے اور ان کا ان مسلمان طلبہ کی تعداد سے مقابلہ کیجئے جنھوں نے ہندی یا بجز اس کے کوئی خرق عادت کی سی صورت ہو سنسکرت لی ہے۔ اس لہجہ میں لکھتے ہوئے افسوس ضرور ہوتا ہے لیکن جب تک ہمارے مسلمان دوست ہندی کے متعلق اپنے تحقیر آمیز

رویّہ میں تبدیلی نہ کر دیں ہمیں اتحاد کے امکانات پر غور کرنے سے انکار کرنا چاہیئے۔"

گاندھی جی ہمیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انگریزوں کے ہندوستان سے جاتے ہی یہ تمام پرانی مخالفتیں یکسر کافور ہو جائیں گی اور ہندو مسلمانوں کو قابل نفرت زبان اردو میں اور مسلمان ہندوؤں کو ناپسندیدہ زبان سنسکرت میں محبت نامے لکھنے لگیں گے۔ (گاندھی جی نے اس عنوان پر جو کتاب لکھی ہے اس کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کے بعد بھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ زبان کے متعلق گاندھی جی کا نقطۂ نظر کیا ہے۔)[1]

بہرحال اگر آپ کے لئے ہندی اور اردو کو ہندوستانی کے مشترکہ نام سے ملا کر ایک کرنا ممکن بھی ہو (جس کا ۱۰ فیصدی بھی امکان نہیں) اور آپ ایک مشترکہ رسم الخط کے حق میں تصفیہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں (جس کا ہزار میں ایک حصہ بھی امکان نہیں) تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقی ہندوستان کا کیا ہوگا۔ آپ پورے فرانس کی آبادی سے زیادہ بڑی بڑی آبادیوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ سب کے سب پھر مدرسہ جا کر ایک نئی زبان سیکھیں اور اپنی زبان کے سرمایہ ادب کو قربان کر کے از سر نو اپنی ذہنی زندگی شروع کریں گے موجودہ صورت تو یہ ہے کہ اگر وہ دو زبانیں اختیار کر لیں تب بھی کام نہیں چلے گا بلکہ انہیں دو کی بجائے تین زبانیں اختیار کرنا پڑیں گی کیونکہ تمام سرکاری اور

---

[1] گاندھی جی کے دماغی انقلابات کا مطالعہ کرنا ہو تو ان کی کتاب "مسئلہ زبان" (ہنیگو رانی کراچی) پڑھ کر دیکھئے۔ ایک اور کتاب جس میں مسئلہ کو بڑے اچھے طریقہ سے الجھایا گیا ہے "ہندوستان کی قومی زبان" (کتابستان الہ آباد) ہے۔

تجارتی کاروبار میں اس وقت تک انگریزی نہایت اہم مقام حاصل کرچکی ہے۔ یہ چیز تاریخی حقیقت کی حیثیت سے مسلم ہے اور گو کانگریسی اس پر دانت پیستے ہیں لیکن انھیں بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

لہٰذا مسئلہ حل طلب باقی رہ جاتا ہے اور اس وقت تک حل طلب باقی رہے گا جب تک کہ دنیا سے جادو میں معجزانہ طور پر کوئی عظیم الشان انقلاب رونما نہ ہو جس کے ظہور کی توقع کرنے کی شاید مسٹر ایچ۔ جی ویلز بھی ہمت نہ کرسکیں بہرحال یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کانگریس کا یہ بیان کہ ہندوستانی زبان تمام ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے کذب محض ہے۔ ملک کے بڑے بڑے حصوں میں پیچیدہ سلسلہ خیالات کو سمجھنا تو کجا اگر کوئی ہندوستانی بولنے والا راستہ پوچھے یا پانی کی ایک پیالی طلب کرے تو لوگ اس کی بات نہیں سمجھیں گے۔

تجارت و حرفت

یہ ظاہر ہے کہ ایک چھوٹے سے مضمون میں اتنے عظیم الشان موضوع پر بحث کی کوشش کرنا بالکل بے تکی سی بات ہے لیکن ان چند فقروں میں اس موضوع پر کوئی بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ان میں محض اس قسم کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے مطابق تحقیقات کرنا اس موضوع کا شوق رکھنے والے کسی طالب علم کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں برطانیہ کے کارناموں میں اس کی زرعی اور صنعتی پالیسی سب سے کم قابل تحسین رہی ہے۔ کانگریس جب اس پالیسی پر حملہ کرتی ہے تو صحیح ہتھیاروں سے نہیں بلکہ جھوٹے ہتھیاروں سے مسلح ہوتی ہے یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی اور غیر ملکی شہنشاہیت ہوتی تو وہ اس سے کہیں بدتر عمل کرتی۔ تب بھی

صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً جذبۂ انسانیت کے تقاضوں کی وجہ سے ہماری دست برد
میں اعتدال بھی ہوتا رہا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ہماری عدم کارکردگی کا باعث
جذبۂ عناد نہیں بلکہ عدم واقفیت ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ ہماری دست برد اور
تمتع بڑے پیمانہ پر اور عدم کارکردگی عام رہی ہے۔

مثلاً یہی چیز کتنی حیرتناک ہے کہ دہلی میں محکمۂ اراضی جو ہندوستان
جیسے زرعی ملک میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جس کے ذمہ جنگلات کی نگہداشت
اور آبپاشی جیسے امور ہیں اسے ایک چھوٹے سے دفتر میں محکمۂ حفظان صحت
اور محکمۂ تعلیمات کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے محکمۂ اطلاعات
کی وزارت کسی چپراسی کے تفویض کر دی جائے۔ جنگ کے پانچویں سال [illegible]
اس نوبت پر جبکہ یہ دھوم مچا مچا کر کہ ہندوستان صنعتی حیثیت سے ترقی کر گیا [illegible]
وقت جمہوریت کے اسلحہ خانہ کا کام دے رہا ہے۔ سیاہی کے دریا بہا دئے
جا چکے ہیں یہ چیز بھی اسی طرح حیرتناک ہے کہ اس ملک میں ایک کارخانہ ایسا
موجود نہیں ہے جو بہت معمولی قسم کی ایک دو جنگی مشینوں کے فاضل پرزوں
کے سوا کوئی چیز بھی بنانے کے قابل ہو۔ جب کانگریس یہ آواز بلند کرتی ہے کہ
برطانیہ نے ہندوستان کو قصداً صنعتی اعتبار سے پیچھے رکھ چھوڑا ہے تو کانگریس
کا یہ ادعا قطعاً صحیح ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گزشتہ بیس سال کے دوران میں چند
صنعتوں خصوصاً روئی، لوہے، سیمنٹ اور کاغذ سازی کی صنعتوں نے تیز [illegible]
سے ترقی کی ہے لیکن تمام بڑی صنعتیں جیسے موٹر سازی، جہاز سازی، انجن
سازی اور اسلحہ سازی وغیرہ بالکل جمود کی حالت میں ہیں۔ کیمیائی مرکبات
کی تیاری کا تو ذکر ہی فضول ہے ہندوستان میں کیمیائی مرکبات کی صنعت
کے قیام کی جو کوشش کی گئیں جیسے ناکام سوراجی اسکیم انہیں اہل برطانیہ نے

ایسا سے نہیں بلکہ کوششوں سے تباہ کردیا گیا ہے۔ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے دیا سلائی کے کارخانوں کو، بظاہر سویڈن کے کارخانجات لیکن درحقیقت برطانوی کارخانجات کی خاطر کچل ڈالا گیا۔ یہی حالت سیمنٹ اور موٹر سازی کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں امریکی تجارتی کوٹھیوں کو ہندوستان میں اپنی شاخیں قائم کرنے کی اجازت دینے میں تامل کرنے کی وجہ سے کچھ انگریزی امریکی مناقشہ کی صورت بھی پیدا ہو گئی ہے۔

انگریز اس کی صفائی پیش کرتے ہوئے "نئے رجحان" کا ذکر کرتے ہیں اور اعداد و شمار پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں صنعت بڑی سرعت سے ترقی کر رہی ہے لیکن یہ ترقی محض فریب نظر ہے اور یہ نیا رجحان اشک شوئی سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ مثلاً اخبارات میں بیون بوائز یعنی ہندوستانی نوجوان کے جو جتھے دوران جنگ میں حکومت کے زیر سرپرستی برطانیہ میں صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں (اور جن کا پہلا جتھا ۱۹۴۱ء میں بھیجا گیا تھا) ان کو خوب خوب شہرت دی گئی ہے۔ سننے میں یہ بڑی شاندار چیز معلوم ہوتی ہے اور نظری طور پر ہے بھی شاندار چیز۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو بیون بوائز بھیجے جاتے ہیں ان کی تعداد کیا ہے؟ یہی ہر سہ ماہی پر اوسطاً پچاس۔ تو اگر جنگ ۱۹۴۶ء تک جاری رہے اور نوجوانوں کو برابر اسی تعداد میں بھیجا جاتا رہے تو برطانیہ ایک ہزار نوجوانوں کو صنعتی تعلیم دے سکے گا۔ چالیس کروڑ کی آبادی میں سے پورے ایک ہزار نوجوانوں کو اگر یہی "نیا رجحان" ہے تو یہ تو کوئی دل کو لگتی ہوئی چیز نہیں ہے بادل نخواستہ سہی لیکن ہم کانگریس کی اس شکایت کو حق بجانب تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ صنعت میں ایک انتہائی

ترقی یافتہ قوت کی ڈیڑھ سو سالہ حکمرانی کے بعد بھی ہندوستان کی آبادی میں سے صرف ۴ء۴ فیصد اشخاص صنعتی کاموں سے روزی پیدا کرتے ہیں[1]

اب ہمارے سامنے ہندوستان کا سب سے بڑا معاشی مسئلہ آتا ہے یعنی زراعت کی حالت۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر دس ہندوستانیوں میں سے نو بالکل دیہاتی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان میں سے آٹھ براہ راست زراعت کا کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی کی رفتار کتنی بھی تیز ہو یہ ظاہر ہے کہ آئندہ سالہا سال تک ہندوستان عام حیثیت سے زرعی ملک رہے گا اس لئے ملک کو ترقی دینے کی اسکیم کو اراضی سے شروع کرنا ہوگا۔

منصوبہ بندی یا تو آپ کو کسانوں کے لئے کرنی چاہیئے یا یہ نہیں تو پھر قطعاً کوئی منصوبہ بندی نہ کرنی چاہیئے کیونکہ تاوقتیکہ آپ کسان کی قوت خرید

---

[1] اس امر کا اظہار نہ کرنا برطانیہ کے حق میں ناانصافی ہوگی کہ ہندوستانی سرمایہ داروں نے خود اپنے ملک میں سرمایہ لگانے کے بارے میں مسلسل بے آمادگی کا اظہار کیا ہے خصوصاً ان معاملات میں جن میں ابتدائی نوبتوں پر خطرہ لاحق آتا تھا مثلاً آر کہو کو پیش کیا جا سکتا ہے ہندوستان سے سرمایہ جمع کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود ۹۲ فیصد رقم لندن سے حاصل کرنی پڑی۔ آج سرمایہ کو تدریجی طور پر ہندوستانی بنانے کی پالیسی کے مطابق ۵۱ فیصد سرمایہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ ہندوستانی سرمایہ داروں کی بے آمادگی کی وجہ سے اگر باقی سرمایہ اہل برطانیہ لگا دیں اور کمپنی کے کاروبار میں کامیابی ہو تو تمام ہندوستانی سرمایہ دار جو ابتدا میں خطرہ مول لینے کے ڈر سے موقع کھو دیتے ہیں یہی اہل برطانیہ کی معاشی دست برد کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔

نہ بڑھائیں آپ کی تمام منصوبہ بندیاں ہوائی قلعے ثابت ہوں گی۔
اس میں کلام نہیں کہ بہت سے منصوبہ بندی کرنے والے خصوصاً منصوبہ بندی کرنے والے برطانوی اصحاب ہوائی قلعے تعمیر کر رہے ہیں اور بڑی تیزی اور جوش سے کر رہے ہیں کیونکہ وہ حسب معمول واقعات سے خبردار ہونا نہیں چاہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ حقیقی ہندوستان کے حالات بہت سے لوگوں کے خیالی ہندوستان سے بالکل مختلف ہیں۔ ان لوگوں میں ہلٹن بھی شامل ہے جس نے ہند کی دولت کا ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ خیال کرتے ہیں ہندوستان میں اراضی کی فراوانی ہے حالانکہ بلحاظ آبادی اراضی کم ہیں اور ان کی حالت ردی ہو چکی ہے۔ یہ لوگ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اسی طرح معدنی دولت کے فراواں ذخائر موجود ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے تہائی اراضی بالکل ناکارہ بنجر ہیں اور معدنی وسائل میں بہت سے نقائص ہیں۔ مثلاً کو ملے کو لیجئے یہ سرزمین جس کی تروتازگی اور زرخیزی کی شہرت عام ہے اس کی قیمت اوسطاً چھپن روپیہ فی ایکڑ ہے جو انگلستان کی اراضی کی قیمت کی چوتھائی اور جاپانی اراضی کی قیمت کے تہائی کے مساوی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کس کا قصور ہے۔
یقیناً قصور تمام تر برطانیہ کا نہیں لیکن اسی طرح قصور تمام تر ہندوستانیوں کا بھی نہیں۔

ہندوستانی کاشتکاروں میں سے کثرت سے قرون وسطیٰ کے کاشتکاروں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اور کاشتکاری کے ان سیدھے سادے اصول سے بھی ناواقف ہیں جو دیگر ممالک میں کاشتکاروں کی

طبیعت ثانی بن چکے ہیں۔ ان کے زرعی آلات دقیانوسی ہیں۔ انھیں فصول کو باری باری سے بدل کر کاشت کرنے کے متعلق کوئی معلومات نہیں اور کھادیں جو ہندوستانی اراضیات کے لئے اولین ضروریات کی چیزیں ہیں ان کا تو ذکر ہی نہیں۔ گوبر جو کئی طور پر دوسری تمام قدرتی کھادوں سے زیادہ زرخیز ہے اسے احتیاط سے جمع کیا جاتا ہے۔ اُپلے بناکر دیواروں پر تھوپ کر خشک کر لیا جاتا ہے اور ایندھن کے طور پر جلایا جاتا ہے۔ اس میں سے بمشکل آدھی چھٹانک کھیتوں میں جاتا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کھیتوں کو کھاد نہ ملنے کی وجہ سے روز بروز ان کی زرخیزی کم ہوتی چلی جارہی ہے۔

ہمیں صفائی سے تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ صورت حال برطانیہ کے لئے ناقابل تحسین ہے۔ یہ مانا کہ کام بے پایاں حد تک بڑا ہے۔ مذہبی اور فرقہ واری مشکلات اور کسانوں کی قدامت پرستی جیسے مواقع بھی موجود ہیں اور گزشتہ چند سال سے قوم پرستوں نے دقتیں پیدا کرنے کا جو رویّہ اختیار کر رکھا ہے وہ مزید برآں ہے۔ ہم کسی نہ کسی طرح ان مشکلات پر قابو پا سکتے تھے یا کم از کم عزم راسخ کے ساتھ ان پر قابو حاصل کرنے کی کوشش تو ضرور کرسکتے تھے ہمیں غور کرنا چاہیئے تھا کہ عوام میں غربت کا دور دورہ ہے اور غربت بڑی حد تک زرعی طریقوں کے نقص کی وجہ سے ہے لہذا ہمیں اپنی پوری قوت سے ان نقائص کا مقابلہ کرنا چاہیئے تھا۔ مثلاً کھادوں کے اہم مسئلہ کے حل کے لئے یا تو ہمیں کسانوں کو گوبر کے سوا کسی اور قسم کا ایندھن فراہم کرنے کا انتظام کرنا چاہیئے تھا (اور یہ بہت بڑے پیمانہ پر جنگلات کی کاشت کے ذریعہ ممکن ہو سکتا ہے) یا ہمیں کاشتکار کو اور قسم کی کھادیں بہم پہنچانا چاہیئے تھا۔ اس کے برخلاف ہم بڑی بڑی مقداروں میں کھادیں خصوصاً مونگ پھلی

کی کھلی اور ہڈیاں ہندوستان سے برآمد کرتے رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے ہم نے اپنے آپ کو اپنی شاندار روایات کے مطابق ثابت کر دکھایا ہے۔ غالباً سب سے زیادہ نمایاں مثال جس کی ہمیں داد دی جاسکتی ہے۔ آبپاشی ہے جو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں سال میں کئی کئی ماہ تک بارش کا ایک قطرہ تک نہیں گرتا، بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اہل برطانیہ نے ہندوستان میں دنیا کا سب سے بڑا نظام آبپاشی قائم کیا ہے۔ اور جو رقبہ زیر کاشت لایا گیا ہے اس کی مقدار تقریباً پانچ کروڑ پچاس لاکھ مربع ایکڑ ہے۔

لیکن اس میدان میں ہماری کامیابی ہی سے دوسرے قابل توجہ معاملات میں ہماری کوتاہیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ دوسرے زاویۂ نگاہ سے معاملہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہم نے معاشرتی خرابیوں کے ازالہ کے لئے جنھوں نے پورے ہندوستانی نظام زراعت کو بری طرح نقصان پہنچایا ہے، حقیقتہً کوئی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ قانون منظور کرکے زمین کو زرخیز نہیں بنایا جاسکتا نہ محض جنبش قلم سے کھیتوں میں فصل تیار کی جاسکتی ہے لیکن اگر آپ کے پاس طاقت و قوت ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے پاس طاقت و قوت ہے تو آپ ایسے قوانین نافذ کرسکتے ہیں جن سے کاشتکاروں کی وہ بندشیں کٹ جائیں جنھوں نے ان کے ہاتھ پاؤں کو باندھ رکھا ہے کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ بندشیں خود ہندوستان کی پیداوار ہیں یا یہ کہ انھیں دور کرنے کی کوشش کی جائے گی تو شور و غوغا اور احتجاج کیا جائے گا۔ حکمران کا کام حکمرانی کرنا ہے اور یہ ان مواقع میں سے ایک موقع ہے جب ہم نے اپنا فرض انجام نہیں دیا ہے۔

مثلاً ہندوستانی زراعت کے لئے بدترین مرض، وہ بلائے آسمانی جو
کاشتکار کی فصلوں کو تباہ اور اس کے کھیتوں کو زہر آلود کر دیتی ہے اور
اس کی ان صبر آزما کوششوں کا کہ اپنی زندگی کو غلامی کی سطح سے ذرا بلند کرے
سال بسال قلع قمع کرتی رہتی ہے۔ وہ مہلک کیڑا ہے جسے بنیا کہتے ہیں۔
بنیا ہندو ساہوکار ہوتا ہے اور اس سے بدتر قسم کا خون چوسنے والا کیڑا
دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ بنیا آپ کو ہر گاؤں میں ملے گا اور شائیلاک
یہودی کی طرح وہ ایسے لوگوں سے جن کے جسم پر آدھی چھٹانک گوشت بھی
مشکل سے ملے گا وہ اپنا ایک پونڈ گوشت طلب کرتا نظر آئے گا۔ ہندوستان
میں یہی ساہوکار دراصل اراضی کا مالک ہے۔ پشتہا پشت کی مقروضیت
کی وجہ سے ہندوستانی کسان کی حالت نہایت دردناک ہو گئی ہے۔ پورے
کنبے کی مستمرہ محنت سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ان پرانے ——————
بقایا کے سود کی ادائی کے لئے ہی بمشکل کافی ہوتا ہے جن کی یادداشت
تاریخ کے دھندلکے میں کھو کر رہ گئی ہے۔ یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان
کے کسان سرکار کو محاصل کی صورت میں جو ادا کرتے ہیں اس سے زیادہ
قرض خواہوں کو سود کی شکل میں دے دیتے ہیں۔ سود کی اوسط شرح سود در سود
کے طریقہ پر ۴۵ فیصد سالانہ ہے۔ ۵۰ فیصد معمولی شرح ہے اور بعض صورتوں
میں ۷۰ فیصد تک وصول کی جاتی ہے۔

جو لوگ بنیئے کا استیصال کرنا چاہتے ہیں ان کے راستے میں تین
دشواریاں ہیں۔

پہلی بڑی دشواری تو غرض مندی ہے۔ بنیئے کی پشت پناہی پر بڑے
بڑے لوگ ہیں وہ مزے کر رہے ہیں اور اہل برطانیہ کے چلے جانے کے بعد

اور بھی مزے کریں گے۔ دوسری دشواری انتظامی ہے۔ اگر کوئی اصلاحی قانون منظور کیا جائے تو اس کی کماحقہٗ تعمیل کے لئے انسپکٹروں کی ایک فوج درکار ہوگی جسے وسیع پیمانہ پر تلاشی اور تحقیقات کے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں تیسری دشواری خود کاشتکار کا روایتی جمود اور "می گزرد" والی ذہنیت ہے۔ بعض لوگ جسمانی حالت کو اس جمود کا سبب قرار دیتے ہیں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ہندوؤں کے اس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ یہ سب کچھ پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہے۔ یہ عقیدہ کچھ اس قسم کا ہے کہ اسے ماننے والا ہر بات کو توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کے موافق بنا سکتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کے لئے اس وقت تک جو عذر تراشے گئے ہیں یہ ان سب سے بڑھ کر ہے۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن کسان کو اس کے علی الرغم خود اس کے ہاتھوں کی مصیبت سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اگر اہل برطانیہ نے یہ کام انجام نہ دیا تو پھر اسے کرنے والا کوئی دوسرا معلوم نہیں ہوتا۔

زراعت کے ایک شعبہ یعنی مویشی کی داشت کے بارے میں اہل برطانیہ نہایت شدت سے اپنی برارت کا اظہار کر سکتے ہیں اور تمام دنیا ہندوؤں کو ملزم قرار دے گی گو اس کی توقع نہیں کہ ہندو اس سے ذرا بھی متاثر ہوں۔

ہندوستان میں مویشی کے متعلق جو صورت حال ہے اس کے متعلق اعداد و شمار کے صفحات کے صفحات پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن اہم واقعات کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں دنیا کے مویشی کی ایک تہائی تعداد موجود ہے یہ بڑی حد تک بڑھا ہوا تناسب ہے۔ ان میں سے بڑی تعداد ناکارہ مویشی

کی ہے۔ڈنمارک میں جو یورپ کے لئے شیرخانہ کا کام دیتا رہا ہے فی ایکڑ مویشی کی جو تعداد پڑتی ہے یہاں کی اس سے دوچند ہے۔ اس کے باوجود آپ کو ہندوستان میں قیمت ادا کرنے پر بھی ایک پیالہ اچھا دودھ میسر نہ آسکیگا۔

اس بظاہر ناقابل فہم صورت حال کا واحد اور شرمناک سبب ہندو مذہب ہے جس کی رو سے جانوروں کو ہلاک کرنا منع ہے۔ جانور خواہ رگڑ رگڑ کر جان دیں۔ انھیں فاقوں سے مرنا پڑے یا بیماری سے ان کی حالت مردوں سے بدتر ہو جائے حتیٰ کہ جس کے دل میں ذرا بھی جذبہ رحم باقی ہو اسے بھی دیکھ کر ترس آئے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کسی ایذا رسانی کے بغیر ان کا خاتمہ کر کے انھیں اس مصیبت سے نجات دیدی جائے۔ مسٹر مینومسانی جو ایک کانگریسی ہیں کہتے ہیں اور ان کے بیان میں ہزل کا ذرا سا شائبہ تک نہیں" یہ صورت حال کیوں ہے محض اس لئے کہ ہم ایک رحم دل قوم ہیں[1]" نتیجہ یہ ہے کہ ناکارہ مویشی نے کارآمد مویشی کی زندگی وبال جان بنا رکھی ہے۔ ہر سو مویشی میں سے ستر مویشی بالکل دودھ نہیں دیتے اور دودھ دینے والے تیس مویشی کے لئے چارہ اتنا کم بچ سکتا ہے کہ وہ اوسطاً روزانہ تین پاؤ سے زیادہ دودھ نہیں دیتے اور یہ مقدار کسی اوسط درجہ کے مالک کی تہائی مقدار[2] ہے۔ یہ ہے وہ قیمت جو ہندو

---

[1] ہمارا ہندوستان مصنفہ مینومسانی (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) بظاہر مخالف شہادتوں کی موجودگی کے باوجود میری رائے میں ہندوستانیوں کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ قصداً جانوروں سے بے رحمی برتتے ہیں۔ تاہم بدقسمتی سے جہالت اور مذہبی جوش کی وجہ سے جو نتائج رونما ہوتے ہیں وہ بے رحمی کی بدترین مثالیں ہیں۔

[2] ۔ ہندوستان میں تو گائیں جتنا دودھ دیتی ہیں اتنا دودھ جرمنی میں بکریاں دیتی ہیں۔

مویشیوں کے احاطہ میں گنیش کے حکم کو روا رکھنے کے معاوضہ میں ادا کرتے ہیں
یہ بلاشبہ وقت کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن اہل برطانیہ پر اس کے حل
نہ کرنے کا الزام عائد نہیں ہوسکتا۔ جب تک ہندو مذہب اپنی شکل میں باقی ہے
اس وقت تک یہ مسئلہ ناقابل حل رہے گا۔ ممکن تھا کہ گاندھی جی اپنے اثر
سے اس نقطہ نظر میں کوئی تبدیلی کر سکتے لیکن جیسا کہ مشکل معاملات پیش
آنے پر ان کی عام عادت ہے وہ اس معاملہ میں بھی قلم اور دوات سے سیاہی
کے بادل برسا کر مسئلہ کو اندھیرے میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کے طرز عمل
کا خلاصہ اس جواب سے معلوم ہوسکتا ہے جو انھوں نے ایک گوسالہ کے
مہتمم کو اس کے مشورہ طلب کرنے پر دیا تھا۔ اس شخص نے جو واقعات
بیان کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

"میرے زیر نگرانی پانچ سو مویشی ہیں۔ یہ سب کے سب بالکل ناکارہ
ہیں اور کھانے کے سوا کسی کام کے نہیں۔ ان میں سے اوسطاً ۳۵۰ سے
۴۰۰ تک مویشی قریب المرگ ہیں اور یکے بعد دیگرے مرتے رہتے ہیں۔
براہ کرم ایما فرمایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے"

اگر گاندھی جی تین لفظوں میں جواب دے دیتے کہ "گولی مار دیجئے"
تو مقاومت مجہول کی ہزاروں مہموں سے زیادہ ہندوستان کی خدمت
ہوتی ممکن تھا کہ اس طرح وہ خیالات میں ایک انقلاب برپا کر سکتے جس سے
زراعت کے میدان میں عظیم الشان انقلاب ہوسکتا اور کسانوں کو قسمت
کی غلامی سے نکلنے کے لئے سہارا مل جاتا۔

لیکن گاندھی جی نے یہ نہیں کہا کہ گولی مار دیجئے کیونکہ یہ چیز تو گاندھی جی
کے مشہور جذبہ گوسالہ پرستی کے خلاف ہونے کے علاوہ ضرورت سے زیادہ

سیدھی سادی تھی اور اس سے انگریزیت کی بو آتی تھی۔ اس لئے انھوں نے بڑی صفائی سے اپنا پیچھا چھڑایا اس طرح کہ اول تو انھوں نے اس مسئلہ ہی سے گریز کیا اور دوسرے پورا الزام گوشالہ کے منتظمین کے سر پہ ڈال دیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"ان لوگوں پر (منتظمین پہ) اور اس قسم کے دیگر اداروں کے قایم کرنے والوں پہ لازم ہے کہ دکھیا اور بیمار جانوروں کی تیمارداری اور ضروریات کے لئے موثر تدابیر اختیار کریں۔"

اس شاندار اور قابل عمل مشورہ کے لئے قریب مرگ جانوروں میں مبتلا گایوں اور شکستہ پا بچھڑوں نے ضرور اپنی ماندہ آوازوں سے گاندھی جی کا شکریہ ادا کیا ہوگا۔

ساتواں باب

ترک ہندوستان

سوال یہ ہے کہ ہم کو ہندوستان چھوڑ جانا چاہیئے یا نہیں !
ایک سال گزرنے کے بعد بھی "ہندوستان چھوڑ دو" کے الفاظ بڑے بڑے حرفوں میں اسٹیشن کے باہر دیواروں پر لکھے ہوئے تھے اگرچہ بارش سے حرفوں کی سفیدی دھل گئی تھی تاہم حروف صاف پڑھے جاتے تھے۔ میں نے ان لفظوں کو اس مرتبہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ میں کسی پرانے دوست سے مل رہا ہوں۔ ان ہی الفاظ کو دیکھ کر ہندوستان میں پہلی مرتبہ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا یہی تحریر تھی جو اس وقت بھی اصل بحث کی یاد میرے ذہن میں تازہ کرتی رہی جبکہ میرا ذہن غیر مفید امور میں الجھا ہوا تھا۔
اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان چھوڑا جائے یا نہیں !

یہ سوال ایسا ہے کہ رخصت ہونے سے پہلے اس کا جواب دینا ہمارے لئے ضروری ہے۔

اس سوال کو تین حصوں میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کیا ہم کو ہندوستان چھوڑ دینا چاہیئے؟

اصولاً یہ ایک اخلاقی سوال ہے۔

(۲) کیا ہم ہندوستان چھوڑ سکتے ہیں؟

یہ سوال اخلاقی نہیں بلکہ مادی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں دفاع کے مسئلہ کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

(۳) کیا ہم ہندوستان چھوڑ دیں گے؟

بدقسمتی سے یہ سوال بڑی حد تک مصلحت بینی کا ہے اور اتنے لاتعداد عوامل پر منحصر ہے کہ اس کا بہترین حل بھی ایک اعلیٰ درجہ کے قیاس سے زیادہ وقعت دیئے جانے کا مستحق نہ ہوگا۔

ان تینوں سوالات پر اسی ترتیب سے بحث کی جائے گی۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جوابات ایک حد تک غلط ملط ہوں گے۔

(۱) کیا ہم کو ہندوستان چھوڑ دینا چاہیئے؟

یہ سوال خاص طور پر برطانوی عوام سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کسی عام انگریز سے اس سوال پر رائے لی جائے تو یقیناً وہ اثبات میں جواب دے گا۔ کیونکہ برطانوی عوام جب کبھی ہندوستان کا خیال کرتے ہیں ——— اگرچہ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے ——— تو ان کا خیال مبہم لیکن ہمدردانہ اور فیاضانہ ہوتا ہے۔

اس بارے میں برطانوی عوام کی رائے جذبات سے متاثر ہوتی ہے

کیونکہ واقعات سے لاعلم ہونے کی وجہ سے وہ کوئی صحیح رائے دینے کے اہل نہیں ہیں ان کے دل جوش محبت سے لبریز ہیں۔ وہ انسانوں کی آزادی پر اسی طرح اعتقاد رکھتے ہیں جس طرح وہ جانوروں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ دنیا کے نقشہ میں ہندوستان انکو ایک ہی ملک کی طرح نظر آتا ہے وہ اپنے دلوں میں مسٹر گاندھی کا کچھ یوں ہی سا احترام بھی محسوس کرتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ" مسٹر گاندھی ایک ہنگامہ پرور آدمی ہیں۔ ظاہری صورت تو کچھ نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے ان میں کافی سکت اور ہمت ہے۔ بہرحال جیل میں رہنا ان کی بڑی بدقسمتی ہے"

برطانوی عوام کی ذہنیت کا یہ تجزیہ ممکن ہے کہ آج کل کے ذہین رائے دہندہ انگریز کو توہین آمیز معلوم ہو، لیکن کیا واقعہ ایسا ہی نہیں ہے؟ میں نے اس موضوع پر کئی سو ان انگریزوں سے گفتگو کی جو فی الحال ہندوستان میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کم از کم ان کو ہندوستان سے اتنا ضرور باخبر ہونا چاہیئے جتنا کہ ان کے وہ بھائی اور بہنیں واقف ہیں جو انگلستان میں مقیم ہیں۔ لیکن ان میں بہت کم ایسے ہیں جو اس ملک کی جغرافیہ، تاریخ اور معاشیات کے متعلق ابتدائی معلومات بھی رکھتے ہوں۔ مشکل سے ان میں سے دو چار نے مسٹر گاندھی کے سوا کسی اور بڑی ہندوستانی شخصیت کے متعلق کچھ سنا ہوگا۔

وہ نہیں جانتے کہ ہندو اور مسلم میں کیا اختلافات ہیں اور نہ یہ کہ کونسا فرقہ اکثریت میں ہے۔ ان قوانین کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہیں ہے جن کے مطابق ہندوستان پر حکومت کی جاتی ہے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر یہ جانتے ہیں لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے ہیں لیکن وہ وائسرائے

کے اختیارات اور پابندیوں سے قطعاً ناواقف ہیں۔

ان کی جہالت کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس بارے میں عہدہ دار اپنے ماتحت پر کسی فضیلت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بایں ہمہ اپنے ان رشتہ داروں کے مقابلہ میں جو انگلستان میں مقیم ہیں، ہندوستانی مسائل پر ان لوگوں کی رائے قطعی اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس بیان سے جمہوریت کے طریقوں پر کافی روشنی پڑتی ہے اور یہ خیال کر کے انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے —— پہلی مرتبہ نہیں —— کہ کیا عوام کے انتخابات درحقیقت کچھ کم اہمیت رکھتے ہیں؟

برطانوی عوام کی ذہنیت کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ کبھی ایک منٹ کے لئے بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ "ترک ہندوستان" ان کی معاش کو کس حد تک متاثر کرے گا۔ مسٹر چرچل نے ان کو بتایا ہے کہ دس میں سے دو انگریز بتوسط یا بلاتوسط اپنی معاش ہندوستان کے تعلق سے حاصل کرتے ہیں اس تلخ حقیقت کے واضح کرنے میں مسٹر چرچل اپنے معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں۔ عوام کے نمائندے ایوان پارلیمنٹ میں "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرہ کا خیر مقدم پر جوش تصفیق سے یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک اصلاحی قدم ہے اور یہ کہ سر ولیم بیوریج، پروفیسر لاسکی اور ایچ۔ جی۔ ویلز کی "دنیا کے جدید" سے اس کا تعلق ہے۔

اگر عوام محض اخلاقی بنیاد پر اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیں کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینا چاہیئے، تو مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور "کیا ہمیں ہندوستان چھوڑ دینا چاہیئے؟"

کا جواب اثبات میں دیں گے، اگرچہ وہ جانتے ہوں گے کہ ان کا یہ فیصلہ صدفی صد ان کے مفادات کے خلاف پڑے گا۔ انگریزوں کی تاریخ میں یہ چیز پہلی بار نہیں ہوگی کہ عوام نے جو کچھ حق سمجھا اس کو برملا ظاہر بھی کیا اور یہ جانتے ہوئے کہ کیا ایسا کرنے میں ان کا سراسر نقصان ہے۔ غلاموں کی کثیر المنافع تجارت کا ترک کرنا ان کے اس جذبہ کی ادنیٰ مثال ہے۔ بہرحال اب تک تو عوام نے اس سوال کے متعلق اپنے دماغوں میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا جو بظاہر حالات سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ اس لئے ہم ان کو کسی قسم کا خراج تحسین نہیں ادا کرسکتے۔

مجھے اپنی اس کتاب کے متعلق اتنا حسن ظن نہیں ہے کہ میں یہ خیال کرنے لگوں کہ یہ کتاب انگریزوں کی ایک بڑی تعداد کو کسی قطعی فیصلہ کی طرف رہبری کرسکے گی۔ لیکن محض اس خیال سے کہ شخصی رائے بشرطیکہ وہ مختصر اور واضح ہو مسئلہ زیر بحث کے صاف کرنے میں مدد دے گی، میں اپنی رائے کے مطابق اس سوال کا جواب سپرد قلم کرتا ہوں۔

کیا ہمیں ہندوستان چھوڑ دینا چاہیئے؟

اخلاقی بنیاد پر اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہے۔ اگر منشور اوقیانوس کچھ معنیٰ رکھتا ہے تو لازم ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں ہو اور ٹھیک اسی طرح اخلاقی بنیاد پر یہ "اثبات" اس شرط کے ساتھ مشروط ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں ——— ہندو اور مسلمان ——— کے لئے بالکل مساوی درجہ کی آزادی اور اقتدار تسلیم کیا جائے۔

یہ اثباتی جواب مغالطہ اور فریب ہوگا اگر وہ اس شرط کے ساتھ مشروط نہ ہو۔ ورنہ یہ ایسا ہوگا کہ گویا ہم ایک ہاتھ سے آزادی دے رہے ہیں

اور دوسرے ہاتھ سے چھین رہے ہیں۔ یا ایسا ہوگا کہ گویا ہم ۲۵ کروڑ ہندوؤں کو ایک ایسی حالت سے آزاد کر رہے ہیں جس کو وہ فی الحال جیل سمجھتے ہیں اور دس کروڑ مسلمانوں کو ایسے جال میں گرفتار کر رہے ہیں جو یقینا ہے کہ نتیجۃً ان کے لئے جیل ہوگا۔

یہاں ہمیں اس امر پر زیادہ بحث کرنی نہیں ہے، کیونکہ ہم "پاکستان" کے باب میں اس پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے ہمارا روشن خیال طبقہ، رائے عامہ کے مالک اور خصوصاً مزدور جماعت کے نوجوان ارکان، کانگریس کے نعرہ کی طوطے کی طرح رٹ لگانے کی بجائے واقعات کا بنظر غائر مطالعہ کریں اور حقیقی مسئلہ کا حل سوچیں جس کو مختصراً یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے "تقسیم کرو اور چھوڑ دو" اس تجویز سے مخالفت کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں واقعات سے ناواقفیت اور اصول کے تسلیم کرنے سے

۲

کیا ہم ہندوستان چھوڑ سکتے ہیں؟

بیشک ہم ہندوستان چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن ایک نہایت ہی غیر ذمہ دار شخص یہ رائے دے گا کہ ہم رات کے رات میں ہندوستان چھوڑ سکتے ہیں اگر ایسا ہوا تو حملوں سے ہندوستان کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں رہے گا۔

[1] ہم نے قصداً خانہ جنگی کے امکانات پر غور کرنے سے احتراز کیا ہے۔ پاکستان کا تسلیم کر لینا ہی اصل خطرہ کو دور کر سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے بڑے حصے روایتی مزاج کی طرف لوٹ جائیں گے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ تمام ریاستیں بغیر فیصلہ کن جنگ کے اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں گی یہ بات بھی ایسی ہی ناقابل تصور ہے کہ شمالی مغربی صوبہ سرحد میں قبائلی جنگ کی آگ نہ بھڑک اٹھے گی جو ممکن ہے سرحد کے پار دور دور تک پھیل جائے۔

انگلستان میں رہنے والے نام نہاد "ہندوستان کے دوستوں" نے بہت کم دفاع کے اس بنیادی مسئلہ پر غور کیا ہے، کیونکہ کانگریسی پروپیگنڈے سے ان کی مت ماری گئی ہے۔ یہ بات ان کے دماغوں میں گونج رہی ہے کہ "بس آزاد ہونے کی دیر ہے، پھر ہندوستان خود دفاع کا انتظام کر لے گا"۔ یہ بظاہر سیدھی سادی اور بے ضرر بات سراسر فریب ہے ——— اس کے علاوہ ——— بے معنی بھی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان ——— کم از کم ہندو ہندوستان ——— عدم تشدد کا حلف اٹھائے ہوئے ہے۔ اگرچہ اس خطرناک فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے لیکن یہ پورے طور پر کبھی ہندو دماغ سے نہیں نکالا جا سکے گا۔ "ہندوستان اپنی حفاظت کرنے کے لئے بیتاب ہے"؟ اس کے معنی مسٹر گاندھی کے فلسفہ کے مطابق یہ ہیں کہ ہندوستان ہر اس حملہ آور کے لئے پائیدان بننے کو تیار رہے جو اس سے اپنے جوتے صاف کرنا چاہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُن لوگوں کے نزدیک جو عدم تشدد پر ایمان نہیں رکھتے ہیں "ہندوستان اپنی حفاظت کرنے کے لئے بیتاب ہے"، ایک بے معنی نعرہ ہے جو محض دنیا کو متاثر کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ نہایت معقول طریقہ پر ایک شخص سوال کر سکتا ہے کس چیز سے مدافعت کی جائیگی؟ گوپھنوں سے؟ کشتی کے بلیوں سے؟ سڑے ہوئے انڈوں سے؟ یہ ایک قانونی سوال ہے لیکن اس کا قانونی جواب نہیں دیا جاتا کیونکہ پروپیگنڈا کرنے والا بہت چالاک ہے اور لاجواب ہونا نہیں چاہتا۔ جواب میں وہ تم پر سوالوں کی بوچھار کر دیتا ہے:۔ اور یہ کس کا قصور ہے کہ ہندوستان اتنا کمزور ہے؟ یہ کس کا قصور ہے کہ ہمارے پاس بحریہ، ہوائیہ اور اسلحہ سازی کے کارخانے نہیں ہیں؟ ان برجستہ اور بلیغ سوالات پر واہ واہ کا وہ شور ہوتا ہے

کہ ان کا ہر معقول جواب اس شور میں گم ہو جاتا ہے۔

درحقیقت وہ کسی سے جواب کے سننے کے لئے تیار نہیں ہیں، کیونکہ یہ سوال کہ "کس کا قصور ہے؟" اس موقع پر بالکل بے محل اور غیر متعلق ہے بہرحال ہم ذرا فیاضی سے کام لیتے ہیں، کانگریسی دوست کی بات کو تسلیم کرلیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں:-

اچھا خیر! تمہاری ہی بات ٹھیک ہے! ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب ہمارا ہی قصور ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے صورت حال میں کچھ تبدیلی نہیں ہوتی۔ کوئی ایک سادہ اور واضح مثال لو۔ ہندوستانی بحریہ کی مثال سب سے زیادہ واضح ہے۔ جنگ کے شروع میں ہندوستانی بحریہ صرف چند طلایہ کے جہازوں پر مشتمل تھا۔ ڈنمارک کے برابر ملک کے لئے بھی یہ کھلونا بحریہ ناکافی ہوتا، چہ جائیکہ ایک براعظم کے لئے جس کا رقبہ انگلستان، فرانس، جرمنی، سکینڈے نیویا، اٹلی، ریاستہائے بلقان کے مجموعی رقبہ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ کے برابر ہے۔

اچھا تو آپ اس سلسلہ میں کیا تجاویز پیش کرتے ہیں؟ کیا چھوٹے چھوٹے جہازوں کا یہ بیڑا کسی حملہ آوروں کے مقابلہ میں ہندوستان کے سواحل کی مدافعت کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! تو پھر اس کا رعظیم کو اقوام متحدہ کے حوالہ کر دیجئے؟ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر طویل بحث ہونی چاہیئے! اگر اقوام متحدہ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائیں تو ان کو حق ہوگا کہ وہ مطالبہ کریں کہ مسٹر گاندھی بھرتی کے خلاف کارروائی نہ کریں۔ مسٹر گاندھی کی گزشتہ زندگی کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ بھرتی کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور رہیں۔

براہ کرم اس سوال کو الماری میں بند کر کے نہ ڈالیئے۔ اور نہ اس کو مبہم اور خیالی باتوں کے بادلوں میں چھپائیے۔ بحریہ بادلوں میں سے نہیں برستا۔ یہ ایک نازک اور حیرت انگیز صنعت ہے۔ اس کی تیاری میں جہاں فولاد درکار ہے وہاں مضبوط اعصاب اور تازہ خون کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے بحریہ کسی قوم کی ذہانت اور طباعی کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ کیا ہندوستانیوں میں اس قسم کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ایک عظیم بحریہ تیار کر سکیں؟

پھر ہم ٹھنڈی سانس بھر کر بڑی فراخدلی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہماری کوتاہیاں کچھ بھی ہوں، لیکن یہ بتائیے کہ کیا ایک مکمل بحریہ بیس سال کی مدت سے کم میں معرض وجود میں آسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس دوران میں کیا ہوگا؟ کیا برطانوی بحریہ خدمت انجام دے گا؟ تو کیا اس کو تنخواہ نہ دی جائے گی اور اس کا شکریہ نہ ادا کیا جائے گا؟ کیا انگریزوں کی جیب سے اس بحریہ کو تنخواہ دی جائے گی؟ بعض انگریز سیاست دان جو پارلیمان میں شور مچاتے رہتے ہیں، اس سوال کا جواب اثبات میں دیں گے۔ لیکن کیا نوجوان مزدور بھی حقیقت حال سے واقف ہونے پر یہی جواب دیں گے؟

اسی قسم کی تنقید ہندوستانی بری فوج کے مسئلہ پر بھی کی جا سکتی ہے کوئی شخص اتنا کمینہ نہ ہوگا کہ موجودہ جنگ میں ہندوستانی فوجوں نے جس شاندار شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس کا انکار کرے۔ لیکن یہ یقین رکھنا مضحکہ خیز ہوگا کہ یہ فوجیں صرف اپنے بل بوتے پر نسل انسانی کے ۱/۵ حصہ کی حفاظت کر سکتی ہیں۔ ایک تو یہ بات ہے کہ ملک کی وسعت اور گوناگوں

مفادات کی نسبت سے ہندوستان میں تربیت یافتہ فوجی عہدہ دار بہت کم ہیں۔ علاوہ ازیں ان بیانات کی تحریر کے وقت صرف مٹھی بھر ہندوستانی عہدہ دار ایسے ہیں جن کو وسیع اختیارات کے ساتھ دفتر یا میدان جنگ میں کام کرنے کا موقع دیا گیا ہے پھر ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کبھی ہمارا ہی قصور کہ ہم نے اختیار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ لیکن کیا یہ انگریزوں کی خود غرضی کی وجہ سے ہے یا ہندوستانیوں کی کاہلی کے باعث، یا دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے؟ واقعات کو اہمیت دیجانی چاہیے۔ اور واقعات اس حقیقت کو بے پردہ کرتے ہیں کہ جہاں تک عہدہ داروں کے معیار کا تعلق ہے، ہندوستانی فوج کو بالکل از سر نو منظم کرنا پڑے گا۔

کانگریس کے بیانات کا منشا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ضرورت ہوگی اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ فوجی عہدہ دار بطور معجزہ کے آسمان سے اتر آئیں گے۔ لیکن ایک حقیقت شناس شخص یقیناً اس دعویٰ کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا کہ عصری ضروریات کے مطابق فوجی عہدہ داروں کی اتنی بڑی جماعت ایک نسل گزرنے سے پہلے تیار ہو سکتی ہے۔

جب تک یہ جماعت تیار ہو اس وقت تک کیا ہوگا؟ کیا پولستانیوں فرانسیسیوں، امریکیوں، روسیوں اور چینیوں کی ایک بین الاقوامی فوج ہندوستان کی حفاظت کرے گی۔ (غالباً اس سلسلہ میں قابل نفرت انگریزوں کی خدمات حاصل نہیں کی جائیں گی) اور کیا یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا؟ اگر ایک سلادیکی لفٹیننٹ یا نارویجی سارجنٹ سے کہا جائے کہ وہ عدم تشدد کے قائل مدارسیوں کی ایک جماعت کو دبابوں کی لڑائی کے متعلق چند ابتدائی معلومات سکھائے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ

اس کو کتنی کامیابی ہوگی خصوصاً جبکہ مشق کے لئے دبابے موجود نہ ہوں۔ دبابوں
کے ذکر سے ایک اور بات یاد آئی یعنی یہ کہ ہندوستان میں اسلحہ سازی کے کارخانے
بھی نہیں ہیں۔ کیا ہندوستان کو اسلحہ مہیا کرنے کے مسئلہ پر ان بین الاقوامی خون
چوسنے والوں میں پھر ایک مقابلہ برپا ہوگا ـــــ بلکہ دو ہندوستان' کہنا زیادہ
بہتر ہے' کیا خود غرض تاجروں کی ایک جماعت پاکستان اور ہندوستان کی
سرحد کو ادھر سے ادھر عبور کرتی رہے گی تاکہ اگر آج پاکستان کے مسلمانوں کے
ہاتھ پچاس مشینیں فروخت کرے تو کل ہندوستان کے ہندوؤں کو بھی مشینوں
کی اتنی ہی تعداد مہیا کردے۔

ممکن ہے یہ سوالات مجذوب کی بڑ معلوم ہوں۔ لیکن جو سوال وہ اٹھا
رہے ہیں وہ بھی تو مہمل اور بے معنیٰ ہی ہے۔ یقیناً یہ خیال کرنا مہمل ہے کہ
ہندوستان فوج سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ یہ تصور بھی ایک فریب ہے کہ ہندوستان
کے پاس کافی فوج ہے یا یہ کہ ایک مکمل فوج بیس سال سے کم مدت میں تیار
کی جا سکتی ہے یہ بات نہایت ہی بے عقلی کی ہوگی کہ ان خطرات اور مشکلات
کو نظر انداز کردیا جائے جو ایک بین الاقوامی فوجی کنٹرول کے ضمن میں پیدا ہونگی

ان متقابل مہملات پر غور کرنے کے بعد امید ہے کہ ناظرین اس بڑی
یاوہ گوئی' کو اچھی طرح سمجھ سکیں جس کے ظاہری الفاظ کے فریب میں وہ اب تک
مبتلا تھے: "ہندوستان خود اپنی حفاظت کرنے کے لئے بیتاب ہے' بس دیر
اتنی ہے کہ اس کو آزاد کردیا جائے[1]"۔

---

[1] ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان کے دفاع کا مسئلہ نسبتہً آسان ہے۔ کچھ
تو اس وجہ سے کہ پاکستان کا رقبہ کم ہے اور اس کا ساحل نسبتہً غیر اہم ہے۔ لیکن اصلی

(۳)

کیا ضرور ہم ہندوستان چھوڑ دیں گے؟

اس سوال کا جواب ذرا مشکل ہے کیونکہ اس کا جواب خود ہندوستانیوں کے رجحان طبع پر موقوف ہے۔ اگر کرپس کی تجاویز قبول کرلی جاتیں تو بہ نسبت آج کے اس صورت میں ہم ترک ہندوستان سے زیادہ قریب ہوتے، ہمارا بوریا بستر بندھ چکا ہوتا، ہم میں سے بہت سے "خدا حافظ" کہہ چکے ہوتے اور موٹریں دروازوں پر ہمارا انتظار کرتی ہوتیں۔ لیکن کرپس کی تجاویز مسترد کردی گئیں اور اب ہر شخص عبوری دور کی بےچینی محسوس کر رہا ہے۔ کرپس کی تجاویز پر جو بحثیں اس وقت معرض وجود میں آئیں ان سب کے اعادہ کا یہ موقع نہیں ہے۔ ان کی تفصیلات بہت تھکا دینے والی ہیں بلکہ وہ تجاویز اب مردہ ہو چکی ہیں کیونکہ وہ نفسیاتی فضا جو اس وقت تھی اب نہیں پیدا کی جاسکتی۔ ان تجاویز سے متعلق صرف دو امور ایسے ہیں جن سے عام قارئین دلچسپی لے سکتے ہیں
پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی اقلیتوں نے ان تجاویز کو "ہندوؤں کی اطاعت" سے تعبیر کیا۔ مسلم اور اچھوت نے یکساں آواز اٹھائی اور کہا "تم نے ہم کو ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا" مسلم اور اچھوت جو حیثیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۴) اور بنیادی سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان ہمیشہ سے ایک جنگجو قوم کی طرح رہتے ہیں اور ان میں قیادت کی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے، جیسا کہ آٹھ سو سال کی طویل مدت میں انھوں نے اس کو ثابت کر دکھایا۔ اور موجودہ جنگ میں بھی انسانی قوت میں ان کا حصہ بہت بڑا ہے۔ ان سب امور کے علاوہ پاکستان مسلم دنیا کے ساتھ مل کر اپنے دفاع کو بہت جلد مستحکم کر دیگا

مجموعی "اکروڑ ہیں" بالکل حق بجانب تھے۔

کرپس کی تجاویز کے متعلق دوسری بات یہ ہے کہ ہندوؤں کی بڑی اکثریت اپنی اس بیوقوفی پر سخت نادم ہے کہ انھوں نے ان تجاویز کو کیوں مسترد کر دیا۔ تمام ہندوستان میں برہمن اس بات پر دانت پیستے ہیں کہ انھوں نے مفت میں جنت اپنے ہاتھوں سے کھو دی۔ حقیقت میں وہ ایک جنت تھی، کیونکہ کرپس کی تجاویز میں ہر وہ چیز شامل تھی جس کی ممکنہ حد تک ایک فاشسٹ ڈکٹیٹر خواہش کر سکتا ہے۔ اب اس کا وقت باقی نہیں رہا کیونکہ اب مسلم قوم کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اور اچھوت بھی بیدار ہو گئے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسٹیج پر کافی روشنی پڑ رہی ہے اور دنیا اس حقیقت سے آگاہ ہو گئی ہے کہ ہندوستان کا ڈرامہ اتنا سادہ اور سہل نہیں ہے جتنا کہ اب تک اسے ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔

بہرحال ـــــــ یہ بات یقینی ہے کہ ہم کبھی نہ کبھی ہندوستان چھوڑ دیں گے اگر یہ کام عجلت میں ہوا تو پھر یہ ایک ناقابل تلافی حزنیہ ہوگا اور اگر یہ کام اطمینان اور سکون سے ہوا تو پھر ہم کو اور دنیا کو اس بات کا موقع ملے گا کہ ہم اُن نسلی، ذہنی اور معاشی تغیرات کے ساتھ اپنے کو ہم آہنگ کرلیں جو ہماری دست برداری کے نتیجہ ناگزیر طور پر پیدا ہوں گے۔

(۴)

جلد یا بدیر ایک وقت آئے گا جبکہ دنیا یہ محسوس کریگی کہ برطانیہ کا ذہنی اور علمی اقتدار ہندوستان سے کبھی زائل نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سے کچھ کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوئیں، کبھی کبھی جذبہ میں ہم آپے سے باہر بھی ہو گئے اور بارہا ہم تنگ خیالی کے مرتکب ہوئے۔ ان سب کے باوجود

ہم نے ہندوستان کو امن عطا کیا ـــــ وہ امن جس کی بنیاد تباہ کاری پر نہ تھی ـــــ ہم نے ہندوستان کو قانون دیا ـــــ وہ قانون جس میں جبر و تشدد کو دخل نہ تھا ـــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے ہندوستان کو آزادی کی دولت بخشی۔ کیونکہ ملٹن، لاک، مل، برائٹ اور گلیڈ اسٹون کے اعلیٰ خیالات ہی کی بدولت سب سے پہلے ہندوستانیوں کے دماغ روشن ہوئے اور انھوں نے آزادی کے حقیقی مفہوم کو سمجھا۔ ہمارے ہندوستان کو چھوڑ جانے کے برسوں بعد مستقبل کا کوئی طالب علم "ایریا پیجیٹیکا" ـــــ کے سنہری صفحات کھولیگا اور "شیلے" کی نظموں کو پڑھ کر متاثر ہوگا اور اس کے دل میں جذبات کا طوفان اسی طرح اٹھے گا جس طرح ہر نوجوان کے دل میں اٹھتا ہے۔ مستقبل کی جامعات کے احاطوں میں "بائرن" کی روح کارفرما ہوگی اور کونسل کے کمروں میں "برک" کی تقریروں کی آواز بازگشت سنائی دے گی۔ یہ چیزیں ہیں جو ہم نے ہندوستان کو عطا کیں جس طرح ہم نے بقیہ دنیا کو بخشیں ممکن ہے وہ مقام ہندوستان ہی ہو جہاں یہ درخت بہترین بار لائے مستقبل میں انسانیت کی فلاح اس آرزو کی تکمیل میں مضمر ہے۔

بمبئی - موسم بہار ۱۹۴۴ء

ـــــ ۞ ـــــ

ادارۂ اشاعت اردو کی ہر دلعزیز مطبوعات

مقام اقبال .... اشفاق حسین ... ۳-۱۴ ″ کلدار

روح اقبال .... ڈاکٹر یوسف حسین خان ۵-۱۲ ″

آثار اقبال .... غلام دستگیر رشید ... ۳-۱۲ ″

اقبال کا تصور زمان و مکان ... رضی الدین .... ۰-۱۲ ″

فیصلہ ہندوستان .... علامہ عبدالقدس ہاشمی ۴-۸ ″

جناح کی تقاریر .... مترجمہ عثمانی صحرائی .. ۳-۴ ″

افادات محمد علی .... رئیس احمد جعفری ... ۳-۱۲ ″

نگارشات محمد علی .... ″ ۳-۱۲ ″

مطائبات محمد علی .... ″ ۲-۸ ″

مقالات محمد علی - اول .... ″ ۳-۱۲ ″

مقالات محمد علی دوم .... ″ ۳-۱۲ ″

مکالمات ابوالکلام .... عقیل احمد جعفری ... ۳-۱۲ ″

اقبال کے خطوط جناح کے نام ... مترجمہ سعید صدیقی ۰-۲ ″

سیاست جاپان .... علی امام بلگرامی ۰-۱۰ ″

انیڑھ ہندوستان .... ملا فخر الحسن ... ۳-۴ ″

جمہوریہ چین .... میر عابد علی خان ... ۱-۱۲ ″

افسانے ڈرامے .... منٹو .... ۲-۱۲ ″

رنگین سپنے .... کوثر چاندپوری ... ۲-۱۲ ″

مسکراہٹیں .... ″ ۲-۱۲ ″